آج

٦٣

خالد طور

علی اکبر ناطق

ارجمند آرا

ساجد رشید

یوآر اننت مورتی

رالف رسل

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 63

مئی 2009

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 500 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 60 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

ترتیب

خالد طور

7
کانی نکاح

97
سائیں موسم

علی اکبر ناطق

137
پگڑی باندھ لی

141
نرینہ اولاد

146
اچھو بازیگر

151
کمی بھائی

160
بے چارگی

ارجمند آرا
169
مدرسہ اور مسلم تشخص کی تشکیل

ساجد رشید
194
ایک مردہ سر کی حکایت

یو آر اننت مورتی
217
گھٹ شرادھ

رالف رسل
247
کچھ کھویا کچھ پایا
(خود نوشت سوانح کا دوسرا حصہ—باب 16-13)

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

مٹی کی کان
(کلیات)
افضال احمد سید
قیمت:500روپے

کلی منجاروکی برفیں
(منتخب ترجمے)
محمد خالد اختر
قیمت:120روپے

خودکشی کے موسم میں
(نظمیں)
زاہد امروز
قیمت:120روپے

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
(زیر طبع)

درخت نشیں
(اطالوی ناول)
اتالوکلوینو
ترجمہ: راشد مفتی
قیمت:175روپے

شہزادہ احتجاب
(ایرانی ناول)
ہوشنگ گلشیری
ترجمہ: اجمل کمال
قیمت:70روپے

پریم وانی
میرابائی
(گیت، ترجمہ اور فرہنگ)
مرتبہ: سردار جعفری
قیمت:395روپے

کبیر بانی
کبیر
(گیت، ترجمہ اور حواشی)
مرتبہ: سردار جعفری
قیمت:395روپے

Scanned with CamScanner

اس شمارے کی ابتدا ایک ایسے ادیب کی دو تحریروں سے کی جا رہی ہے جسے اپنے ادبی استحقاق کے مطابق توجہ پڑھنے والوں اور تنقید نگاروں سے حاصل نہیں ہو سکی۔ خالد طور کا ناول کانی نکاح 1991 میں لاہور سے شائع ہوا اور اس سے پہلے ان کی کہانی ''سائیں سوہم'' 1966 میں لاہور ہی کے ادبی جریدے فنون میں شائع ہوئی تھی۔ تاہم ان دونوں تحریروں کو، جن کے سوا مصنف کی کسی اور تحریر کا پتا نہیں ملتا، قریب قریب مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا جبکہ یہ نہ صرف اپنے موضوع بلکہ اسلوب کے اعتبار سے بھی قدرشناسی کی مستحق ہیں۔ خاص طور پر ناول کانی نکاح میں نفسِ مضمون اور اسلوبِ بیان کی یکجائی اتنی کامیاب ہے کہ اسے اردو فکشن کے موجودہ تناظر میں غیرمعمولی کہا جا سکتا ہے۔ اس کامیابی سے اس بات کی ایک بار پھر تصدیق ہوتی ہے کہ انسانی معاشرت سے بڑھ کر ہوش ربا اور کوئی طلسم نہیں، اور کسی بامعنی فکشن کے لیے لازم ہے کہ وہ اس زمین پر قائم انسانی معاشرت کی بےشمار شعوری اور غیرشعوری تہوں کو مشاہدے اور بصیرت کی پوری توانائی کے ساتھ دریافت اور بیان کرنے کی کوشش کرے۔

ان دونوں تحریروں کی نشان دہی کرنے کے لیے میں قاضی جاوید صاحب کا ممنون ہوں۔ قاضی صاحب نے کانی نکاح کا اپنا نسخہ عنایت کیا جبکہ ''سائیں سوہم'' کی نقل کراچی کی بیدل لائبریری سے دستیاب ہوئی۔ مصنف کی سوانحی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

Scanned with CamScanner

خالد طور

کانی نکاح

وجہ تسمیہ

کانی نکاح کی کہانی علم الانسانیات کا ایک چھوٹا سا باب ہے۔

1964 کے موسم گرما کی ایک جھلساتی ہوئی دوپہر میں مجھے بابا علی سے ملاقات کا موقع ملا۔ راولپنڈی سے اسی کلومیٹر شمال مغرب میں واقع کھوڑ گاؤں کے بابا علی سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ ساون بھادوں تک جاری رہا۔ کانی نکاح کی رسم سے متعلق ابتدائی معلومات مجھے بابا علی ہی سے ملی تھیں۔

میں شاید اس رسم سے متعلق زیادہ سنجیدہ نہ ہوتا، شاید بھول ہی جاتا، لیکن ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس کے باعث مجھے اس رسم سے متعلق بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ تجسس جو کسی بھی تحقیق کے لیے زبردست محرک ثابت ہوتا ہے، میرے دل میں جاگزیں ہو گیا۔

سردیوں کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات کا پہلا پہر تھا۔

بھائی کے گھر میں ایک گھریلو تقریب تھی۔ گھر میں چہل پہل تھی۔ بوڑھی خواتین، لحافوں میں دبکی، اپنے اپنے مسائل پر سرگوشی کے انداز میں مسلسل باتیں کر رہی تھیں۔ نوجوان لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے اِدھر اُدھر بے مقصد گھوم پھر رہی تھیں۔ میں بیرونی کمرے میں تنہا ایک کمبل

Scanned with CamScanner

کندھوں پر ڈالے صوفے پر دراز تھا۔ اچانک اندرونی کمرے سے ڈھولکی کی آواز سنائی دی۔ کھوڑ گاؤں کی معمر میراثن نور جہاں (مرحومہ) نے ڈھولا گانا شروع کردیا:

"مینڈے ہتھ کٹورا بھریا ہیس تاں ڈھولا۔"

ڈھولکی پر کھپے (چھچر) سے کوئی لڑکی تال دے رہی تھی جو ڈھولے میں نور جہاں کا ساتھ بھی دے رہی تھی۔ نور جہاں کے ایک بول پر میں اٹھ کر بیٹھ گیا:

مینڈے ہتھ کٹورا، تُوں ٹریا وتی تے
ڈوں چار گلاں کریں آں کدی مل کانی تے

(کٹورا تو میرے ہاتھ میں ہے اور تو ہے کہ تالاب پر چلا جاتا ہے! کاش تو کبھی سرکنڈے ہی پر ظاہر ہو جائے، میں تجھ سے دو چار باتیں ہی کرلوں۔)

تقریب اگلے دن بھی جاری رہ کر ختم ہوگئی، ایک ہنگامہ تھا جو ختم ہوگیا، لیکن میرے دل میں تجسس کے طوفان کی جو نئی لہر اٹھی وہ بہت تند تھی۔ میں کھوڑ گاؤں کی نور جہاں سے خصوصی طور پر ملا۔ نور جہاں سے ملاقات کے بعد مجھ پر اتنے انکشافات ہوئے کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں سطح مرتفع پوٹھوہار کی بھیڑیوں اور ناگوں سے بھری ہوئی دہشت ناک کھیوں سے زخمی ہوئے بغیر گزر گیا ہوں؛ جیسے میں کسی سنگلاخ پہاڑ کی برفانی چوٹی پر چڑھ گیا ہوں اور دوسری جانب مجھے افق تک سرسبز جنگل نظر آیا ہو، جیسے میں کسی تاریک سمندر کی تند لہروں سے نکل کر کسی ایسے جزیرے پر جا پہنچا ہوں جو غیر آباد ہے لیکن بہت روشن ہے۔

بوڑھی میراثن نور جہاں نے مجھے کانی نکاح کے لوک گیتوں کا انمول تحفہ دیا۔ گیتوں کی دھنیں بتائیں، ان کے گائے جانے کے انداز بتائے، ان رسموں سے مجھے آگاہ کیا جو کانی نکاح میں ادا کی جاتی ہیں۔ بوڑھی نور جہاں اور بابا علی کی فراہم کی ہوئی معلومات ایک سی تھیں۔ کانی نکاح کی تصدیق ہوگئی۔

'کانی' پنجابی زبان میں سرکنڈے کو کہتے ہیں۔ جھنگ کی سمت مرزا صاحباں کی داستان میں سرکنڈے کے بنے ہوئے تیر ہی کو کانی کہا گیا ہے۔ ضلع اٹک، چکوال، میانوالی، خوشاب اور سرگودھا میں بولی جانے والی زبانوں میں کانی سرکنڈے ہی کو کہتے ہیں۔

بے آب وگیاہ علاقے میں برساتی پانی کے تالاب بے حد اہم ہوتے ہیں۔ تالابوں کے کنارے اگنے والے سرکنڈے زندگی کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام سے پہلے اس علاقے میں جب بت پرستی زوروں پر تھی، سرکنڈے پر میگھ راج یعنی اندر دیوتا کا خاص کرم مانا جاتا رہا ہو اور سرکنڈا میگھ راج ہی کی علامت سمجھا جاتا ہو، کیونکہ کشمیر کی وادی میں اب بھی "پوتر چھڑی" کی ہندوانہ رسم ادا کی جاتی ہے اور ہندو سادھو بڑے مذہبی جوش وخروش سے یہ رسم ادا کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سرکنڈا نکاح کی رسم دیو مالائی رسوم میں سے نکلی ہے اور، مذہب اسلام کے پھیل جانے کے باوجود، ناخواندہ دیہاتیوں میں اب بھی موجود ہے۔ سرکنڈا نکاح بھی دورِ جاہلی کی ان رسوم میں سے ایک ہے جن کی اساس سحر پر رکھی گئی تھی۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جاہلی معاشروں میں اور وحشی قبیلوں میں ابتدائی علم کی اساس جادو ہی پر رکھی گئی تھی اور ساحر ہی ان کے عالم اور دانشور تھے۔

کالی نکاح کا تعلق سحرِ مشارک کی پہلی شاخ یعنی سحر بالمثل سے ہے جو ہر لحاظ سے سحرِ متعدی سے زیادہ موثر اور طاقتور ہے۔

بہتر یہی ہے کہ کالی نکاح سے متعلق سحر کی پوشیدہ گتھی کو سلجھایا جائے اور اس رسم کے قائم رہنے سے متعلق کچھ تحریر کیا جائے، ساتھ ہی ساتھ سحر بالمثل کے بارے میں اس انداز کو بھی دیکھ لیا جائے جو شمالی پنجاب میں ترویج پا گیا تھا اور کہیں کہیں اب بھی موجود ہے۔

سحر بالمثل کا عمل ہزارہا برس پرانا ہے۔ تاریخ کے اوراق گواہی دیتے ہیں کہ سحر بالمثل کا انداز دنیا بھر میں تعمیری کے بجائے تخریبی ہی رہا ہے، اگرچہ اسے تعمیری مقاصد کے لیے ہی ایجاد کیا گیا تھا۔ اس قسم کے جادو میں، کسی شخص یا قوم کو تکلیف پہنچانے کے لیے، شبیہ یا مثل کو ضرر پہنچایا جاتا ہے۔ اس قسم کا سحر صدیوں سے ہندوستان، یونان، بابل، مصر اور روم کے علاوہ افریقہ کے تمام قبیلوں میں مروج تھا۔ یہاں تک کہ آسٹریلیا کے وحشی، شرق الہند کے جزائر میں آباد قبیلے اور امریکی ریڈ انڈین بھی اس سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ سحر عالمگیر رہا ہے۔ اس سحر سے متعلق مثالیں علم الانسانیات کی کتابوں میں بکثرت ملتی ہیں۔ ماہرین نے دنیا بھر سے ان مثالوں کو حاصل کیا اور اپنے مقالات میں محفوظ کیا، اپنی کتابوں میں تحریر کیا۔ لیکن آج تک کوئی ماہر علم الانسانیات یہ نہیں بتا پایا کہ مثل کا تعلق سحر کی جزویات میں کہاں مکمل طور پر اپنی تاثیر کے ساتھ مربوط ہے؟

ماہرین کہتے ہیں کہ سحر بالمثل کی تخریبی مثالیں سماجی کی انتہا دکھاتی ہیں لیکن وہ یہ نہیں بتا پاتے کہ سماجی جادو کی کن جزویات میں اور کیوں پُر تاثیر ہو جاتی ہے؟ اگر بنگال میں کھونڈ اقبال کے باشندے دھان کی فصل کے لیے انسانی قربانی دیتے ہیں تو وہ اس کے لیے زندہ انسان کے جسم سے چھریوں کے ساتھ گوشت کیوں اتارتے ہیں؟ لکڑی کے بنے ہوئے ہاتھی کی سونڈ کے ساتھ باندھ کر اسے دائرے میں گھماتے ہوئے، ایک زندہ انسان کی بوٹیاں نوچنا، کا ثنا سحر بالمثل میں کیوں پُر تاثیر ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب ماہرین نہیں دے پائے تھے اور میرے تجسس کی بنیاد اسی سوال پر استوار ہوئی تھی۔

ماہرین نے کئی مثالیں دی ہیں۔ وہ امریکی ریڈ انڈینز کی مثال دیتے ہیں کہ مکئی کی فصل کی خاطر وہ ایک سنہرے بالوں والی دوشیزہ کا گلا گھونٹ دیا کرتے تھے یا پھر کارتھیج کے رہنے والے مولک باشندے، کانسی کے بنے ہوئے ایک بت کے سامنے، جس کا سر بچھڑے جیسا تھا، اپنے پہلوٹھی کے بچے آگ میں جلا دیا کرتے تھے۔ لیکن وہ ان قربانیوں کا سحر سے کوئی منطقی ربط استوار نہیں کر پاتے ہیں۔ یہ سوال میرے لیے طویل اور برسوں پر پھیلی ہوئی سوچ کا باعث بنا اور رفتہ رفتہ میرے ذہن میں سحر بالمثل کا یہ پہلو نمایاں ہوتا گیا۔ پھر جیسے مجھ پر سب بھید کھل گئے۔ راز پر سے پردہ ہٹا تو میں خود حیرت زدہ رہ گیا کہ صدیوں سے تہہ در تہہ تاریکی میں روپوش یہ بات اس قدر معمولی سی تھی کہ اگر اسے میں عام وحشی کی سوچ قرار دوں تو غلط نہ ہوگا، تاہم اس سوچ پر پُر اسراریت کے دبیز پردے حائل تھے۔

بات بس اتنی سی ہے کہ وحشی زندگی کے جس احساس کو خود میں محسوس کرتا تھا، اسے ہر شے میں تصور کرتا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ ہر شے میں روح کا قائل تھا، اسے نباتات، جمادات، حیوانات سب میں روح کا ایک قالب نظر آتا تھا اور قالب کے رشتے سے وہ ایک ایسی روح کا بھی قائل تھا جو ایک برتر اور غیر مرئی وجود بھی رکھتی تھی۔ پھر کثرت نے غیر مرئی وجود کے کئی روپ دکھائے اور وحشی کا ذہن خود ان بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ اس تہذیبی ارتقا میں ایک بات قائم رہی اور وہ پوشیدہ ربط کی بات تھی جس نے سحر بالمثل کی جزویات میں اپنی تاثیر قائم رکھی اور جزویات انسانی ضروریات سے جڑی ہوئی خواہشیں بن گئیں۔ بنگال کے کھونڈ دھان کو زندہ تصور کرتے تھے، وہ سوچتے تھے کہ ان

Scanned with CamScanner

کی درانتیاں دھان کو کاٹتے ہوئے اسے سخت اذیت پہنچاتی ہیں۔ وہ دھان کاٹتے ہوئے خود کو مجرم محسوس کرتے تھے اور یہ احساسِ جرم اجتماعی تھا۔ اس احساسِ جرم سے نجات حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بہت کچھ سوچا ہوگا اور پھر ان کے اہلِ علم نے، یعنی ساحروں نے، احساسِ جرم مٹانے کا ایک طریقہ دریافت کر ہی لیا جو بے حد ظالمانہ تھا۔ انھوں نے اپنے قبیلے کو، بلکہ انسانی برادری کو اور اس کے اجتماعی احساس کو، ایک اکائی میں تصور کیا اور قربانی دے کر دھان کی روح کو اپنا مقروض بنا دیا۔

"ماہرین علم الانسانیات کے نزدیک قربانیاں صرف دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ہی دی جاتی ہیں، حالانکہ ابتداً ایسا نہیں تھا۔"

انھوں نے انسانی برادری کو ایک جسم میں قیاس کیا؛ سحرِ بالمثل کے اصولوں کے تحت انھوں نے زندہ جسم سے چھریوں کے ساتھ گوشت کاٹا، اسے شدید ترین اذیت پہنچائی اور گوشت کے ٹکڑوں کو دھان کے کھیتوں میں دبا دیا۔ اب دھان کی روح ان کی مقروض بن گئی۔ جب فصل پک گئی تو انھوں نے بڑے جوش و خروش سے درانتیاں چلا کر اپنا قرضہ وصول کر لیا۔ وہ احساسِ جرم سے نجات پا گئے۔

امریکی ریڈ انڈینز جب سنہری بالوں والی دوشیزہ کا گلا کاٹتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ انھیں اس قربانی کا حکم صبح کے ستارے نے ایک قاصد پرندے کے ذریعے دے رکھا ہے جو مکئی کے دانے بڑے شوق سے کھاتا ہے۔ یا ڈکوٹا نامی اس قوم کو بھی مکئی کی فصل زندہ محسوس ہوتی تھی۔ وہ مکئی کی دیوی کو مکمل طور پر اپنا مقروض بنانے کے لیے مکئی کے بھٹوں سے نکلے ہوئے سنہری ریشوں جیسے بالوں والی لڑکی کا انتخاب کرتے، اس پر مکئی کی روح کو قیاس کرتے اور، اس کے قالب کو انسانی برادری کی اکائی بنا کر، روح کو آزاد کر دیتے تھے۔ لڑکی کو شدید اذیت سے مارا جاتا تھا، جس طرح مکئی کے بھٹے کوئلوں پر بھونے جاتے ہیں، سنہری بالوں والی دوشیزہ کے جسم کو جلایا جاتا تھا، پھر اس کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا۔

جب مکئی کی فصل پک جاتی تھی تو وہ درانتیوں کے ساتھ مقروض دیوی کے سامنے پہنچ جاتے تھے اور اپنا قرضہ وصول کر لیتے تھے، پھر چاہے مکئی کے بھٹوں کو آگ پر بھونتے یا مسل ڈالتے، وہ احساسِ جرم سے محفوظ رہتے تھے۔ گوشت خوری کی خاطر، انسانی قربانیوں میں بھی سحرِ بالمثل کا یہی مخفی پہلو موجود تھا۔ اگر کارتھیج کے مولک باشندے، بچھڑے جیسی شکل والی کانسی کی مورتی کے سامنے، دہکتے تنور میں اپنے پہلوٹھی کے بچوں کو زندہ بھون دیا کرتے تھے تو اس لیے کہ وہ بیل یا بچھڑے کو یونانی صنم

Scanned with CamScanner

''مینوتور'' کا قالب سمجھتے تھے۔ وہ جب خوراک کی خاطر بیل یا بچھڑے کو ہلاک کرتے تھے تو تھر تھر کانپا کرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مینوتور کو سخت اذیت پہنچا رہے ہیں۔ ان کا یہ احساس جرم اجتماعی تھا۔ ان کے ساحروں نے اس احساس جرم کو مٹانے کے لیے خود اذیتی کا راستہ اختیار کیا۔ مولک باشندے مینوتور کی مورتی کے سامنے دہکتے ہوئے تنور میں اپنے پہلوٹھی کے بچوں کو پھینک دیا کرتے تھے۔ زندہ بچے کی چیخیں اور جلتے ہوئے گوشت کی بو، اس سوختنی قربانی کا عروج تصور کیا جاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جلتے ہوئے گوشت کی بو اور چیخیں مینوتور تک پہنچ جاتی ہیں اور وہ ان کا مقروض ہو جاتا ہے۔ ایک بار پہلوٹھی کے بچے کی قربانی دے کر مولک خاندان عمر بھر مینوتور کے قالب سے قرض وصول کرتا رہتا تھا، یعنی بیل اور بچھڑے کو ہلاک کرتا تھا، بھونتا تھا، کھاتا تھا اور احساس جرم سے محفوظ رہتا تھا۔

مختصر یہ کہ سحر بالمثل نے دنیا میں ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں اپنی جگہ بنائی ہے۔ اس میں تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب کا پہلو زیادہ شدت سے قائم رہا ہے۔ اس کا مخفی پہلو، بعید، تاریک تہوں میں پوشیدہ حقیقت جب ''قرض خواہی'' کی صورت میں سامنے آتی ہے تو سارا معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ کافی نکاح میں بھی یہی مضبوط، طاقتور، اور مخفی ربط کارفرما نظر آتا ہے۔ اس کی تاثیر اتنی طاقتور ہے کہ دیہاتی ذہن اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے اور اس ترقی پذیر معاشرے میں بھی سحر کا یہ پہلو قائم نظر آتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری والدہ مرحومہ، مجھے کسی دشوار رستے پر جانے کے لیے گھر سے رخصت کرتے ہوئے آہستہ سے ایک جملہ کہا کرتی تھیں ''میری امانت خدا دے حوالے۔'' یعنی وہ میرے وجود کو خدا کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیا کرتی تھیں اور انھیں یقین کامل تھا کہ خدا ان کی امانت ضرور لوٹائے گا اور میں ہر بار خیر و عافیت ہی سے واپس گھر پہنچ جاتا تھا۔ اپنے پیاروں کو مخفی قوتوں سے بطور قرض وصول کرنے کی خواہش اس قدر شدید ہے کہ آج بھی قائم ہے، موجود ہے اور جب اظہار پاتی ہے تو کانی نکاح بن جاتی ہے۔

1983 میں مجھے اطلاع ملی کہ پنڈی گھیب سے کچھ آگے سیل نالے کے پاس واقع گاؤں دندی میں کانی نکاح ہوا ہے۔ میری بدقسمتی کہ مجھے یہ اطلاع اس وقت ملی جب رسم ادا ہو چکی تھی ورنہ میں نایاب تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

Scanned with CamScanner

یہ تو تھی محرک کی بات، جس کے باعث میں یہ ناول لکھنے کے سلسلے میں ذہنی طور پر آمادہ ہوا۔ کہانی ترتیب دیتے ہوئے طویل مدت گزر گئی۔ اب جو بات میں اپنے قارئین تک انتہائی انکساری کے ساتھ پہنچانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ اس ناول کا دوسرا بڑا محرک میری ایک دیرینہ خواہش بھی تھی۔ میں اسکول ہی کے زمانے سے یہ سوچتا آیا ہوں کہ کیا ایسی تحریر ممکن ہے جس میں تصور کی تین تہیں ہوں، یعنی ایک تہہ دوسری کو راستہ دے اور دوسری سے تیسری کا در کھلے۔

کانی نکاح میں میری یہ خواہش کچھ نہ کچھ آسودہ ضرور ہوئی ہے۔ تصور سے تصور کی راہ نکالنے کا یہ انداز دشوار ضرور تھا، ناممکن نہیں تھا۔ میری کاوش کا صحیح اندازہ تو قارئین ہی لگا سکتے ہیں کہ کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

آخر میں، ایک بات جو قارئین کے لیے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگی، کہنا چاہتا ہوں کہ اسے میری ہمت سمجھیں یا مشکل پسندی کہ کانی نکاح میں ناول کی سب سے اہم شخصیت یعنی ہیروئن کا ایک مکالمہ بھی شامل نہیں کیا گیا۔ شاید کانی نکاح اس بنا پر دنیا بھر میں پہلا ناول ہوگا جس میں ہیروئن کا ایک مکالمہ بھی تحریر نہیں کیا گیا اور وہ گونگی بھی نہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ سکوت ناز خود ہی ہر سمت بولتا محسوس ہو۔ زبانِ بے زبانی کا یہ انداز قارئین کا کیسا محسوس ہوگا، یقینِ کامل ہے کہ مجھے قارئین اپنے احساس سے نا آشنا نہیں رکھیں گے۔

خالد طور

کھوڑ گاؤں کے بیچوں بیچ ایک بے نام پہاڑی برساتی نالہ گزرتا ہے۔ ساون کے مہینے میں جب برست بوندیں سفید دیواریں سی کھڑی کر دیتی ہیں، نالہ اپنی سال بھر کی زندگی میں پہلی بار اور اچانک ہی عالمِ شباب کو پہنچ جاتا ہے۔ گدلا مٹیالا پانی نالے کے دونوں کناروں پر کچے مکانوں کی گدلی مٹیالی دیواروں کے نیچے بنیادوں کو چھو کر گزرتا ہے۔ ساون کی چھم چھم اور بھادوں کی رم جھم کے بعد گاؤں کی عورتیں بنیادوں کے ننگے پتھروں کو مٹی اور بھوسے کے لیپ سے ڈھانپتی ہیں — اگلے ساون کے لیے۔

باقی تمام موسموں میں نالہ خشک رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گول پتھروں میں نالے کی ریت پتھر کی سلیٹ بن جاتی ہے اور گاؤں کے بچے نالے میں ایسی کھیلیں کھیلتے ہیں جو کسی کو سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں آج تک ان کھیلوں کو نہیں سمجھ سکا۔

بچے، کسی جیومیٹری کے پروفیسر کی طرح، چھوٹے چھوٹے پیروں کے ننھے منے انگوٹھوں سے آڑی، ترچھی، ٹیڑھی لکیریں بناتے رہتے ہیں۔ شام کے سائے پھیلنے پر جب وہ گھروں میں دبک جاتے ہیں تو اکثر، چودھویں رات کے چاند کی چاندنی میں، نالے کی سطح پر پتھریلی سلیٹ نما ریت ایسی تحریروں سے بھری نظر آتی ہے جو کسی قدیم تہذیب کے قدیم انسانوں کی لکھی ہوئی محسوس ہوتی ہیں، ایسی تحریریں جن پر حیات و ممات کے سربستہ راز لکھے گئے ہوں — آڑی، ٹیڑھی، ترچھی قوسوں اور زاویوں والی تحریریں۔

برساتی نالہ شمال کی سمت سے کھوڑ گاؤں میں داخل ہوتا ہے اور جنوب مغرب سے نکل جاتا

Scanned with CamScanner

ہے۔ گاؤں میں داخل ہونے کی جگہ سے تقریباً سو گز پیچھے نالے کے دونوں کنارے بلند ہو جاتے ہیں۔ انھی بلند کناروں میں سے مغربی سمت بابا علی کی مسجد ہے۔

چھوٹی سی مسجد کے چھوٹے سے صحن میں گارے کا لیپ ہے جس پر ٹاٹ بچھے رہتے ہیں۔ چھوٹے سے تین ستونوں والے برآمدے میں سرخ اینٹوں کا فرش ہے۔ سامنے محراب ہے اور مسجد ہی میں، محراب کی دائیں جانب حجرے میں، بابا علی دفن ہے۔ صحن کے ایک کونے میں کنواں ہے جس کی تہہ آج تک کسی نے نہیں دیکھی، شاید کھودنے والوں نے دیکھی ہو گی۔ ایک بار میں نے چھوٹا سا کنکر کنویں میں پھینک کر گنتی شروع کی، آہستہ آہستہ میں دس تک گن پایا تھا کہ پتھر پانی میں گرنے کی آوازیں آئیں جیسے کوئی کھانسا ہو۔ کنویں کی یہ کھانسی اکثر ربر کا بوکا[1] گرنے پر بھی سنائی دیتی ہے۔

❁

"کتنی دیر... " پچیس چھبیس برس پہلے سے مجھے بابا علی کی اداس سی آواز سنائی دیتی ہے، "کتنی دیر بیٹھو گے صاب اس قبر میں؟" ساون ہی کے مہینے میں اپنی چھ فٹ گہری قبر میں، میرے سامنے، بیٹھے ہوئے بابا علی نے کہا تھا، "آخر میں ہی رہ جاؤں گا اس قبر میں۔ کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا صاب۔ اکیلا جاؤں گا۔ پر تم کیوں آ جاتے ہو میرے پاس... جاؤ گے میرے ساتھ؟"

بابا علی کی آواز پُراسرار سی ہو جاتی تھی اور پھر وہ خود ہی قہقہہ سا لگا کر کہتا تھا کہ اُسے دنیا میں سب سے زیادہ سکون اس چھ فٹ گہری اور دو ڈھائی فٹ چوڑی قبر میں ملتا ہے جو اُس نے اپنی زندگی میں بنوائی تھی۔

بابا علی کی قبر کا ذکر کھوڑ کے اردگرد خشک چٹیل پہاڑوں میں پھیلے ہوئے کئی دیہاتوں میں کثرت سے ہوا کرتا تھا۔ لوگوں میں تجسس تھا۔ یہی تجسس مجھے کھینچ کر بابا علی کی قبر میں لے گیا۔ پہلے پہل تو وہ ناراض ہوا کہ اس کی عبادت میں فرق آتا ہے۔ پھر، نہ جانے کیوں، میں جب بھی قبر میں نیچے اترتی ہوئی سیڑھی پر پاؤں رکھتا تھا، بابا علی کا ہاتھ تسبیح پر رک جاتا تھا۔

---

[1] بوکا: پانی نکالنے کا ڈول

Scanned with CamScanner

''آ پتر!'' وہ مسکرا کر مجھے دیکھتا۔ چھوٹے سے دیے کی روشنی میں پُراسرار سا ماحول پل بھر کے لیے زندہ سا ہو جاتا تھا۔ اکثر قبر میں نم آلود مٹی پر بچھا ٹاٹ بھیگا بھیگا سا رہتا تھا۔ میں حیرت سے ٹاٹ کی نمی کو انگلیوں کی پوروں پر محسوس کیا کرتا تھا۔

''بابا،'' میں نے ایک بار حیرت سے پوچھا، ''پانی تو بہت دور ہے، یہ ٹاٹ میں نمی کیوں ہے؟''

''ترونکا[2] کرتا ہوں۔'' بابا علی نے چمکیلی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''گناہ تو دھلتے نہیں مجھ سے۔''

گاؤں کے بڑے بوڑھے قسم کھاتے تھے کہ بابا علی جیسا نیک شخص آج تک گاؤں میں پیدا نہیں ہوا۔ جوانی میں بھی وہ بھیڑ ہی رہا۔ پھر نہ جانے کون سے گناہ اسے پریشان کرتے تھے۔ شاید آباؤ اجداد کے گناہوں پر ہر وقت گڑگڑاتا رہتا تھا۔ آباؤ اجداد نے کون سے گناہ کیے ہوں گے؟

میں اکثر بابا علی کے چہرے پر نظریں جمائے، خاموش، دیر تک بیٹھا اسے دیکھا کرتا تھا۔ درمیانہ قد، گورا سرخ رنگ، گول چہرہ، بڑی بڑی غزالی آنکھیں جن میں ہر وقت ایک چمک سی رہتی تھی، کشادہ پیشانی، چوڑا دہانہ، ناک آگے کی سمت ہونٹوں پر جھکی ہوئی، مہندی رنگے پٹوں والے بال، سڈول جسم اور ہاتھ موٹے موٹے، جن میں تسبیح کے دانے اتنی تیزی سے حرکت کرتے تھے کہ انگلیوں کی جنبش کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

❁

ساون کی سہ پہر بھیگی بھیگی سی تھی۔ بارش کے بعد ہوا میں خنکی تھی، آسمان پر کہیں کہیں بادلوں کے سفید ٹکڑے کسی سمندر میں جزیروں کی طرح نظر آ رہے تھے — اَن دیکھے، اَن جانے جزیرے۔ میں کھوڑ گاؤں کی سمت جا رہا تھا۔ بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ بابا علی کو اس علاقے کی ثقافت اور روایات کا بہت زیادہ علم ہوگا۔ بابا علی نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مولوی سے حاصل کی تھی۔ پھر پنڈی گھیب کے

---

[2] ترونکا: چھڑکاؤ۔

Scanned with CamScanner

پرائمری اسکول سے پانچویں جماعت پاس کی۔ پھر شاید وہ شہر اٹک میں بھی گیا تھا مڈل پاس کرنے۔ بابا علی گھوڑ گاؤں کا پہلا مڈل پاس تھا۔ جوانی میں وہ سیلانی بھی رہا تھا۔ اٹک، میانوالی، سرگودھا، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان اور کتنے ہی علاقوں میں گھوڑوں و راونٹوں پر سفر کرنے والا بابا علی یقیناً بہت کچھ جانتا ہوگا۔

کسی نامعلوم کہانی، کسی مٹے ہوئے قصے کو سننے کی آرزو لیے میں بابا علی کی قبر میں اترا۔ قبر میں نمی بہت گہری تھی۔ حبس بہت بوجھل سا تھا۔

''بابا!'' میں نم آلود ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ ''اتنے دن ہو گئے ہیں تمھارے پاس آتے ہوئے۔ چپ چاپ بیٹھا رہتا ہوں میں۔ تم پڑھتے رہتے ہو۔ بس۔ نہ کوئی گل، نہ بات۔''

بابا علی نے قہقہہ لگایا۔ ''کیوں آتے ہو؟'' اس کی آنکھیں نم آلود اندھیرے میں چمکیں۔ ''نہ آیا کرو۔''

''بابا... '' نم آلود اندھیرے میں مجھے اپنا گلا خشک محسوس ہوا۔ ''کوئی پرانے وقتوں کا قصہ سناؤ۔''

''قصہ؟'' بابا علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے تسبیح اپنے اٹھے ہوئے گھٹنے میں ڈال دی، ہار کی طرح۔ ''گھیری صُورت والے رلجہ بسری کپ کا قصہ سنو گے؟'' بابا علی نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں بابا۔'' میں نے نم آلود ٹاٹ سے ایک تنکا کھاڑا۔ ''وہ تو مجھے معلوم ہے۔''

بابا پھر گہری سوچ میں پڑ گیا۔ چہرے کے تاثرات سے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سنجیدہ ہو گیا ہو۔ جیسے میرا سوال اس کے لیے بہت بڑا سوال بن چکا ہو۔ اس نے پہلو بدلا۔ گھٹنے میں ہار کی طرح ڈالی ہوئی تسبیح پھر نکالی۔ تسبیح کو تہہ کیا، ایک چھوٹی سی لکڑی کی ڈبیا جیب سے نکالی، تسبیح کو ڈبیا میں رکھا، اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔

میں گھبرا سا گیا۔ بابا علی شاید ناراض ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر تو قبر میں بیٹھا رہا، قبر سے نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ پھر میں بھی اٹھا، سیڑھی پر پاؤں رکھا۔ تین قدم اٹھے اور میرا سر قبر سے باہر نکلا۔ سامنے محراب کے اندر بابا سجدے میں پڑا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ سجدے سے سر اٹھاتا، میں تیزی سے

Scanned with CamScanner

پچھلے قدموں قبر میں اترا اور نم آلود ٹاٹ پر بیٹھ گیا۔ قبر کی دیواریں مٹی کے سرخ لیپ کی وجہ سے بہت ہموار تھیں۔ ٹاٹ کے آخری حصے پر ایک تکیہ دھرا ہوا تھا۔ ایک سمت دیوار میں چھوٹا سا طاقچہ نمایاں تھا جس میں ایک مٹی کا دیا موجود تھا۔ بابا علی کے دن رات اسی قبر میں گزرتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے نہ جانے کتنی ہی دیر، گزرتے ہوئے لمبے لمحے ٹھہرے سے لگے۔ پھر سیڑھی پر بابا علی نمودار ہوا۔

''ہاں پتر۔'' اس کی آواز میں غیر معمولی شگفتگی تھی۔ ''آج سن پھر قصہ کانی والے نکاح کا۔''

وہ سیڑھی سے اترا۔

بابا علی کی ہر حرکت میں تیزی سی محسوس ہوئی، جیسے وہ اندرونی طور پر ایک انجانا سا جوش محسوس کر رہا ہو۔

''دریائے سواں ہے نا...'' وہ میرے قریب سے قبر کی دیوار سے گھسٹ کر گزرے۔ ''تلہ گنگ جائیں تو پڑتا ہے نا رستے میں دریائے سواں۔'' وہ تکیے کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، ماچس نکالی، تیلی جلائی اور ہاتھ قبر کی دیوار میں دیے والے طاقچے کی سمت لے گیا۔ ''بڑا خراب رستہ ہے۔ سخت پہاڑیاں ہیں چکوال جانے والے رستے میں، اور سواں پہاڑیوں میں ہے۔'' اس نے دیا جلایا، دیے کی مدھم لو سے قبر میں روشنی پھیل گئی۔ بابا علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، چہرے پر شگفتگی اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک۔ ''حاصل کا قصبہ تھا جہاں میں نے دیکھا... لڑکا سا تھا میں۔ ویسے تو بہت گراؤں[3] میں کانی نکاح ہوتے تھے، پر حاصل والا کانی نکاح میں نے خود دیکھا تھا، نہیں بھولتا... کانی نکاح...''

❁

لمبے قد والی، ہر وقت خوش رہنے والی ماسی کھوز گاؤں آئی تو مجھے حاصل لے گئی۔ حاصل میں سلیٹی رنگی چٹانوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ درخت ایک بھی نظر نہیں آتا۔ بس چٹانوں پر کریر کی جھاڑیاں اور پھلاہیاں ہیں۔ وہ بھی چھوٹی چھوٹی، جھاڑیوں جیسی۔ غلیل تک تو بن نہیں سکتی حاصل میں... بس اگر

3 گراں گاؤں۔

Scanned with CamScanner

کوئی دلچسپی تھی میرے لیے حاصل میں، تو میری ماسی کا لڑکا ولیا تھا۔

ولی محمد سے میری دوستی گہری تھی۔ کبھی ولیا کھوڑ آ جاتا تھا، کبھی میں حاصل چلا جاتا تھا۔ گرمیوں میں ہم اکثر پتھریلی چٹانوں سے اتر کر دریائے سواں کی ٹھنڈی ریت پر گھٹنے گھٹنے شفاف شیشے جیسے پانی میں سیدھے لیٹ جاتے تھے۔ کہنیاں ریت پر ٹکا کے، سر پانی سے نکال کر، ہم دیر تک لیٹے باتیں کرتے رہتے تھے۔

پوہ ماگھ کے دن تھے جب ماسی مجھے حاصل لے گئی۔ حاصل میں چالیس پچاس گھر تھے۔ سارے حاصل میں ایک کنواں تھا، وہ بھی سلیٹی رنگی چٹانوں کے نیچے، سواں کی ریت میں... پوہ ماگھ میں تو سواں بھی سوکھ سا جاتا ہے۔

میں اور ولیا کنویں کے پاس بیٹھے تھے۔ ولیے کا خیال تھا کہ سواں کی ریت کے نیچے مچھلیاں رہتی ہیں اور جب دریائے سواں میں پانی آتا ہے تو مچھلیاں ریت سے نکل آتی ہیں۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کسّیاں[4] لائیں اور ریت کو کھودیں۔

"ریت ہٹا کر،" چوڑے ماتھے والے اور چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں والے ولیے نے کہنا شروع کیا، "ریت ہٹا کر ہم ساری مچھلیاں نکال لیں گے۔ پھر نا..." اس کے چہرے پر مسکراہٹ آئی اور دائیں رخسار میں گڑھا سا پڑ گیا۔ "پھر نا، ہم چادر بھر کے لے جائیں گے۔ خوب بھون کر کھائیں گے۔"

"کتنی ہوں گی مچھلیاں؟" میں نے پوچھا اور ولیے نے جھٹ میری سمت منہ گھمایا۔ اس کے گول چہرے پر چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی پلکیں تھر تھرا رہی تھیں۔

"جتنی بھی ہوں گی!" اس نے کچھ دیر کے لیے سواں کی ریت کو دیکھا جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔ "اچھا... اچھا کچھ بانٹ بھی دیں گے۔" ولیے نے پھر سواں کی چمکتی ریت کو دیکھ کر آنکھیں جھپکائیں۔ "ممریز خان کو بھی دیں گے۔ شودے[5] کا بیٹا لام پر گیا ہوا ہے۔"

"کون؟" میں نے پوچھا۔

"امیر خان، اور کون!" ولیے نے کہا، "پچھلے سال ایک فوجی آیا تھا وردی والا۔ اس نے

---

[4] کسّی: لمبے دستے والا زمین کھودنے کا اوزار۔ [5] شودا: بے چارہ۔

گاؤں کے سارے نوجوانوں کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کی تھی اور پھر ایک رجسٹر کھول کر بیٹھ گیا تھا۔ سارے گراں سے صرف ایک امیر خان گیا تھا اس کے ساتھ۔"

"کیوں؟ باقی ڈرپوک ہیں؟" میں نے احتجاج کیا۔ "کھوڑ سے تو پندرہ جوان گئے تھے پچھلے سال۔"

"کیا کھوڑ میں بھی آیا تھا فوجی؟" ولیے نے الٹا سوال کر دیا۔

"ہاں آیا تھا،" میں نے جواب دیا۔ "پر حاصل سے صرف ایک..."

"وہ..." ولیے نے تیزی سے کہا، "فوجی نے وردی والا فیتہ لے کر سب جوانوں کی چھاتیاں، گردنیں ماپی تھیں، آنکھیں کھول کھول کر دیکھی تھیں، منہ کھلوائے تھے اور..." ولیے نے ہنسنا شروع کر دیا۔ "اور..." ولیے کی ہنسی تیز ہو گئی۔

"اور کیا؟" میں نے ولیے کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

"اور... محمد خان نے بتایا تھا..." وہ ہے نا محمد خان نائی... اس نے بتایا تھا کہ فوجی نے رات کے وقت جوانوں کی شلواریں اتار کر بیٹریاں[6] ماری تھیں۔"

"کیا؟" مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

"ہاں... بیٹریاں ماری تھیں تیز لیٹ والی،" ولیے نے کہا، "یہی بتایا تھا محمد خان نے۔"

"بیٹریاں کیا ہوتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم،" ولیے نے کہا۔

"اور لیٹ؟" میں نے پھر پوچھا۔

"نہیں پتا مجھے،" ولیے نے پھر کہا۔ "پھر وہ امیر خان کو ساتھ لے گیا تھا اونٹ پر بٹھا کر۔" ولیے نے کچھ دیر سر کو دائیں بائیں جھلایا اور پھر تیزی سے میری جانب مڑا۔ "... ویسے نا،" اس نے رازداری کے سے انداز میں آہستہ سے کہا، "ویسے نا... گاؤں میں یہ بھی مشہور ہے کہ سارے جوان صحت مند تھے۔ کوئی بھی بیمار نہیں تھا۔ جوانوں کو فوجی کے ساتھ جانے سے نگریز نے روکا تھا... وہ ہے نا نگریز خان، میر یز خان کا بھائی... ستاراں کا ابا۔ ہاں، اس نے روکا تھا..." ولیے کی آواز سرگوشی

---

[6] بیٹری، ٹارچ۔

سی بن گئی۔" گلریز خان کہتا ہے کہ اپنا بادشاہ ہوتا تو وہ ہر جوان کو تھاپڑا مار کر[7] لام پر بھیجتا... انگریزوں کے لیے جوان کیوں لڑیں؟" ولیا کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔ "مریز خان کی زنانی، اپنی پڑوسن ہے نا وہ کاراں، وہ کہتی ہے کہ گلریز کو پولیس پکڑ کر لے جائے گی... گلریز کہتا ہے کہ وہ دونالی اٹھا کر پہاڑوں میں بھاگ جائے گا۔"

"امیر خان تو گلریز کا بھتیجا ہے۔" میں نے پوچھا: "اسے کیوں نہیں روکا؟"

"جھگڑا ہو جاتا!" ولیے نے فوراً جواب دیا۔ "امیر خان آپ جانا چاہتا تھا... گلریز روکتا تو جھگڑا ہو جاتا... پھر کیسے ہوتا ساراں کا بیاہ... امیر کی منگیتر ہے۔"

٭

ماسی کے گھر کا کچا کوٹھا مریز خان کے کچے کوٹھے سے ملا ہوا تھا۔ صرف ایک بنّی[8] سی بنائی ہوئی تھی کوٹھوں کے درمیان۔ دونوں گھروں کے صحن بھی ایک چھوٹی سی کچی دیوار سے الگ الگ تھے۔ کوٹھے پر سے دیکھنے پر دونوں صحن ایک جیسے نظر آتے تھے۔ دونوں صحنوں سے باہر جانے کے لیے دروازے دیوار کے پاس تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ہی بڑے دروازے کو دیوار کے آخری حصے نے کاٹ کر دو کر دیا ہو۔ میں اور ولیا چھت پر بیٹھے تھے۔ ولیے کو جب بھی گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلنا ہو اور وہ ان سے بچنا بھی چاہتا ہو تو وہ چھت پر چڑھ کر دھوپ میں گولیاں کھیلا کرتا تھا۔ باہر کوئی لڑکا آ کر شور مچاتا۔

"ولی محمد... اوئے ولی محمد... ولیے... اوئے ہم چلے ہیں سواں پر... آ جا۔"

ولیا چپ چاپ چھت پر بیٹھا رہتا تھا۔ لڑکا کچھ دیر شور مچا کر چلا جاتا تھا۔ لڑکے کے چلے جانے پر ولیا مسکرانے لگتا تھا۔ اس کے دونوں گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔

چاشت کا وقت تھا۔ سرمائی دھوپ سے چھپر کی مٹی اور مٹی میں بھوسے کی تیلیاں چمک رہی تھیں۔ آسمان پر سفید بادل کہیں کہیں، نیلی رضائی سے نکلے ہوئے روں[9] کی طرح نظر آ رہے تھے۔

---

[7] تھاپڑا مارنا: تھپکی دینا، شاباش دینا۔ [8] بنّی: منڈیر۔ [9] روں: روئی۔

اکا دکا چیل بھی ادھر اُدھر تاری مارتی[10] پھرتی تھی۔

اچانک مریز خان کے گھر سے سرگوشیاں ابھرنے لگیں اور ابھرتے ابھرتے تیز تیز باتیں بن گئیں۔ مریز خان، گاراں اور گلریز خان زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

''میں کہہ رہا ہوں گاراں... بھرجائی...'' گلریز نے صحن میں بچھی چارپائی پر پینترا بدلا۔ اس کے سیاہ پٹوں والے بال لہرائے، اس کی لمبی لمبی آنکھیں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ سیدھی ناک، آگے نکلے ہوئے ہونٹ اور بل کھاتی مونچھیں، سبھی کچھ جیسے کپکپا رہا تھا، وہ غصے میں تھا۔ ''بھرجائی.. میں اب بھی کہہ رہا ہوں... خط لکھ کر بلا لے امیر کو واپس۔''

''ہائے ہائے!'' چھوٹے قد کی موٹی، سانولی، پیچھے کی سمت کھنچے ہوئے بالوں والی گاراں نے اپنی انیرنی، جس پر وہ اون کے دھاگوں کو لپیٹ رہی تھی، نیچے رکھ دی۔ بڑی بڑی آنکھوں سے گلریز کو دیکھا۔ ''میں نے کب بھیجا ہے امیر کو... ہائے گلریز... میرے خلاف بولتا ہے تو... جب بھی بولتا ہے۔''

''ٹھہر... ٹھہر...'' مریز خان نے کہا۔ اس کا سفید لمبا چہرہ، چھوٹی چھوٹی کھنچی ہوئی آنکھیں، مہندی رنگے پٹے اور لمبے لمبے سخت ہڈیوں والے ہاتھ گلریز ہی کی طرح کانپ رہے تھے۔ ''صبر کر... ایک دم سے گرم نہ ہو جایا کر۔'' اس نے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں والا چہرہ گلریز کی سمت جھٹکے سے گھمایا۔ ''ہم نے نہیں بھیجا امیر خان کو... آپ گیا ہے۔ اپنی مرضی سے گیا ہے، اپنی مرضی سے آئے گا۔''

''پر کب آئے گا؟'' گلریز جھنجھلایا۔

''سال ہی تو ہوا ہے۔'' گاراں نے زمین سے پھر انیرنی اٹھائی اور ان کے دھاگوں سے رسی وٹنی[11] شروع کر دی۔ اس نے انیرنی کو جھٹکا دیا۔ ''سال ہی تو ہوا ہے۔ چھٹی ملتے ہی آ جائے گا۔''

''بہت سارے نہیں بھی آتے گاراں'' گلریز نے بے دردی سے کہا۔

''گلریز!... گلریز!'' گاراں تیزی سے بولی، ''خیر خیر مانگ گلریز، میرا کلیجہ نہ جلایا کر۔''

''رب خیر کرے گا گلریز'' مریز نے کہا۔

---

[10] تاری مارنا تیرنا۔ [11] وٹنا بٹنا۔

Scanned with CamScanner

"پر بھائی..." گلریز کے لہجے میں بھی تیزی تھی۔ "جوان ہوگئی ہے ستاراں۔"

میں اور ولیا کھسکتے کھسکتے چھت کی پٹی تک پہنچ چکے تھے۔ نظر آنے کے خوف سے ہم پٹی سے، چمٹ سے گئے۔

"تو یوں کہہ نا!" گاراں نے چھوٹی سی دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے ایک ٹانگ سیدھی کی اور اٹیرنی کو جھٹکا دیا۔ "بوجھ ہوگئی ہے ستاراں تجھ پر۔"

"تو چپ کر!" مریز نے غصے سے کہا۔

"کہنے دے۔" گلریز نے سر کو جھٹکا دیا۔ "کہنے دے۔ ٹھیک کہتی ہے گاراں... ہاں ہوگئی ہے بوجھ... دھی[12] کا باپ ہوں... ہوگئی ہے بوجھ... تیری امانت ہے بھرجائی... جا کر لے آ۔" گلریز خان کی آواز بوجھل ہوگئی۔ "نہیں سنبھالی جاتی مجھ سے۔"

"ہائے ہائے!" گاراں نے اپنے اُٹھے ہوئے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ "ہائے... ستاراں ہماری تو گائے ہے بے چاری... تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے گلریز۔"

"کیوں، خیر تو ہے؟" مریز نے کھنچی ہوئی آنکھوں کو اور کھینچا اور وہ لکیریں ہو گئیں۔ "امیر جلدی ہی چھٹی پر آئے گا۔ آتے ہی لے آئیں گے ستاراں کو۔"

"ہاں، ہے!" گلریز بولا، "ہاں، ہوگیا ہے میرا دماغ خراب... بس تو لے آ ستاراں کو۔" گلریز نے مریز کی سمت دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ "نہیں، بھراجی!" گلریز کی بوجھل آواز کانپ رہی تھی۔ "مجھ سے انتظار نہیں ہوتا... ہوتا ہی نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟" مریز خان نے پوچھا۔

"شیکو خان کی ماں آئی تھی کل۔" گلریز نے گاراں کو دیکھا۔ "رشتہ مانگنے۔"

"ڈر وہی بٹی!" گاراں نے گالی دیتے ہوئے اٹیرنی نیچے رکھ دی۔ "سارے گاؤں کو پتا ہے کہ ستاراں امیر کی منگیتر ہے۔ ڈر، ڈر... میں... میں... جانتی نہیں مجھے جنی کرج...[13] میں..."

"تو کچھ نہیں کہے گی اسے!" مریز خان نے پھر غصے سے کہا، "گھر میں دھی ہے... ایسی

---

[12] دھی: بیٹی۔ [13] کرج: چیل نما سفید پرندہ۔

باتیں تو ہوں گی۔"

"مجھے نہیں پتا۔" ٹھگریز خان نے سر کے پٹوں کو جھٹکا دیا۔ "میں دگی والا ہوں۔"

"تو پھر کیا کریں؟" مریز نے کہا۔ اس کے چہرے پر بیزاری تھی۔

"مجھے نہیں پتا۔" ٹھگریز بولا۔ "بلاؤ امیر کو۔"

"مت ماری گئی ہے تیری۔" مریز نے غصے سے کہا۔ "میں کیسے بلاؤں اسے؟... پچھلے خط میں لکھا تھا اس نے... وہ کہیں برما ور ما میں ہے... کیسے بلاؤں اُسے؟"

"میں..." ٹھگریز نے کہا۔ "کب تک بٹھاؤں ستاراں کو گھر میں... میں..." یوں لگا تھا جیسے وہ کوئی بڑی بات کہنا چاہتا ہے۔ کہہ نہیں سکتا۔

مریز خان اور گاراں خاموش ہو گئے۔ مریز خان نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے سر کو جھٹکے دیے۔ کئی بار اس کے ہونٹ ہلے لیکن وہ نہ بولا۔ گاراں نے اٹیرنی ایک طرف رکھ دی۔ اون مٹی کے پے ہوئے صحن میں بکھر سی گئی۔ وہ سیدھی نظروں سے ٹھگریز کو دیکھ رہی تھی۔ ٹھگریز اس سے نگاہیں ملانے سے ہچکچا رہا تھا۔ اچانک گاراں کا سانولا چہرہ سرخ ہو کر سیاہ سا ہو گیا۔ چہرے پر سختی سی آ گئی، آنکھیں بھنچ سی گئیں۔

"تو جا..." اس نے کہا۔ مریز اور ٹھگریز دونوں یوں چونکے جیسے کسی نے انھیں جھٹکے سے، گہری نیند سے جگایا ہو۔ "جا تیاری کر، میں لاؤں گی میل، کانی کے ساتھ۔"

❀

بکری کی شکل والی ستاراں واقعی گائے جیسی تھی۔ اس دن جب گاؤں میں کانی نکاح کی خبر اُڑنے لگی، عورتیں ٹھگریز خان کے گھر کی سمت بڑھنے لگیں۔ میں اور دلیا بھی گئے۔ شام کے وقت جب مستی میراثی، چھوٹے قد کا، گھنگھریالے بالوں والا کالا مستی میراثی، اپنا ڈھول لے کر کانی نکاح کا اعلان کرنے نکلا تو ستاراں اپنے گھر کی اندرونی کوٹھڑی میں چھپ گئی۔ مستی میراثی نے گاؤں کی گلی گلی میں ڈھول بجایا۔ دس بارہ قدم پر وہ رک جاتا تھا۔

Scanned with CamScanner

"گھمبج بکنا گھمبن گھمبج بکنا، گھمبج بکنا گھمبن گھمبج بکنا... سجنو، بیلیو، مستی اعلان کریاں پئیں.. مریز خان نیں پتر امیر خان ناں کاری نکاح گلریز خان نی دھی نال پرسوں نماشیں ہوسی... گھمبج بکنا گھمبن گھمبج بکنا... گلریز خان لونے چولاں نی دیگ دیسی، مریز خان باجے ناں کڑاہ، گھمبج بکنا گھمبن گھمبج بکنا... میڈی عرض اے، ہور جیہڑی شے بھی، تساں تھیوے، کھاون لئی امداد کریسو... گھمبج بکنا گھمبن گھمبج کنا، گھمبن، گھمبج بکنا گھمبن گھمبج بکنا..."

(دوستو، ساتھیو، مستی اعلان کرتا ہے کہ مریز خان کے بیٹے امیر خان کا سرکنڈا نکاح، گلریز خان کی بیٹی کے ساتھ پرسوں شام کو ہوگا۔ گلریز خان نمکین چاولوں کی دیگ پکوائے گا، مریز خان حلوے کی کڑاہی... میری عرض ہے کہ اس کے علاوہ جو چیز آپ کو پسند ہو، کھانے کے لیے مدد کریں۔)

گاؤں میں ہر سمت چہل پہل ہو گئی۔ ذریز خان اور مہدی فوراً گھوڑوں پر بیٹھے اور حاصل سے پانچ میل دور ایک ڈنی[14] کی سمت سرپٹ گئے۔ ڈنی پر کانیاں کثرت سے اُگتی ہیں۔ ان کے آنے تک سارا گاؤں جاگتا رہا۔

بوڑھی عورتیں فوراً دو حصوں میں بٹ گئیں، آدھی مریز خان کے گھر پہنچ گئیں آدھی گلریز خان کے گھر۔ جیٹھو خان کی ماں گھر ہی سے نہ نکلی۔ پھر دو تین عورتیں اسے تقریباً گھسیٹ کر گلریز خان کے گھر لے گئیں، ورنہ ادھیڑ عمر کی زیادہ عورتیں مریز کے گھر آ ئیں اور گاؤں کی تمام جوان لڑکیاں ستاراں کے پاس پہنچ گئیں۔ مستی میراثی کی بہن نسیم، لمبوترے چہرے والی، لمبی لمبی آنکھوں والی، کھنچی ہوئی مینڈیوں[15] والی نسیم ڈھولکی لے کر گلریز خان کے صحن میں بیٹھ گئی اور دھینگ دھینگ بجی بجی پر گانا شروع کر دیا۔

بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے دیہاتی گاؤں کے باہر پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر جمع ہو گئے اور نوجوان، جوش میں بھرے، مستی ڈھولی کے ساتھ اس رستے میں جم گئے جس رستے سے ذریز خان اور مہدی نے کانیاں لانی تھیں۔ جیٹھو خان کہیں بھی نظر نہ آیا۔ شاید شرمندہ ہو گیا ہوگا۔

ہم لڑکوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ کبھی ہم گلریز کے گھر پہنچ جاتے کبھی مریز کے، اور کبھی گاؤں

---

14 ڈنی۔ تالاب۔ 15 مینڈیاں بالوں کی لٹیں۔

Scanned with CamScanner

کے باہر، پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بھی رہتے ہیں... اندھیرا ہوتے ہی سردی بڑھ گئی۔ ٹیلوں پر بوڑھوں نے گھاس پھوس اکٹھی کی اور آگ جلائی۔ ہم سب ٹیلوں پر پہنچ گئے۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ آگ کی روشنی میں بوڑھوں اور ادھیڑ عمر والے دیہاتیوں کے شکنوں والے چہروں کی ہر شکن سرخ سی نظر آتی تھی۔ نوجوانوں کے سرخ چہرے چمک رہے تھے۔ محمد خان نائی کا باپ فضل خان وہ پیسے گن رہا تھا جو گاؤں والوں نے امداد کے طور پر دیے تھے۔ اچانک اس نے سر اٹھایا۔ آنکھیں آگ کی لپٹ سے نکلتی ہوئی روشنی میں چمکیں۔ ''گوشت روٹی اور میوے والا پاگیا[16]'' اس نے اعلان کیا۔

''ہا آآ آ... ہا!'' بوڑھوں نے بھی جوانوں کی طرح نعرہ لگایا۔ رستے پر دور، ٹاپوں کی آواز آتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ نوجوانوں نے نعرے بلند کیے۔ کانیاں آ رہی تھیں۔ مستی میراثی نے دائیں ہاتھ کی موٹی ترچھی لکڑی سے ڈھول پر بھرپور ضرب لگائی دھانگ..

ڈریز خان اور مہدی گھوڑوں سے ترے۔ ان کے گھوڑوں کی باگیں شریف اور نواز نے سنبھالیں۔ ڈریز اور مہدی نے اپنے بازو اوپر اٹھائے، سروں سے اوپر انھوں نے سرکنڈے اٹھائے اور جلوس کی طرح ٹیلوں کی سمت آئے۔ مستی میراثی سب سے آگے تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کانی کے بول گا رہا تھا۔

''دھینگ دھینگ ڈھانگ ڈھانگ
دھینگ دھینگ دھانگ دھانگ دھینگ
وٹجو سئد وڈھولے آں
کانی پانی ایں سیں آئی پاکے ساوے چولے آں''
(جاؤ، میرے محبوب کو بلاؤ، سرکنڈا پانی سے آیا ہے سبز لبادہ اوڑھ کے)

کانی نکاح میں ہمیشہ ہری کانیاں ہوتی ہیں، سوکھی کانیاں نہیں ہوتیں۔ نوجوانوں سے بوڑھوں نے کانیاں لیں۔ ایک کانی گز سے بھی چھوٹی تھی اور دوسری اس سے بھی آدھی۔ بوڑھوں نے بھی کانیاں سروں سے اوپر اٹھائیں۔ ہر بازو اوپر اٹھا ہوا تھا، ان کا بھی جنھوں نے کانیاں نہیں پکڑی ہوئی

---

16 پاگیا: حلوہ۔

تھیں۔ بس ایک شخص کے بازو اوپر نہیں تھے — ستاراں کے باپ گلریز کے۔ بوڑھوں نے کانیاں مریز خان کو دیں۔

"ہاں گھِن اپنا پتر!" (یہ لے اپنا بیٹا) سب بیک زبان بولے۔ مریز خان نے کانیاں سر سے اوپر ہی اوپر پکڑیں اور پھر گھوڑے کی طرح گاؤں کی سمت سرپٹ بھاگا۔ مستی نے دھا تنگ لگائی اور ہر سمت قہقہے گونجے۔ پھر سب گیت میں شامل ہو گئے۔

"ڈو تجو سند و ڈھولے آں
کانی پانی آیں ہمیں آ کی پا کے ساوے چولے آں"

مستی میراثی کے پیچھے پیچھے سب لوگ جلوس بنا کر گاؤں پہنچے۔ مریز خان اور گلریز خان کے گھروں کی چھتیں لالٹینوں کی روشنیوں میں چمکتے چہروں اور چوڑیوں کی کھنکناہٹ میں قہقہوں سے گونج اٹھیں۔

⊛

اگلا دن تیاریوں میں گزرا۔

کانیوں کو باندھا گیا۔ گز سے بھی چھوٹی کانی کے اونچے حصے سے کچھ نیچے دوسری کانی کو دھاگوں سے یوں باندھا گیا کہ وہ بازو بن گئی، دو بازو۔ ایک سبز چھوٹا سا چولا راتوں رات تیار ہوا۔ ایک بوسکی کی سفید شلوار بنائی گئی۔ کانی کے سر کے اوپر گندھے ہوئے آٹے کو یوں تھوپا گیا کہ سِری (سر) بن گیا۔ ریشمی کپڑے کی سرخ لیر[17] پہلے ہی سے تیار کر لی گئی تھی۔ شام تک آٹے کی سری سوکھ جانے پر اس پر سفید دھاگے لپیٹ دیے گئے۔ ریشمی لیر کا پٹکا باندھ کر، اس پر سنہری تِلّے والی جھالر ڈال کر، سبز چولا پہنا کر، چٹی بوسکی کی شلوار باندھ کر، کانی کے کندھے پر چھوٹی سی چادر ڈال کر، جس کا رنگ گہرا پیلا، سرسوں کے پھول جیسا تھا، چھوٹا سا امیر خان بنا دیا گیا۔

فضل خان نائی، صبح صبح ہی سواں کے پار چلا گیا تھا، کھانے پینے کا سامان لانے۔ سواں پار سنا

---

[17] لیر: دھجی۔

ہے کہ کوئی بڑا گراں بے وزروال، وہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔

امیر خان کے دوست احمد، اسلم، عطا محمد، فتح خان، شہباز، غلام حسین، اللہ راضی، جاڑو خان، پہاڑ خان، آدم خان، انسان گل، مصطفیٰ، شفیق، رفیق اور نثار شام کے وقت عمر یز خان کے گھر کے آگے، ہمارے گھر کے سامنے کھلی زمین پر، مستی میراثی کے ڈھول کی تال پر، دیر تک ناچتے رہے۔

ہیٹو خان اب بھی غائب تھا۔

ولیے کو بھی جوش آ گیا۔ ولیا بھی ڈھانگ ڈھینگ ڈھینگ پر بندروں کی طرح اُچھلنے لگا۔ وہ چکر کھاتا میرے قریب آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ میرا کندھا ہل گیا۔ میں بھی ناچ میں شامل ہو گیا۔ ہماری عمر کے کئی لڑکے ناچ رہے تھے۔

نبو (نواب خان)، بھورے رنگ کا گٹھا نبو، ناچتے ناچتے کئی جوانوں کی ٹانگوں میں سے نکل گیا۔

گلریز خان کے گھر میں ستاراں کی سہیلیاں اناراں، قیصراں، بھاگاں، نور بھری، نور جہاں، فلک، امتیاز بانو، چنو، زرداں، گلاب بانو، صغراں، منگھاں، سفیداں، رانی اور کئی چھوٹی لڑکیاں نسیم میراثن کے ساتھ ڈھولکی پر گیت گا رہی تھیں۔ آسمان پر سفید سفید سے بادل شام کے ڈوبتے سورج کی ترچھی کرنوں میں سنہری جھالروں والے پنکھے بن گئے تھے۔ گوٹے کناری والی چادریں بن گئے تھے۔

ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ پہاڑیوں میں سے سنسناتی، کریر اور پھلاہیوں کو جھلاتی، ڈھلوانوں پر تیزی سے اترتی، سیدھی گاؤں کی گلیوں میں دوڑتی تھی۔ جسے چھوتی تھی، کپکپا جاتا تھا۔

کانی نکاح کے بارے میں ولیے کی معلومات مجھ سے بہت زیادہ تھیں۔ حاصل میں اس سے پہلے بھی کانی نکاح ہو چکے تھے۔ رات کے وقت جب ماسی نے لالٹین بجھا کر کمرے کو گھپ کر دیا تو میں اس انتظار میں لیٹا رہا کہ ماسی سو جائے تو ولیے سے پوچھوں۔ ماسی کے تیز تیز سانسوں کے ساتھ ہی

Scanned with CamScanner

ولے کی چارپائی کی سمت کھسکا۔ ولیا سورہا تھا۔ میں واپس اپنی چارپائی کی سمت آ گیا۔

"آخر کاری نکاح کیوں ہوتا ہے؟" اس سوال کا جواب میرے ذہن میں نہ آنا تھا نہ آیا۔ ماسی سے پوچھنے کی ہمت نہ تھی۔ ماسڑ (خالو) جیتا ہوتا تو اس سے پوچھتا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی کمرے کی چھت سے چمٹی ہوئی کوئی بِرلی[18] تک تک کرتی کھسکنے لگتی تو میں اندھیرے میں رضائی سے سر نکال کر اسے دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

صبح میں ڈھولکی کی آواز سے جاگا۔ مریز خان کے گھر پہلی بار ڈھولکی بج رہی تھی۔ میں اور ولی دوڑ کر چھت پر چڑھے۔ صبح کی دھوپ ٹھٹھری سی تھی۔ مریز خان کے صحن میں، مدھم مدھم دھوپ میں، نسیم میراثن بیٹھی ڈھولکی بجا رہی تھی۔ کچھ اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔

"دھینگ دھینگ بجی بجی... دھینگ دھینگ بجی بجی..."

لڑکیوں کے قریب چنگیر میں گڑ میں گندھے ہوئے گندم کے بھنے دانے پڑے تھے۔ وہ دو دو کے اُٹھاتی اور پھکے مار رہی تھیں۔[19]

"دھینگ بنگ بجی... دھینگ بنگ بجی بجی... ساوا رنگ تو نڈی کانی ناں
اسیں لدا ان گھِن ویساں تُو ہاکھن تو نڈی نانی ناں
(تیرے سرکنڈے کا رنگ ہرا ہے۔ ہم تجھے تیری نانی کا دروازہ توڑ کے لے جائیں گے۔)
دھینگ بنگ بجی بجی..."

گاراں، موتی گاراں کا خوشی سے برا حال تھا، مورنی کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ اچانک فضل خان نائی کی بیٹی زرداں کی نظر ہم پر پڑی۔

"ہا... ئی..." اس نے انگلی ٹھوڈی پر رکھی۔ "دیکھوان منڈوں کو، چام چڑکھی کی طرح بنیرے سے چمٹے ہڑ ہڑ دیکھ رہے ہیں۔" (دیکھو ان لڑکوں کو، چمگادڑ کی طرح منڈیرے سے چمٹے ہڑ ہڑ دیکھ رہے ہیں۔) سب لڑکیوں نے ہماری طرف دیکھا اور ہم اُلٹی قلابازیاں کھا گئے۔ پھر کھسکتے کھسکتے سیڑھیوں تک آئے اور پھر تیزی سے نیچے اترے۔ نیچے اترتے ہوئے میں نے پھر صحن کی طرف دیکھا۔ لڑکیاں ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ ماسی چولھے کے پاس، باورچی خانے میں بیٹھی روٹیاں پکا رہی

[18] برلی چھپکلی۔ [19] پھکے مارنا پھکے مارنا۔

تھی۔ باورچی خانے کا دروازہ ممریز خان کے صحن کی طرف تھا۔ ابھی ہم باورچی خانے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ صحن کی کچی دیوار پر دو ہاتھ نظر آئے۔ پھر مولوی مست خان کی لڑکی قیصراں کا سر دیوار سے اوپر اٹھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی تیز تیز آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔

”بن ماشو!“ (بدمعاشو) اس نے پتلی تیز چبھنے والی آواز میں کہا اور دھڑام سے پیچھے اتری۔ ماسی جیسے سب کچھ سمجھ گئی، اس نے چمٹا پکڑ کر ہماری طرف لہرایا۔ ”کڑوں جاکتوں (لڑکوں) میں جاتے ہوئے شرم آتی ہے تمھیں؟“ ماسی نے کہا اور دو نیلے سے دانت نکالے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ تھا، گالوں میں دو گڑھے نمایاں ہو گئے۔

❁

گاؤں کی مغربی سمت چھوٹی سی مسجد کے قریب لڑکوں کا ہجوم تھا۔ سہ پہر کی دھوپ میں آہستہ آہستہ خنکی نمودار ہو رہی تھی۔ کچھ دور دو دیگیں پتھروں کے بڑے چولہوں پر چڑھی تھیں۔ ایک چولہے پر گڑ بنانے والا بڑا سا کڑاہ موجود تھا۔ فضل خان نائی اور اس کا بیٹا محمد خان کام میں جٹے ہوئے تھے۔ فضل خان اپنی عادت کے مطابق چیخ چیخ کر بول رہا تھا۔ کھوڑ گاؤں میں بھی ڈاڈا دائی، چیچک کے داغوں والا، ہر وقت جٹنے والا نائی بھی، اسی طرح چیخ چیخ کر بولتا تھا۔ بیاہ کا کھانا پکاتے ہوئے شاید سبھی نائی چیختے ہیں۔ فضل خان، کبھی محمد خان کو ہدایت کبھی لڑکوں کو حکم، جو عموماً خشک کیکری کی لکڑیاں لانے سے متعلق ہوتا تھا، گلا پھاڑ کر دیتا تھا۔ لڑکے فوراً تعمیل کرتے تھے اور خشک کیکری کی لکڑیاں، قریب پڑے ڈھیر سے کھینچتے ہوئے دیگوں کی سمت لاتے تھے۔ گھسٹتی ہوئی لکڑی اپنے ساتھ ایک دو خشک ٹہنیاں بھی کھینچ لاتی تھی۔

گاؤں میں ہر شخص شام کا انتظار کر رہا تھا۔ نوجوان دوپہر کے سورج کی تمازت میں سواں کی سمت گئے اور پرلے کنارے پر، تھوڑے سے ٹھہرے ہوئے پانی میں دو چار کروٹیں لے کر، چادروں سے سر اور جسم رگڑتے واپس آ گئے۔ لڑکیوں نے سواں کے کتنے ہی پھیرے لگائے اور گھڑوں میں اتنا پانی لے آئیں، جیسے انھوں نے ہر گھر کی چھت پر مٹی کا لیپ کرنا ہو۔

سردیوں کی شام بہت جلد آ جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

شام ہوتے ہی سارا گاؤں بج دھج گیا۔ ماسی چار گھڑے پانی لائی تھی۔ میں اور دلیا ایک گھڑے سے نہائے اور پھر دیر تک دھوپ میں بیٹھے کانپتے رہے۔ ماسی نے دلیے کے ساتھ مجھے بھی نئی چادر کندھے پر رکھنے کے لیے دی۔

سورج ڈوبا، آسمان لال ہوگیا۔

جب گاؤں کے کچے کوٹھوں کے پیچھے، دیواروں کی بنیادیں سیاہ سی ہوگئیں تو مریز خان کے گھر سے شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ تمام نوجوان گھر کے سامنے جمع تھے، بوڑھے اندر صحن میں تھے، ہماری عمر کے تمام لڑکوں نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سب اچھل رہے تھے، اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ مستی میراثی تو باقاعدہ اچھل اچھل کر ڈھول بجا رہا تھا، تنی زور سے کہ اس کا منہ کھلا تھا، کالا چہرہ رنتا لال ہوگیا تھا۔

"ڈھانگ ڈھانگ ڈھانگ ڈھانگ ڈھینگ ٹِک ڈھینگ ٹِک..."

آہستہ آہستہ شام گہری ہوگئی۔

لالٹین جلیں بہت سے جوانوں نے لکڑی کے ڈنڈوں پر جھکویاں[20] باندھ کر تارامیرا کے تیل میں ڈبوئیں اور آگ لگا کر سروں سے بلند کرلیں۔ ڈھول کی تھاپ پر ہر قدم خود بخود ہل رہا تھا اور جھٹکوں سے ڈنڈوں پر جلتی جھکویاں ناچ رہی تھیں۔

ڈھانگ ڈھانگ ڈھانگ ڈھانگ ڈھینگ ٹِک ڈھینگ ٹک..."

نوجوان بار بار دائیں ہاتھ گلی کے موڑ کو دیکھتے تھے۔ موڑ سے آگے وُریز خان کا گھر تھا۔ گھوڑے کا انتظار تھا۔ اچانک گلی کے موڑ پر شیشو خان نمودار ہوا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے، کندھے پر چادر تھی۔ شیشو خان کو دیکھتے ہی مستی میراثی پل بھر کے لیے رکا، پھر اس نے پوری طاقت سے ڈھول پر ضرب لگائی: "ڈھانگ!"

"ہلا بھائی... جیویں او شیشو خان!" مستی چنگھاڑا۔ دو نوجوان شیشو خان کی طرف بھاگے اور اسے بازوؤں سے پکڑا۔ دائیں بائیں قدم مارتے، وہ خود ناچتے شیشو کو بھی نچاتے، گلی میں سیدھے آئے۔ نوجوانوں کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے، آنکھیں دمک رہی تھیں۔

---

20 جھکوی: جھگی، چیتھڑا۔

"جگرا ہو تو ایسا!" جاڑو خان نے کہا۔

"شیر ہے اپنا شیشو۔" عطا بوبا اور مستی نے پھر دھانگ ذھانگ ذھانگ ذھانگ دھینگ بک دھینگ تک کی تال چھیڑی۔ سب ناچ رہے تھے۔ شیشو خان بھی!

ذریز خان نے گھوڑے کو اتنا سجایا ہوا تھا جیسے گھوڑے ہی کا بیاہ ہو رہا ہے۔ سرخ ساٹن پر زین کسی ہوئی تھی، زین پر سیاہ رنگ کا، گوٹے کناری والا ریشمی کپڑا تھا۔ باگوں کے ساتھ سنہری جھالریں لٹک رہی تھیں۔ گھوڑے کے ماتھے پر چمکتے پیتل کا پھول لگا ہوا تھا، جس کے دونوں جانب گھوڑے کے کان آگے پیچھے ہل رہے تھے۔ ٹانگوں پر گھٹنوں کے قریب سرخ رنگ کا ساٹن بندھا ہوا تھا اور چھاتی پر پیلے رنگ کا کپڑا پھیلا پھیلا سا تھا۔ گھوڑے کی گردن اور جسم کا چمکیلا، بجلی جیسا رنگ لالٹینوں کی روشنی میں مشکی ہو رہا تھا۔ ذریز خان نے خوب کھرکھرا کیا تھا گھوڑے کو۔

گھوڑا جب گلی میں آیا تو بڑی شان سے۔ اس نے سر اوپر کھینچا ہوا تھا، اگلے دونوں قدم گھٹنوں کو اوپر اٹھا اٹھا کر زمین پر رکھتا تھا۔ مستی میراثی نے فوراً ڈھول گلے سے اتارا، ایک سمت رکھا۔ اپنی چادر کو الٹ پلٹ کر دو گھنگھرو نکالے اور گھوڑے کے اگلے سُموں پر باندھ دیے۔ پھر وہ ڈھول کی جانب لپکا اور پہلے جیسے جوش و خروش سے اس نے دھانگ ذھانگ لگائی۔

ذریز خان کا گھوڑا ناچیا[21] بھی تھا۔ جب اس نے اگلے دونوں سم زمین پر بار بار پٹخے تو گھنگھرو جھنجھنا اٹھے۔ ناچتے ہوئے گھوڑے کا اگلا دھڑ نیچے ہو گیا۔ گھنگھروؤں کی جھنجھناہٹ کے ساتھ مستی میراثی نے "ہلا آآآ ہوووووہا" کا لمبا نعرہ لگایا اور تمام جوان ڈھول کی دھانگ دھانگ پر گھوڑے بن گئے۔ سبھی ناچ رہے تھے۔

مریز خان کے گھر کے اندر نسیم کی ڈھولکی کی دھینگ دھینگ کو مستی کے ڈھول کی دھانگ ذھانگ کھا گئی۔

اچانک ناچتے قدم رک گئے۔ ڈھول کی دھانگ ذھانگ، بکنا بکنا بکنا ہو کر مدھم ہو گئی۔ خاموشی سی چھا گئی۔ دروازے سے سفید کلف لگا کرتا نمودار ہوا۔ پھر مریز خان کا چہرہ، پھر کندھے، پھر سارا مریز خان۔۔۔ مریز خان نے پٹکے کی جگہ پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ دونالی بندوق کندھے سے

---

[21] ناچیا: ناچنے والا۔

لٹکائی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ نوجوانوں کو دیکھ کر اس نے سر کو جھٹکا دیا۔ مریز خان کے پیچھے گاؤں کے تین بوڑھے تھے — فراست خان، عجائب خان اور حضرت خان۔ تینوں مریز کے رشتے دار تھے۔

حضرت خان نے بازو بلند کیا۔ نوجوانوں نے نعرہ لگایا۔ گھر کے اندر عورتوں کا شور مچا ہوا تھا۔ سبز چولے والا، سفید بوسکی کی شلوار والا، گوٹے کناری والی پیلی چادر والا، ریشمی سرخ کپڑے کی لیر کے بنے پٹکے والا، چھوٹا سا گڈا، چھوٹا سا امیر خان... حضرت خان اور مریز خان نے سوت کے مضبوط دھاگے سے، کانی کے بنے چھوٹے سے امیر خان کو گھوڑے کی کاٹھی سے یوں باندھا کہ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

گھر کے اندر سے مُبارکاں مُبارکاں... مُبارکھاں کا شور مچ ہوا تھا۔ زریز خان نے گھوڑے کی باگ مریز خان کو دی۔ مریز خان نے گھوڑے کی باگ کو یوں پکڑا جیسے گھوڑے کے نتھنے پکڑ رہا ہو، چھاتی چوڑی کی، بندوق کو کندھے پر جھٹکے سے ٹھیک کیا اور پھر گھوڑے کی دائیں جانب ہو کر قدم اٹھایا۔

مستی میراثی گھوڑے کے سامنے آ چکا تھا۔

"خیر امیر خانے کی!" مستی نے نعرہ لگایا۔ گلی میں قدم بڑھے۔ بڑے شاندار اٹھتے ہوئے قدم، جیسے لبی کوڈی[22] کے کھڈیار[23] میدان میں جا رہے ہوں۔

ڈھول کے ساتھ گھوڑے کے قدم اٹھے تو گھنگھرو چھنا چھن بجے۔ کانی کا بنا ہوا امیر خان، ہر قدم پر اوپر اٹھ کر نیچے گرتا محسوس ہوتا تھا۔ جھٹکوں سے وہ گھوڑے پر بندھا ہوا کوئی جھنڈا محسوس ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں، مجھے بار بار یوں لگتا تھا کہ کسی جھٹکے پر، کانی کے اوپر آنے کی بنی سری پر بندھا پٹکا گر جائے گا۔ گلیوں سے بارات دھوم دھام سے گزری۔ گھوڑے کے آگے مستی میراثی بار بار ٹھہر جاتا تھا، جس پر پوری بارات رک جاتی تھی۔ نوجوان چار چار کی ٹولیوں میں بارات کے آگے آتے تھے اور ڈھول کی تال پر ناچنا شروع کر دیتے تھے۔ مستی نے نئی تال دی۔

دھینگا دھینگا را نا نا نا، دھینگا دھینگا را نا نا نا... ڈنڈوں پر گلی، تارا میرا کے تیل میں بھیگی جھگویاں

---

[22] کوڈی کبڈی۔ [23] کھڈیار کھلاڑی۔

Scanned with CamScanner

ناچتے ہوئے جوانوں کے سروں پر جھول رہی تھیں۔ شعلوں کو اوپر پھینکتے نوجوان چکر کھا رہے تھے اور ہر جلتی ہوئی مشعل، چکر کھاتے ہوئے قوس نما لکیر سی بناتی تھی، جس کے پیچھے دھوئیں کی سیاہ لکیر بھی چکر کھاتی تھی۔ تھک کر نوجوان گھوڑے کے آگے سے ہٹ جاتے تھے۔ مستی میراثی اس بار وہ قدم بارات کو لے کر جاتا تھا، رک جاتا تھا اور نئے جوش کے ساتھ ٹولی گھوڑے کے آگے رقص کرتی تھی۔ ولیے نے شرارتی گنجے بھورے نبو کو کمر میں ٹچ ماری[24]۔ ٹچ کھاتے ہی نبو گھوڑے کے نیچے سے نکل گیا۔ مریز خان نے گھوڑے کے بدکنے پر گھوم کر نبو کو دیکھا۔

"ہا۔ حرامی بانڈرا" (بندر)

جن نوجوانوں تک آواز پہنچی انھوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا اور نبو نے گھوڑے کی دوسری جانب نکل کر دانت نکالے۔

"ہا آ آ۔ ہو او او او۔۔" نبو نے سر جھکایا اور پھر تیزی سے گھوڑے کے نیچے سے نکلا، پھر اس نے گھوڑے کے پیٹ پر ہاتھ مارا، گھوڑا بدکا۔ نبو سیدھا گلی میں بھاگا۔ مستی کے پاس پہنچا، ڈھول کو گھونسا مارا اور سیدھا گلی میں نکل گیا۔ مستی نے بھی زور دار گالی دی۔

گلریز خان کے گھر سے دو تین گھر ادھر بارات رک گئی۔

مستی نے ڈھول بجانا بند کر دیا۔ گلریز کے گھر کے سامنے مستی کی بہن نسیم، سر پر دوپٹے کو پٹکے کی طرح باندھے، ڈھولکی کو گلے میں لٹکائے، عورتوں، لڑکیوں اور بچیوں کے دائرے میں کھڑی تھی۔ تمیں الشیین اس کے ارد گرد پڑی تھیں۔ ان لڑکیوں اور عورتوں میں وہ بھی شامل تھیں جو کچھ دیر پہلے مریز خان کے گھر میں موجود تھیں۔ وہ دوسرے رستے سے جلدی جلدی گلریز کے گھر بارات سے پہلے پہنچ گئی تھیں، لیکن گھر کے اندر نہیں گئی تھیں۔

دھنکی دھنکی، دھپ دھپ۔۔۔ نسیم ڈھولکی بجا رہی تھی اور لڑکیاں لُڈی کھیل رہی تھیں۔ دائرہ باندھے، وہ ایک قدم آگے بڑھاتی تھیں، کمر کو جھٹکا دے کر، سروں کو پیچھے کرتے ہوئے گھٹنوں کے قریب تالی بجا کر، پھر پاؤں آگے بڑھا کر، دونوں بازو اوپر اٹھاتے ہوئے چہرے سے کچھ اوپر پھر تالی بجاتی تھیں۔ تالی کے ساتھ ہی ہر لڑکی کے منہ سے "شی" کی آواز نکلتی تھی، پھر پاؤں ملتے، ایک قدم

---

24 ٹچ مارنا۔ ٹہوکا دینا۔

Scanned with CamScanner

آگے بڑھتا۔ گھٹنے کے قریب تالی بجتی، "شی" کی آواز ابھرتی... وہ دائرے میں گھومے جا رہی تھیں۔ نسیم اپنی جگہ چکر کھا رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی بے تالی تالیاں بجا رہی تھیں۔

دھینکی دھینکی ذھپ... شی شی شی... دھینگ دھینگ تکی تکی... شی شی شی...

مستی اور نسیم کی ماں، بوڑھی نیکو، دائرے میں آئی۔ نسیم کے سامنے اس نے قدم بڑھایا، تالی بجائی، پیچھے ہٹی، تالی بجائی۔

"دھینگ بک دھینگ بک... شی شی شی..."

نیکو کی لُڈی دیکھ کر تو جوان لڑکیاں حیران رہ گئیں۔

پھر سفیداں اور زرداں دائرے میں آئیں... پتا نہیں کتنی ہی دیر لُڈی کھیلی گئی۔ نسیم گھومے جا رہی تھی اور میں اس انتظار میں تھا کہ وہ کب چکر کھا کر گرتی ہے۔

وہ گرتی کیا! اچانک نیچے بیٹھی، اُٹھی، بازو گھمایا اور ایک چھوٹا سا پتھر سیدھا گھوڑے کی طرف آیا۔ نوجوانوں نے "بچیو بھائی!" (بچنا بھئی) کا شور مچایا۔ سب جانتے تھے کہ اب لڑکیاں پتھروں کی بارش کرنے والی ہیں۔

نوجوان اِدھر اُدھر اچھلتے، بس ویسے ہی، اندھیرے میں پتھر تو نظر آتے ہی نہیں تھے۔ بس شور تھا، قہقہے تھے۔ "ہلا بھائی، شاباشے" کا شور مچا ہوا تھا۔ لالٹینوں کی دھیمی دھیمی روشنی میں سب لوگ آدھے آدھے نظر آتے تھے۔ لڑکیاں جب پتھر اٹھانے کے لیے جھکتی تھیں تو یوں لگتا تھا جیسے سیاہ پانی کے تالاب میں غوطہ لگا رہی ہوں۔ نوجوانوں کے آدھے چہرے ہی صاف نظر آتے تھے۔ سائے لمبے تھے، وہ بھی دیواروں پر۔ بہت سے گہرے سایوں نے دیواروں کو بھی گھپ گھیر کر دیا تھا۔ کئی نوجوان پتھر کھا کر چیخے۔ مستی نے ڈھول پر بھرپوری قوت سے موٹی لکڑی کی ضرب لگائی دھاتک!

لڑکیوں کے اٹھے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ وہ سب جستی ہوئی، شور مچاتی، گلریز خان کی گھر کی طرف بھاگیں اور مریز خان کے گھر سے آنے والی عورتیں ایک سمت کھڑی ہو گئیں تاکہ بارات آگے آئے، کالی گھوڑے سے اترے اور گلریز خان کے گھر مسیل[25] جائے۔

مستی نے پھر وہی زبردست تال شروع کی جو اس نے ذریز خان اور مہدی کے کالی لانے پر

---

[25] مسیل۔ بارات۔

Scanned with CamScanner

بجائی تھی۔ دھانگ دھانگ ڈھانگ ڈھانگ، دھینگ تک دھینگ بک... برات آگے بڑھی۔

گلریز خان کے گھر سے پچاس قدم آگے مسجد تھی۔ مسجد کے پچھواڑے محمد خان اور فضل خان نائی، چھوٹی سی بھٹے کی چٹائی پر بیٹھے، مٹی کی کنالیاں[26] تولیے جیسے کپڑے سے صاف کر رہے تھے۔

"جا دیکھ..." فضل خان نے کنالی صاف کرتے ہوئے کہا، "چچو نے روٹیاں لگا دی ہوں گی۔"

"پیسے ہی..." محمد خان نے کہا، "مشین لگی ہوئی ہے اُسے؟"

"بک بک..." فضل خان نے کنالی نیچے رکھی۔ "جا دیکھ... شاباش... میل آ گیا ہے... جا۔"

"مڈی بھی نہیں دیکھی..." محمد خان نے احتجاج کیا۔ اچانک اس کی نظر ہم پر پڑی۔

"ولیے..." اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا، "جا چچو کے تنور پر، روٹیاں لگی ہیں کہ نہیں۔"

"تیرا نوکر لگا ہوں؟" ولیے نے جواب دیتے ہی گلریز خان کے گھر کی سمت دوڑ لگائی۔ میں بھی بھاگا۔

"کھانے کو تو بہت تگڑے ہوں گے... نوکر..." محمد خان کے دانتوں پسے لہجے کو ہم نے مسجد کے موڑ پر محسوس کیا۔ نوجوان، مستی کے ساتھ، مسجد کی سمت آ رہے تھے۔ مسجد کے صحن میں کچھ آگے خاصی چوڑی جگہ تھی۔

"گاؤں میں..." ولیے نے کہا، "جب بھی شادی ہوتی ہے نا... کھانا یہیں کھاتے ہیں۔" اس نے چوڑی جگہ کی سمت ہاتھ اٹھایا۔

ہم گلریز خان کے دروازے تک پہنچے۔

"یہ... یہ..." ہمیں اپنے سروں کے اوپر سے آواز آئی۔ "دیکھو جلد۔" گنجا بھورا تھو دیوار پر بیٹھا تھا۔ اس نے لکڑی کے دروازے اور چوکاٹھوں کے درمیان پاؤں رکھ کر اوپر چڑھنے کے لیے لکڑی کے ابھرے ہوئے کنڈوں کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ہمیں آنکھ ماری۔ لالٹینوں کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ بھورا بھوتنا لگ رہا تھا۔ میں نے ولیے کو دیکھا، ولیے نے مجھے... اور پھر ہم بھی

---

26 کنالی: پرات۔

دروازے پر چڑھ گئے۔ اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

❁

بدن کپکپا دینے والی ہوا کے باوجود تمام بوڑھے صحن میں جمع تھے۔ رنگین پایوں والی بان کی چار پائیاں صحن میں بچھی تھیں، کوئی شامیانہ نہیں تھا۔ چار پائیوں پر سفید چادریں بچھی تھیں۔ صحن کے آگے برآمدہ تھا، برآمدے میں تین ستون تھے، ماسی کے گھر کی طرح۔ برآمدے میں تین دروازے تھے۔ تین کمرے ہوں گے۔ برآمدے میں بوڑھی عورتیں موجود تھیں اور کمروں سے لڑکیوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تسیم بول اُٹھا رہی تھی:

"مینڈے ہتھ کٹورا بھریا بیس تاں ڈھولا
دھینگ دھینگ بجی بجی بجی دھینگ بجی بجی
دھینگ دھینگ بجی بجی بجی دھینگ بجی بجی
مینڈے ہتھ کٹورا بھریا بیس تاں ڈھولا
کِڈی ڈیتا وچھوڑا پیکے دیس تاں ڈھولا"

(میرے ہاتھ میں نیاز کا کٹورا ہے۔ میکے کی جدائی تو مجھے لیے جا رہی ہے)۔

تسیم کے ساتھ بول کے آخری حصے میں تمام لڑکیاں شامل ہو جاتی تھیں۔ امیر خان کا پُتلا صحن میں ممریز خان کے ہاتھ میں تھا۔ لالٹینوں کی روشنی میں یوں نظر آتا تھا جیسے امیر خان کا پتلا نہیں، ممریز خان نے لڑکیوں کے کھیلنے والا کوئی گڈا اٹھا رکھا ہوا۔ ممریز خان کے قریب چار پائی پر گل ریز خان اور مولوی ہست خان بیٹھے ہوئے تھے۔ مولوی ہست خان سردی سے سکڑا ہوا تھا۔ برآمدے میں ستاراں کی ماں نور بھری کٹورا اُٹھائے نظر آئی۔ برآمدے میں مُبارکاں مُبارکاں کا شور مچا۔ رسم کا تیل آ رہا تھا۔

مینڈے ہتھ کٹورا بھریا تیل تاں ڈھولا
کانی دعا نہ کری تینڈے میل تاں ڈھولا

Scanned with CamScanner

دھینگ تنی تنی تنی دھینگ تنی تنی

(میرے ہاتھ میں تیل کا بھرا ہوا کٹورا ہے۔ سرکنڈا مجھ سے تیری بارات کی صورت میں دغا نہیں کرے گا۔)

گاراں امیر خان کے پٹکے کی طرف بڑھی۔ نور بھری نے کٹورا سنبھالا۔ مہریز خان نے مسکراتے ہوئے پٹکا نور بھری کے سامنے کر دیا۔ نور بھری نے کٹورے میں اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی ڈبوئی اور مبارکاں مبارکاں کے شور میں اس نے انگلی سے تیل کے چند قطرے، پٹکے کے آنے سے بنے ہوئے سر پر بندھے سرخ پیر کے پٹکے پر گرائے۔

مہریز خان نے پٹکے کو اپنے کندھے کے قریب لا کر بند دیا۔ مولوی ہست خان اٹھا۔ مہریز خان نے پٹکا دائیں ہاتھ میں لیا، تمام بیٹھے ہوئے بوڑھوں کو پٹکا اونچا کر کے دکھایا۔

"یہ امیر خان ہے۔" مہریز نے بھرپور آواز میں کہا۔ "میرا بیٹا، میرا حلالی پتر... امیر خان میرا بیٹا ہے، میرا خون ہے..." مہریز نے اب گلریز کی سمت دیکھا۔ "گلریز خان میرا بھائی ہے۔ گلریز خان کا اور میرا باپ ایک تھا۔ ہم نے ایک ماں کا دودھ پیا ہے۔" مہریز کی نگاہیں اب اندر کی طرف گئیں۔ "ستاراں میرے بھائی کی بیٹی ہے، میری بھتیجی، میرے امیر کی منگیتر..." وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس کی آنکھیں چمکیں۔ پٹکے کو اس نے دائیں سے بائیں ہاتھ میں لیا۔ دائیں ہاتھ سے اس نے کندھے پر لٹکی دونالی کو جھٹکا دے کر بازو پر لیا، پھر بندوق کی نالی پکڑی۔ جھٹکا دے کر بندوق کو اچھالا اور دستے کے قریب پھر دبوچ لیا۔ ہاتھ کو جھٹکا کر اس نے بندوق سیدھی کی اور انگلی بندوق کے گھوڑے پر رکھ دی۔ بندوق کا رخ ہماری سمت دروازے کی سیدھ میں تھا۔ بھورے گنجے نبو نے گھبرا کر پاؤں اوپر کھینچے اور دیوار پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ مجھے بھی خوف سا محسوس ہوا۔ ولیا بھی پاؤں اوپر کھینچ رہا تھا۔

"سوں رب کی..." (قسم رب کی) مہریز کی آواز بلند تھی، کپکپا رہی تھی۔ "سوں رب کی... میرا امیر خان نافرمان نہیں ہے... میرا فیصلہ اس کا فیصلہ... میں نے اپنے امیر خان کے لیے اپنی سوہنی گلریز خان کی بیٹی ستاراں کو قبول کیا۔"

مبارکاں مبارکاں کا ایک بار پھر شور مچا۔ اندر کمرے میں اتنا شور مچا کہ کچھ دیر تو لڑکیوں کی ہنسی

Scanned with CamScanner

اور نہ سمجھ آنے والے جملوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ اسی شور میں مریز خان دو تین بار چیخا، لیکن کچھ سنائی نہ دیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ شور کم ہوا تو اس نے برآمدے میں موجود عورتوں اور صحن میں موجود بوڑھوں کی جانب دو تین بار دیکھا۔۔۔ "سنوں رب کی۔۔۔" مریز خان کی آواز میں غصہ تھا، کڑک سی تھی۔ "سنوں مجھے رب کی۔۔۔ اگر امیر خان نے میرا فیصلہ نہ مانا، اگر اس نے دوبارہ ستاراں کو سب کے سامنے قبول نہ کیا۔۔۔ تو۔۔۔" مریز خان کی آواز میں تھرتھراہٹ سی آئی، اس کے ہاتھ کی لرزش سے بندوق کی نالی بھی تھرتھرا رہی تھی۔ "تو۔۔۔ تو میں دو نالی سے اس کی چھاتی چھانتی[27] بنا دوں گا۔"

"خیر خیر!" بوڑھوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ مریز خان مولوی ہست خان کی طرف مڑا۔

"مولوی جی۔۔۔ دعائے خیر۔" اس سے پہلے کہ مولوی ہست خان دعا شروع کرتا، کاراں تیزی سے صحن میں آئی۔ اس نے کانی کا پنگلا، چھوٹا سا امیر خان، مریز سے لیا اور ہنستی ہوئی، دھب دھب کرتی برآمدے کی طرف دوڑی۔ برآمدے اور کمروں میں پھر شور مچا۔

"چپ!" مولوی ہست خان نے چلا کر کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ آوازیں آہستہ آہستہ مدھم ہو گئیں، پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ تمام بوڑھوں کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ کچھ نے چھاتی کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر کٹورے سے بنا لیے۔ کچھ بوڑھوں کے ہاتھ جڑے ہوئے نہیں تھے، پھیلے ہوئے تھے۔ عورتوں اور لڑکیوں نے اپنے ڈوپٹے سنبھالے۔ چہرے سے کچھ نیچے دونوں ہاتھوں سے ڈوپٹوں کو یوں پھیلایا جیسے چھاج میں دانے چھانٹ رہی ہوں۔ ولیے نے ہاتھ اٹھائے۔ میں نے بھی۔۔۔ نیو کا منہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔

"بہت بھوک لگی ہے!" نیو نے منہ کھول دیا۔ ولیے نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا۔ نیچے کھڑے دو بوڑھوں نے سر گھما کر ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مولوی ہست خان دیر تک دعا پڑھتا رہا جس کا ایک لفظ بھی مجھے سمجھ نہ آیا۔ دعا کے بعد مولوی نے بولنا شروع کر دیا۔ "مولا کریما۔۔۔" مولوی ہست خان کی آواز کانپ رہی تھی، ہاتھ بھی تھرتھرا رہے تھے۔ "مولا کریما۔۔۔ دونوں گھروں کو آباد رکھ، دونوں گھروں میں اتفاق دے، محبت دے۔۔۔ اس رشتے کو پکا کرنا تیرے

---

27 چھانی چھلنی۔

اختیار میں ہے مولا کریما۔ خان کو گھر لا خیر خیریت سے۔"

"آمین!" بوڑھوں کے ساتھ ساتھ برآمدے سے عورتوں کی بھی آواز آئی۔

"خوشیاں دے مولا کریما۔۔۔" مولوی ہست خان کا بدن بھی کانپ رہا تھا۔

"آمین!" پھر آوازیں مل کر آئیں۔

"روٹی دے۔۔۔ بھوک لگی ہے۔۔۔" نبو نے زور سے کہا۔ سب چہرے ہماری طرف مڑے۔ پھر برآمدے سے عورتوں کی ہنسی شروع ہوئی جو صحن میں قہقہوں کا شور بن گئی۔

"حرامی۔۔۔ بانذر۔۔۔" مریز نے پھر نبو کو گالی دی۔ مولوی ہست خان نے پھر آہستہ آہستہ پہلے ہی کی طرح دعا پڑھی۔ پھر اس کے ہاتھ ماتھے پر گئے۔ نیچے چہرے پر اترے، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آنکھوں سے اترتی ہوئی ناک کی دونوں جانب پھسلیں، ہونٹوں سے ہوتی ہوئی داڑھی پر آئیں اور پھر داڑھی کو دبوچتے ہوئے نیچے اتر گئیں۔ تمام بوڑھوں نے بھی مولوی ہست خان کی طرح چہروں پر ہاتھ پھیرے۔ مولوی ہست خان نے بلند آواز میں اعلان کیا: "جب امیر خان آئے گا تو میں ستاراں کو تین بار قبول کراؤں گا۔"

مریز خان نے فخر سے سر بلند کیا۔ گل ریز خان نے آگے بڑھ کر مریز کو گلے لگایا۔ ایک لفظ کہے بغیر دونوں دروازے کی سمت آئے۔ تمام بوڑھوں نے بھی دروازے کا رخ کیا۔

"روٹی!" نبو نے نعرہ لگایا۔ برآمدے سے عورتیں کمروں کی سمت بڑھیں۔ کونے والے کمرے میں ڈھولکی پر تھاپ پڑی۔

"ہل وے ماہیا
کیہا جھلا تھہ کیلے تاں دل وے ماہیا
ڈھینگ ڈھینگ تکی تکی۔۔۔ ڈھینگ ڈھینگ تکی تکی۔۔۔"
(آ مل، ہی! تجھ سودائی کا تو دل بھی دیوانہ ہے۔)

میں گیت سننا چاہتا تھا۔ ولیے نے کبھی میری طرف، کبھی نبو کی طرف دیکھا۔

"چلو چلو!" نبو نے نیچے دروازے کے کندے پر پاؤں رکھے۔ "نہیں تو پڑ ملیں گے۔۔۔ ہاں۔"

"گیت سن کر جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"پھر بڑ بھی کتنے لے جائیں گے۔" نبو نے بچے کو دوتے ہوئے کہا۔ بچے کرتے ہی گنگا نبو بیٹھ سا گیا، پھر اٹھا اور اس نے سر گھما کر ولیے کو دیکھا۔ "چل ولی محمد!" اور اس کے ساتھ ہی اس نے مسجد کی سمت دوڑ لگائی۔ ولیے نے پھر میری طرف دیکھا۔

"دھینگ دھینگ بجی بجی... دھینگ دھینگ بجی بجی...

بوتل تیل نی

وے گھن ونج ماہیا وے میں تو تڈے میل نی"

(بوتل تیل کی ہے۔ ماہی مجھے لے جا، میں تیری بارات کی تو ہو چکی ہوں۔)

ولیے کا صبر ٹوٹ رہا تھا، بار بار سر گھما کر مسجد کی سمت جانے والی تاریک گلی کو دیکھتا تھا۔

"میرا خیال ہے..." ولیے نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرا خیال ہے نبو ٹھیک کہتا ہے۔" کچھ سنے بغیر اس نے دیوار پر دونوں ہاتھ جمائے، بچے کندے پر پاؤں رکھا اور بیچے کو دو گیا۔ مجھے بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

مسجد کے پچھواڑے چوڑی جگہ کے درمیان الاؤ روشن تھا۔ لکڑیاں جو جو کر رہی تھیں اور شعلوں سے بل کھاتا دھواں اٹھ رہا تھا جو کچھ اونچا ہو کر اندھیرے میں چھپ جاتا تھا۔ ٹھٹھری ہوئی رات کو الاؤ نے یوں ارد گرد کی کچی دیواروں کی بنیادوں میں دھکیل دیا تھا جیسے سردی کا رنگ سیاہ تھا جسے روشنی نے مار بھگایا ہو۔ الاؤ کے گرد چادروں پر ایک سمت لڑکے بیٹھے تھے لڑکوں کے ساتھ بوڑھے، اور باقی تمام جگہ جوانوں نے گھیر رکھی تھی۔ دیگوں اور کڑاہ سے سیدھا رستہ، چھوٹا سا خود ساختہ رستہ، الاؤ تک جاتا تھا، جس پر محمد خان آ جا رہا تھا۔ وہ زیادہ تر کریر اور پھلاہی کی ٹہنیاں لا لا کر الاؤ پر پھینک رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے دانت نکالے۔ چادروں پر ادھر اُدھر گوشت کی بھری کنالیاں رکھی تھیں۔ ہر کنالی کے پاس تنوری روٹیوں کا ڈھیر تھا۔ نبو لڑکوں کے درمیان گوشت کی کنالی گھٹنوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے آنکھ ماری۔

"بہت ہے۔" اس نے ہمیں جگہ دیتے ہوئے کہا۔ "آؤ... آؤ... میں کنالی پکڑے بیٹھا ہوں۔"

''نواب خان'' ولیے نے خوشی اور حیرت سے کہا۔ اس کی آواز میں عجیب سا تاثر تھا۔ نبو نے دانت نکالے۔

''خیر فضل خانے کی'' کسی نوجوان نے گوشت کی لذت کو دانتوں میں پیستے ہوئے انگلی چاٹتے ہوئے بلند آواز میں فضل خان نائی کو شاباش دی۔ سب کھا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے، شور سا مچا ہوا تھا۔ ایک لڑکے نے کنالی سے بوٹی اٹھائی، بائیں ہاتھ میں پکڑی، دائیں ہاتھ سے کچھ گوشت توڑ کر منہ میں ڈالا۔

''بوٹی نہ بھن'' (بوٹی نہ توڑ) نبو نے غصے سے اپنی پلی جیسی آواز میں اسے ڈانٹا۔ لڑکے کے ہاتھ سے بوٹی کنالی میں گری۔ اس نے پھر اٹھائی اور نبو نے اپنے منہ سے بڑی، ایک شوربے سے لتھڑی بوٹی دانتوں میں لیتے ہوئے ناک اور ٹھوڑی کو شوربے سے بھگویا۔

پھر بیگے کی پراتیں آگئیں۔

انگلیوں کے ساتھ ساتھ پورے ہاتھ گھی میں تر ہو گئے۔ گھڑوں پر پانی کے بٹھل[28] بار بار کھڑکتے تھے۔ شور تھا، باتیں تھیں، چلتے دانتوں اور چٹختی ہڈیوں کی آوازیں تھیں۔

سردی رات کے پہلے پہر کی خنکی نے کنالیوں اور پراتوں میں گھی کو جما دیا تھا۔ پراتوں کے سفید سفید کناروں پر انگلیاں دیر تک پھرتی رہیں۔ پھر اکا دکا ڈکارنے کی آواز آئی۔ ایک سمت چلم (حقے) کی گڑ گڑ سنائی دی۔ کھانا کھانے کے بعد بوجھل بوجھل سی تھکن سب پر اتری۔ سردی کے احساس نے سب کو الاؤ کے قریب کر دیا۔ محمد خان نائی نے ایک دو نوجوانوں کو ہجکے[29] دے کر اٹھایا اور پھر کنالیاں اور پراتیں ایک ایک، دو دو اٹھتے اٹھتے اٹھ گئیں۔ چادروں پر جگہ جگہ سرخ سرخ شوربے کے داغ نمایاں تھے۔ انگلیاں چاٹنے کے بعد چادروں ہی سے پونچھی گئی تھیں۔ پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ نہ ختم ہونے والی باتیں۔ نبو نے چادر کا کونا اٹھایا، نیچے جھکا اور ہونٹ پونچھے، ناک پر بھی چادر کا کونا رگڑا۔

مسجد کی جانب سے عزیز خان اندھیرے سے سائے کی طرح نکلا۔ ''اٹھو بھائی جوانو!'' اس نے بلند آواز میں کہا، ''ڈولی آ گئی ہے۔'' عزیز خان کے دروازے کے سامنے ڈولی کے قریب گاؤں

---

28 بٹھل: پیالہ۔ 29 ہجکا: ٹھوکا۔

کے چاروں کہار — طافا، شیخ، خانو اور سرور — بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اندر عورتیں بھی کتالیوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ مستی نے ڈھول گلے میں لٹکایا۔ اس کی آنکھوں میں بھی غنودگی تھی۔ اس نے جمائی لی اور پھر سست انداز میں بائیں ہاتھ کی پتلی چھڑی سے ڈھول پر ٹھینک ٹھینک ٹھیک بجانا شروع کر دیا۔ وہ بار بار دائیں ہاتھ کو منہ کے قریب لا کر جمائی لیتا تھا۔ نوجوان بوڑھے، سبھی ڈولی کے قریب پہنچ گئے۔ کچھ اِدھر اُدھر۔ نہ ختم ہونے والی باتیں جاری تھیں۔

⊛

ڈولی اٹھنے کا منظر عجیب تھا۔ سہمی سہمائی ستاراں بار بار سر کو جھٹکے دے رہی تھی، جیسے سخت زکام کی حالت میں بار بار ناک سے بہتے پانی کو اندر کھینچ رہی ہو۔ گاؤں کی سب عورتیں رو رہی تھیں، سوائے گاراں اور دو چار لڑکیوں کے۔ ستاراں کو ایک طرف سے گاراں نے اور دوسرے بازو سے نور بھری نے پکڑا ہوا تھا۔ نور بھری کے کمزور سے ہاتھوں کے کناروں پر مہندی کا رنگ کالا تھا، یوں لگتا تھا جیسے توے سے پونچھ کر آئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

روتی ستاراں کو ڈولی میں بٹھایا گیا۔ بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی سرخ ساٹن کی شلوار کا پائنچا اوپر اٹھایا۔ اس کے پیروں کے کنارے بھی مہندی سے سیاہ ہو رہے تھے۔ گرگابی پر تلّہ چمک رہا تھا۔ ستاراں ڈولی میں بیٹھی۔ ستاراں کی سہیلیاں یوں رو رہی تھیں جیسے وہ پردیس جا رہی ہو۔ بوڑھی نیکو بار بار جھک کر، دونوں ہاتھ ستاراں کے سر کے اوپر جھلا کر، پھر ان کو تڑ چھا کرتے ہوئے اپنی کنپٹیوں سے لگاتی تھی۔ بلائیں لیتے ہوئے اس کے کمزور ہاتھوں کی جھریوں بھری انگلیاں یوں اکڑ جاتی تھیں جیسے گاؤں میں لڑکے ایک دوسرے کو ہوا بن کر ڈرایا کرتے تھے' شاید بلاؤں کو ڈرا رہی تھی۔ نسیم کی ڈھولکی خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک گہری سی کیفیت تھی، سفید لبوترے چہرے کا رنگ سانولا سانولا سا لگ رہا تھا۔ غم، یاس اور ہنگامے کے اتنی جلد ختم ہو جانے کا احساس، اس کی آنکھوں میں مایوسی تھرتھرا رہی تھی۔ لمبی آنکھوں کی پلکیں کانپ رہی تھیں اور ان پر آنسو لرز رہے تھے۔ ستاراں کا باپ گل ریز خان آگے بڑھا۔ ڈولی کا پردہ گرانے سے پہلے، وہ اپنا سر ڈولی میں لے گیا۔ اس کے مضبوط

کندھوں کی ہڈیاں، ڈولی کی چھت سے ٹکرا رہی تھیں۔ پتا نہیں اس نے کیا کہا۔ جب سر باہر آیا تو اس نے تیزی سے ڈولی کا پردہ گرایا، مڑا اور یک سمت پانچ چھ قدم اٹھاتے ہوئے اس نے کندھے پر پڑی چادر کا کونا پکڑا اور آنکھوں تک لے گیا۔ ڈولی اٹھی۔ مستی میراثی نہ جانے کب تھک کر بیٹھ گیا تھا، ڈھول سامنے رکھے اونگھ رہا تھا۔ ڈولی اٹھنے پر، نہ جانے کیسے، وہ یوں چونک کر اٹھا جیسے کسی نے اسے پیچھے سے چُٹ ماری ہو۔ اس نے تیزی سے ڈھول گلے میں ڈالا... "ڈھانگ!" ڈھول پر زبردست ضرب لگی۔ ڈھول کی دھانگ سے بہت سے اونگھتے ہوئے نوجوان یوں چونکے جیسے خواب سے بیدار ہوئے ہوں۔

"ڈھانگ دھا نگ ٹھنگ ٹھنگ..." مستی کے ڈھول نے برات پر چھائی غنودگی کو یوں بھگایا جیسے شکاری کتا خرگوش کو بھگاتا ہے۔ برات چلی۔ ڈھول کی تال پر رقص شروع ہوا لیکن اس بار وہ جوش و خروش جو برات کے آنے پر تھا، دب سا گیا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ بوڑھوں نے چادریں جسموں کے گرد لپیٹی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے، قدموں کی طرح دھیمی دھیمی باتیں۔ انہیں شاید ڈولی کا احساس ہی نہیں تھا جو کہاروں کے کندھوں پر، پتھریلی گلیوں میں ہچکولے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ کہاروں کے قدم تیز تھے، نوجوان ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ دو تین گلیوں سے گزرنے کے بعد بوڑھے پیچھے رہ گئے۔ اس بار مستی نے ڈولی کو بہت کم روکا، رقص بھی کم ہوا۔ شاید سردی کے احساس نے جوش و خروش کو ٹھرٹھرا دیا تھا۔ دیواروں پر اندھیرے کی تہیں مٹی کی لیپ کی طرح جم گئی تھیں۔ ڈنڈوں پر تارامیرا کے تیل میں بھیگی، جلتی ہوئی جھگویاں کپکپا رہی تھیں۔ اٹھتے ہوئے شعلوں سے مجھے، نہ جانے کیوں، مستی کی بہن تسیم کی آنکھیں نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اداس، سرخی مائل، کانپتی پلکوں والی، لرزتے آنسوؤں والی آنکھیں...

امیر خان کا پٹکا زریز خان کے گھوڑے پر بندھا ہوا تھا۔ پتھریلی گلیوں میں پٹکا گھوڑے کی ہر ٹاپ پر یوں آگے پیچھے جھٹکے کھاتا تھا جیسے اونگھ رہا ہو۔ گھوڑے کی باگیں اب بھی مریز خان کے ہاتھ میں تھیں۔ کچھ آگے، ڈھول گلے میں لٹکائے، مستی مریل سی تال بجا رہا تھا۔ اس کا سر بار بار سینے پر جھکتا تھا، آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ مستی نیند کے ہلکوروں میں خواب آلود تال بجا رہا تھا... دھینگی دھینگی ٹھنگ ٹھنگ... میں اور دیا مستی کے قریب چل رہے تھے۔ جب اس کا سر سینے پر جھکنے کے بعد دو تین

Scanned with CamScanner

قدموں پر جھٹکا کھا کر اوپر اٹھتا تھا تو ولیا زور سے ہنستا تھا۔ مستی کو کوئی ہوش نہیں تھا، یوں لگتا تھا کہ نیند کے کسی ہلکورے میں وہ ڈھول سمیت منہ کے بل گرے گا۔

اچانک ہمارے قریب سے شیشو خان آگے نکلا۔ مریز خان نے سر کو جھٹکا دے کر اس کی سمت دیکھا۔ شیشو کے ہاتھ میں باراتوں میں چھوڑا جانے والا گولا تھا۔ شیشو خان نے گولا چھوڑا، فضا میں گولا پھٹا، گھوڑا بدکا، پتلے نے جھٹکا کھایا اور ٹیڑھا ہو گیا۔

''ہا... حرامزو!'' (حرامی) چھوٹے قد کے گٹھے ہوئے بدن والے، کالے مستی میراثی کا سارا جسم کانپا، قدم اکھڑے، لکڑی ڈھوں پر پھسلی اور ڈینگ کی لمبی سی آواز نکلی۔ ''تراہ کڈ چھوڑیا ای!'' (چونکا دیا ہے۔) مستی نے سنبھلتے ہوئے دانت نکالے۔ قہقہوں سے بارات میں جان سی پڑ گئی۔ مریز خان نے ہنستے ہوئے پتلے کو ٹھیک کیا۔ بارات مریز خان کی گھر والی گلی میں پہنچی۔ عورتیں پھر بارات سے پہلے مریز خان کے گھر پہنچ گئی تھیں۔ ستاراں کو ڈولی سے اتارا گیا۔ معلوم نہیں کتنی رسمیں ادا ہوئیں۔ دروازے کی دہلیز پر دودھ اور تیل پھینکا گیا۔ نہ جانے کیا کیا ہوا ہو گا۔ مجھے نیند آ رہی تھی۔ ولیا بھی اونگھ رہا تھا۔ ہم سیدھے گھر پہنچے، بستروں پر دھڑام سے گرے۔ مجھے پڑوس میں، مریز خان کے گھر سے ڈھینگ ڈھینگ بجی بجی کی آواز آئی۔ میرے ہونٹوں پر نیند سے بھری مسکراہٹ پھیل گئی... نسیم ڈھولکی بجا رہی تھی۔

صبح چھانجل کی آواز پر میں جاگا۔ مٹی کے لیپ بھری خیالی دیوار میں چھوٹی سی کھڑکی روشن تھی۔ ولیا مجھ سے پہلے اٹھ کر باورچی خانے میں پہنچ گیا تھا۔ ماسی کے چھوٹے سے باورچی خانے میں ہم جڑ کر بیٹھتے تھے۔ ماسی نے توے پر پراٹھا ڈالتے ہوئے بتایا کہ دہلیز کو دودھ اور تیل سے بھگونے کے بعد ستاراں کو امیر خان کی ماں گاراں نے ڈولی سے یوں گود میں اٹھایا تھا جیسے وہ کوئی گڈی ہو۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگنے دیے تھے اور کونے والے چھوٹے کمرے میں لے گئی تھی۔ برآمدے میں لڑکیوں نے ڈھولکی پر خوب گیت گائے۔ نسیم آدھی رات تک ڈھولکی بجاتی رہی تھی۔ امیر خان کے پتلے کو مریز خان نے گھوڑے سے کھولا تھا اور پھر اوپر اٹھائے اٹھائے ستاراں والے کمرے تک لے گیا تھا اور پھر دروازے کے درمیان اوپر لگی کیل سے، سوت کے مضبوط سفید دھاگوں کی ڈوری سے باندھ دیا تھا۔ اب امیر خان کا پتلا اس وقت تک دروازے میں لٹکا رہے گا جب تک امیر خان آ نہیں جاتا۔

ہاں، پتلے کے کندھے سے پیلی لیرنما چادر اتاری گئی تھی۔

"چوکیداری کری۔" (چوکیداری کرے گا۔) ماسی نے کہا۔ "ستاراں نی حفاظت کری۔" (ستاراں کی حفاظت کرے گا۔) ماسی نے پراٹھا چنگیر میں پھینکا۔ "کہتے ہیں،" ماسی نے مقامی زبان میں لہجے کی مخصوص لچک کے ساتھ کہنا شروع کیا، "کہتے ہیں کہ نہ بیماری جائے گی اندر کمرے میں، نہ سانپ گھسے گا... دھوویں[30] بھی بھاگ جائیں گے۔"

"اور کرلیں؟" ولیے نے پراٹھا توڑتے ہوئے کہا۔

"کرلیاں..." ماسی نے پراٹھے کے پیڑے پر پیڑا جماتے ہوئے ولیے کو دیکھا۔ "کرلیاں کیا کہتی ہیں پتر۔" اس نے پیڑے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ "تو ذرا گل[31] کیوں ہو گیا ہے؟... ہیں..." ماسی کو غصہ سا آ گیا اور ولیے نے سر گھٹنوں میں دبا لیا۔ ماسی نے پھر پراٹھا توے پر ڈالا اور انگلیاں گھی والے کٹورے میں ڈال دیں۔ گھی کی خوشبو اور اپلوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں نے باورچی خانے میں ایک عجیب سی گرم گرم کیفیت پیدا کر دی تھی، جس میں کشش بھی تھی اور بھاگ جانے کی خواہش بھی۔ دھوئیں سے ہماری آنکھوں میں پانی سا آ گیا تھا۔

"پھر یوں ہوا،" ماسی نے خود بخود بولنا شروع کر دیا، "امیر خان کا جتنا سامان ہے گھر میں، کپڑے، کھیڑیاں[32]، چھروں والی بندوق، دو سانگا... سب ستراں کے کمرے میں رکھ دیا گیا ہے۔ اب ستراں پر پابندی لگ گئی ہے۔ قید ہو گئی ہے شودی... بس سویرے سورج نکلنے سے پہلے اور نماشیں[33] سورج ڈوبنے کے بعد دو سہیلیوں کے ساتھ باہر جائے گی اور بس۔ سارا دن کمرے میں رہے گی۔ کوئی سویٹر سوئٹر بنائے گی امیر خان کے لیے۔"

"اور دن،" ولیا پھر بولا، "اگر دن کو باہر جانے کی ضرورت پڑ جائے تو کیسے..." ولیا بے چارہ ابھی بات پوری نہ کر سکا تھا کہ ماسی نے ہاتھ گھما کر اس کے کندھے پر مارا۔ ولیا چیں کر کے مجھ پر گرا اور میں دیوار سے چپک گیا۔

"تجھے کہا ہے میں نے..." ماسی گرجی۔ "بدماشیاں (بدمعاشیاں) چھوڑ دے۔ چمڑی اتار... دوں گی تیری!" میں ڈر سا گیا۔ ولیے نے کون سی خراب بات کی تھی؟ کچھ دیر بعد ماسی نے ولیے

---

30 دھوویں: دھواں۔ 31 ذرا گل: ذرا بات۔ 32 کھیڑیاں: جوتے۔ 33 نماشیں: شام کو۔

Scanned with CamScanner

کی سمت دیکھا۔ آواز میں نرمی سی آ گئی۔ ''نہ پتر۔۔۔ زنانیوں کی طرف اچھے پتر۔۔۔'' اس نے پراٹھا گھما کر توے پر پھینکا۔ ''۔۔۔ دھیان نہیں دیتے۔''

ولیے نے چور نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ماسی کی طرف دیکھا۔ ماسی نے جھک کر اُپلوں پر پھونک ماری۔ دھویں کی لکیر ماسی کی گردن سے ٹکرائی، بل کھایا، دائیں بائیں کندھوں پر سے دو سانگا ہو کر نکل گئی۔

❁

اس دن ہم نے کئی بار صحن کی کچی دیوار کو ہاتھوں سے پکڑ کر، اُچھل اُچھل کر، اُچک اُچک کر امیر خان کے پتلے کو دیکھا جو کونے والے کمرے کے دروازے میں سفید سوتی دھاگے کی ڈوری سے بندھا، آہستہ آہستہ کبھی دائیں جانب چکر کھاتا تھا کبھی بائیں جانب۔۔۔ کمرے کے اندر ستاراں تھی۔ اکیلی، پابند، خاموش، انتظار کی کیفیتوں میں ڈوبی۔۔۔ اسے کھانا کمرے ہی میں پہنچایا گیا۔ اسے کمرے سے باہر آنے کی اجازت صبح کے دھندلکوں میں تھی یا شام کے گہرے سایوں میں۔ پتلا سورج کی کرنوں کے لیے دیوار بن گیا تھا۔ رات کا ایک گہرا احساس میرے ذہن میں بھی ابھرا۔ ولیے سے بات کی تو وہ شاید سمجھ نہ سکا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔'' ولیے نے میرے خیال کو اہمیت نہ دی۔ ''گاؤں میں جب کانی نکاح ہوتا ہے، لڑکی قید ہو جاتی ہے شودی۔ اب ستاراں کی جان امیر خان کے آنے پر ہی چھوٹے گی۔''

تین دنوں کے بعد، ماسی نے کھوڑ جانے کا اعلان کیا۔ اسی دن میں اور ولیا کھوڑ آ گئے۔ ماسی ولیے کو ہمارے گھر چھوڑ گئی۔ ہزار بار کانی نکاح کا ذکر چھڑا، ہزار بار میں نے ستاراں کا چہرہ دیکھا، خیالی اندھیری دیواروں کے بیچ، مسلسل پتلے کو دیکھنے والا چہرہ۔ ''بے جان پتلا مسلسل چکر کھاتا ہوگا، بائیں سے دائیں۔۔۔'' میں نے سوچا، ''شاید ستاراں انھی چکروں سے دن گنا کرتی ہوگی، فالیں نکالتی ہوگی۔ ہر صبح اُن پتھریلی پگڈنڈیوں پر نگاہیں جماتی ہوگی جن پر چلتے ہوئے امیر خان نے آنا ہے۔ جانے امیر خان کہاں ہوگا۔ فوجیوں کا کیا ٹھکانا، فوجیوں کی زندگی کا بھی تو بھروسا نہیں ہوتا۔۔۔''

Scanned with CamScanner

''او ولیے'' میں نے کھوڑ کے خشک برساتی نالے کی ریت پر پاؤں سے گھر بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے ولیے سے پوچھا۔ ''ولیے...''

''کیا ہے؟'' ولیے نے ریت سے پاؤں نکالا۔ خشک ریت کا گھر گر گیا۔

''وہ...'' میں اپنے خیال سے ڈر گیا۔ ''وہ امیر خان..'' میں نے بھی ریت سے پاؤں نکالا۔ گھر بیٹھ گیا۔

''کیا ہے امیر خان کو؟'' ولیے نے بے دھیانی سے کہا۔

''اگر وہ...'' میری آواز گلے میں پھنس سی گئی۔ ''اگر وہ محاذ پر مارا گیا تو...'' ولیے نے سر گھما کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سوال سا ابھرا جو گہرا ہو کر مٹ سا گیا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے ریت کے گھر کو دیکھا۔ ''رنڈی (بیوہ) ہو جائے گی سناراں۔'' ولیے نے آہستہ سے جواب دیا۔

*

سردیاں، دھوپ میں کھیلتے، برساتی نالے کی ریت پر تمازت کو پاؤں کے تلووں سے ماتھے تک محسوس کرتے، ٹھنڈی ہوا میں ہاتھوں کو دور دور سے ملتے، کمرے کی خیالی دیواروں پر چھپکلیوں کی ٹک ٹک سنتے، پتا ہی نہ چلا کب گزر گئیں۔ کھوڑ میں بہار کی آمد کا احساس اس وقت ہوا کرتا ہے جب کندھے کی بھاری چادریں بوجھل محسوس ہونے لگتی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے گندم کے کھیتوں میں گندم کے چھوٹے چھوٹے پودوں سے اچانک سرسوں سر نکالتی ہے۔ پھر پیلے پیلے پھولوں میں گندم کے پودے چھپ جاتے ہیں۔ کرنوں سے چمکتی فضا میں سرسوں کی مہک تیرنے لگتی ہے اور ہوا کی خنکی بدن کو اتنی بھلی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے چولے کے سامنے والے بٹن کھول کر، سرسوں سے بھرے کھیت کے کنارے بیٹھ کر، ساری دوپہر گزار دی جائے۔ ایک ہی کھیت میں گندم، سرسوں اور کناروں پر لگی مولیوں کے گہرے سبز چوڑے چوڑے پتے گھل مل جاتے ہیں۔ گندم سے کنک وتی[34] نکالنے میں گاؤں کے تمام لڑکے بہت تیز ہوتے ہیں۔ مٹی لگی مولیوں کو

34 کنک وتی۔ گندم کے کھیت کی بوٹیاں۔

دانتوں سے چھیل کر، مٹی کو ہونٹوں سے پونچھ کر، کھانے میں واقعی بہت لطف آتا ہے۔

ایسے ہی ایک کھیت میں چاچا[35] مولیاں نکال رہا تھا۔ اچانک اس نے ہم لڑکوں کو ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"تمھارا علاج ہو جائے گا۔" چاچے نے کہا۔ میں نے پریشانی سے ولیے کو دیکھا۔ لڑکے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کیسا علاج؟ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا، چاچے نے سر گھما کر ہمیں دیکھا۔ "ساون بھادوں میں اسکول کھل جائے گا چنڈی گھیب میں... سب کو داخل کرا دوں گا۔"

اسکول کیا ہوتا ہے؟ یہ لفظ سب کے لیے اجنبی تھا۔ چاچے نے تین چار مولیاں گھما کر کنارے سے آگے پھینکیں، جہاں مولیوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ "ڈی پی[36] اسکول کھلے گا چنڈی گھیب میں۔"

یہ ڈی پی کیا بلا ہے؟ کسی لڑکے میں جرأت نہ تھی کہ پوچھتا۔ شام تک لڑکے سوچتے رہے، ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ ڈی پی اسکول کیا چیز ہوگی؟ کئی لڑکے ڈر سے گئے۔ پھر مولوی ولایت خان کے لڑکے نواز نے اس راز سے پردہ اٹھایا۔ وہ شام کو برساتی نالے کی ریت پر بیٹھے بہت سے لڑکوں کے پاس جوش اور حیرت سے بھرا پہنچا۔ وہ تیز تیز باتیں کر رہا تھا، "اسکول... تلہ گنگ سے استاد آئے گا... اس کے پاس... اس کے پاس ڈنڈا ہوگا... جو اسکول نہیں جائے گا... اس کی... اس کی ہڈیاں توڑے گا..."

ولیا خاموش ہو گیا۔ شام تک خاموش رہا۔ پھر رات کو اس نے رونا شروع کر دیا۔ ماں نے بہت پیار کیا، پوچھا، سمجھایا، مگر ولیا ضد کر رہا تھا کہ اسے فوراً حاصل بھیج دیا جائے۔ چاچے نے بھی ولیے سے پوچھا کہ اسے کسی لڑکے نے مارا تو نہیں ہے؟ بس ولیا روئے جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ ولیا اسکول اور ڈنڈے کی بات سن کر سہم گیا ہے۔ ولیے کے رونے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سونے سے پہلے چاچے نے اعلان کیا کہ ایک دو دنوں میں ولیے کو حاصل لے جائے گا۔ میں نے بھی ضد کی کہ میں بھی جاؤں گا۔ چاچے نے پہلے ڈانٹا لیکن ماں نے سرگوشی میں نہ جانے کیا کہا، چاچا مان گیا۔ لیکن چاچے نے وعدہ پورا کرتے کرتے نہ جانے کتنے ہی دن گزار دیے۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ فضا بھی کبھی دھول سی دکھائی دینے لگی تھی، اکثر سہ پہر کے وقت۔ پھر

---

[35] مقامی زبان میں باپ کو چاچا کہتے ہیں۔ [36] ڈی پی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔

Scanned with CamScanner

ایک صبح ولیے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ کئی دنوں سے اداس تھا، چپ چاپ سا تھا۔ چاچے نے کچھ پرانے پوٹلی میں رکھے، اوپر ساگ رکھا، کندھے پر پٹکے جیسی چادر ڈالی اور بتایا کہ دتے ماچھی کا گڈ[37] حاصل جا رہا ہے۔ ولیے نے جلدی جلدی اپنے کپڑے یوں اکٹھے کیے جیسے وہ کوئی بلا ہو اور اپنے اگلے پنجوں سے کپڑوں میں چھپے چوہے کو نکالنے کے لیے وحشت زدہ ہو گیا ہو۔ ولیا میرے کپڑے گٹھڑی میں باندھنا بھول گیا، گٹھڑی، دوبارہ کھلی، بندھی۔ ولیے کے جسم کا ہر حصہ اتنی تیزی سے حرکت کر رہا تھا کہ مجھے وہ حاصل کے بھورے گٹھے نیو کی طرح محسوس ہوا۔ اچانک مجھے چکر کھاتا، دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، امیر خان کا پتلا تصور میں ابھرتا محسوس ہوا۔ پھر میں بھی ولیے کی طرح حاصل کا بھورا گٹھا نیو بن گیا!

*

آسمان پر دھول سی تھی۔ دتے ماچھی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے پسینہ آ گیا۔ صبح صبح آسمان پر دھول دیکھ کر ایک گھٹن سی محسوس ہوئی۔ گاؤں کی مٹیالی دیواروں پر دھوپ کی ترچھی کرنیں بھی مٹیالی سی تھیں۔ ہوا بند تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سانس لینے کے لیے سینہ پھول رہا ہو۔ میں نے ولیے کو دیکھا، وہ بھی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ چاچے نے ایک دو بار آسمان پر چھائی دھول کو دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن خاموش رہا۔ چاچے کی خاموشی کو دتے نے زبان دی۔

''ماں شک آیا...'' (مجھے شک تھا۔) دتے نے سمجھایا۔ ''بھاؤں دھوڑ اے۔'' (بہت دھول ہے۔)

''جاؤ گے کہ نہیں؟'' چاچے نے کہا اور ولیے کا منہ اتر سا گیا۔ دتے نے آسمان کی طرف دیکھا، گڈ میں جتے بیل کی طرف دیکھا، ہماری طرف دیکھا۔ ''ویساں جی۔'' (جائیں گے۔) اس نے بیل کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''ویساں کیوں نئیں؟'' (جائیں گے کیوں نہیں؟)

کھوڑ سے حاصل جانے والی چھوٹی سی پکی سڑک کی دونوں جانب کھیت ہیں۔ سڑک کے

---

[37] گڈ: بیل گاڑی۔

ساتھ ساتھ کھیتوں کے کنارے پر بیری، کیکر اور پھلاہی کے ساتھ ساتھ بیروں کی جھاڑیاں کاٹ کر خاردار باڑسی بنادی گئی ہے۔ خاردار باڑ کے پرے کھیتوں کو دیکھنے کے لیے گڈ میں کھڑ ہونا پڑتا ہے۔ دتے کا گڈ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ گڈ کی دونوں دیواریں لکڑی کے پھٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ اوپر کا حصہ چارپائی کی طرح تھا، جو گول لکڑی سے بنی ہو۔ کھیتوں کو دیکھنے کے لیے کبھی میں گڈ میں کھڑا ہو جاتا تھا کبھی ولیا۔ ایک دو بار تو دتے نے برداشت کیا، پھر چیخ اٹھا۔

''کھڑ یا جی کھا کے...'' (قلابازی کھا کر...) اس نے پتلی سی چھڑی والا بازو اوپر اٹھایا۔

''کھڑ یا جی کھا کے ڈھیسو، بے بے یاد آ وسی...'' (قلابازی کھا کر گرو گے... ماں یاد آ جائے گی۔)

اس نے دانت پیستے ہوئے بیل پر چھڑی برسائی۔ ''کدی نہیں تُسی تکیاں پٹیاں؟'' (کبھی نہیں دیکھے کھیت؟)

''انسان بنو!'' چاچے نے ہمیں ڈانٹا۔ بیل کے گلے میں بندھی گھنٹی کی ٹن، گڈ کے بڑے بڑے لکڑی کے پہیوں کی چوں اوں چوں اِی، سر پر چمکتی دھوپ، فضا میں پھیلی ہوئی دھول، جھاڑیوں کی باڑیں سوکھے سیاہ نوک دار کانٹے، کہیں کہیں مڑے ہوئے ایک دوسرے کو چبھے ہوئے سیاہ کانٹوں میں کسی پرندے کا چھوڑا ہوا بوسیدہ گھونسلہ بھی نظر آتا تھا۔ ہوا بند تھی، فضا میں ٹھہراؤ تھا، بوجھل سا ٹھہراؤ۔ گڈ کے ہچکولوں سے غنودگی سی نمودار ہوئی۔ دوپہر سے پہلے ہی غنودگی سے ہر چیز پر غبار سا چھا گیا۔ مجھے نہیں معلوم، میں سو گیا تھا یا جاگتے میں کسی ایسی جگہ تھا جو بھول جایا کرتی ہے، سوچنے پر بھی اکثر یاد نہیں آیا کرتی۔ اچانک دتے کا ایک گہرا جملہ سنائی دیا۔

''ہیا ھک آیا!'' (یہی شک تھا۔)

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے مجھے بھی شمال مشرق میں افق کے متوازی بہت گہرا غبار دکھائی دیا۔ بیل اپنے کان آگے پیچھے ہلا رہا تھا۔ دتے نے بیل کے کان پر پتلی سی چھڑی ماری۔ چھڑی مارتے ہوئے وہ بیل کی پشت پر چلا گیا۔ بیل نے کان اکڑائے۔ دتے نے مڑ کر چاچے کو دیکھا۔

''ہناری۔'' (آندھی۔) دتے نے بڑی احتیاط سے اپنا جسم گڈ میں کھینچا۔ ''بھاؤں ڈاہڈی ہناری۔'' (بہت سخت آندھی۔) اس کی آواز میں لرزش تھی۔ اس نے بیل پر چھڑیاں برسانی شروع

Scanned with CamScanner

کردیں۔ سامنے تقریباً آدھ کوس پر چٹانیں تھیں، جن میں سے نشیبی برساتی نالہ بل کھاتا گزرتا ہے۔ سیاہ پتھر کی چٹانوں میں کہیں کہیں گدلی ضیالی سفیدی سی بھی جھلکتی ہے۔ وہ ابھی چٹانوں تک پہنچنے کے لیے گڈو دوڑ رہا تھا۔ بیل کے قدم تیز ہوئے، وہ دائیں بائیں جھولتا کچی سڑک پر جگہ جگہ بنے کھڈوں پر دوڑ رہا تھا۔ بیل کے گلے کی گھنٹی ٹناٹن بج رہی تھی۔ ہچکولے اس قدر تھے کہ ولیے نے گڈی کی گول لکڑی کو اور میں نے ولیے کے بازو کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ہم یوں اچھلتے جا رہے تھے جیسے گھوڑے پر بغیر زین کے بیٹھے ہوں اور چال دُلکی ہو۔

چٹانوں سے کچھ پہلے کچی سڑک کے کنارے خاردار باڑ ختم ہو جاتی ہے۔ کھیت وہیں تک، پتھریلی زمین پر چاروں جانب بکھرے ہوئے ہیں جن میں جڑی بوٹیاں خشک ہوتے ہوتے ضیالی ہو چکی تھیں۔ ان میں زیادہ بوٹیاں ہرمل[38] کی تھیں۔ پھر زمین سے ابھرے ہوئے پتھر ہیں جو آہستہ آہستہ حجم میں بڑے ہوتے جاتے ہیں اور چٹانوں کے قریب وہ بیل کے قد کے برابر ہو جاتے ہیں، ضیالے، کہیں کہیں بجھے ہوئے چونے کی طرح گدلے اور کہیں بالکل سیاہ۔

بیل دوڑ رہا تھا۔

ہوا میں تیزی سی آ گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کی باڑ میں آندھی کے ابتدائی تھپیڑے سنسنا رہے تھے۔ میں نے پھر شمال مشرقی افق پر نظر ڈالی۔۔۔ میں ڈر گیا۔ زندگی میں کبھی میں نے کسی سرخی مائل ضیالی دیوار کو چلتے نہیں دیکھا تھا۔ زمین سے لے کر فضا میں جہاں تک نظر جاتی تھی، ایک مہیب خوفناک ضیالی دیوار چلتی آ رہی تھی۔ بہت آندھیاں دیکھی تھیں میں نے، ایسی سن کر دینے والی دہشت بھری آندھی نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے گاؤں کی کوئی دیوار آسمان تک بلند ہو گئی ہے اور اپنے پتھروں سمیت چلی آ رہی ہے۔ سرخ رنگ کی اس خوفناک دیوار میں جگہ جگہ سیاہی مائل، زرد رنگی کوئی

---

[38] ہرمل: دواءِ اسپند۔

Scanned with CamScanner

تیز بھی چلتی آ رہی تھی، میرا دل بیٹھ سا گیا۔ بَیل پوری قوت سے بھاگ رہا تھا، ایک تیز شور، جو پہلے سیٹی کی طرح تھا، بلند ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ شائیں شائیں کی تیز اور بلند آواز مجھے اپنے سر کے اوپر سے گزرتی محسوس ہوئی۔ چٹانوں سے پہلے پتھروں کے قریب پہنچتے پہنچتے آندھی کے پہلے شدید تھپیڑے نے مجھے اور ولیے کو ایک دوسرے سے چمٹا دیا۔ مہیب خوفناک خیالی دیوار پوری شدت سے ہماری سمت دوڑتی آ رہی تھی۔ دوسرے شدید تھپیڑے پر ولیا چیخا۔ پیلے رنگ کی پوہلی[39] گاؤں میں کھیلے جانے والے کپڑے کے کھدو[40] کی طرح پوری شدت سے ولیے کے کندھے سے ٹکرائی۔ دتے نے گڈ جنوب مغرب کی سمت چٹانوں کے رُخ پر موڑا۔ کھیتوں کے کناروں پر جو خاردار جھاڑیاں باڑ کی صورت میں لگائی جاتی ہیں، سیاہی مائل چکروں کی طرح گھومتی آ رہی تھیں، خم دار سیاہ کانٹوں والی جھاڑیاں۔۔۔ دتا چیخ رہا تھا، چاچا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا، شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ چیختی چلاتی، غصے سے پھنکارتی، سرخی مائل خیالی مہیب دیوار ہم پر بے رحمی سے گری۔ پھر کچھ نظر نہ آیا، ہر سمت اندھیرا سا چھا گیا۔ شائیں شائیں کا شور اس قدر تیز ہوا کہ مجھے کانوں میں درد سا محسوس ہوا، پھر ٹیس سی اٹھی۔ ولیا نہ جانے کب مجھ سے الگ ہو کر گڈ کے پھٹوں سے چمٹ گیا۔ میں نے گڈ کی گول لکڑی کو مضبوطی سے پکڑا اور سر گھٹنوں میں دبا یا، میرا چہرہ مڑ سا گیا، پلکوں کے بیچ سے میں نے دیکھا کہ دتے کے ہاتھ سے بَیل کی رسی چھوٹ گئی ہے۔ وہ اور چاچا بھی سر گھٹنوں میں دبائے گڈ کے پھٹوں سے چمٹ گئے ہیں۔ شاید بیس قدم آگے چٹان تھی، پناہ گاہ۔ بَیل کبھی دائیں جھکا، کبھی بائیں، پھر پوری شدت سے آگے بڑھا، پھر ترچھا ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے پاؤں اُکھڑ رہے ہیں۔ بَیل رکا، پوری قوت سے سیدھا ہوا، آندھی کے رخ پر وہ سر کو موڑتے ہوئے، پچھلے سموں کو جما کر، اگلے پیروں پر دباؤ ڈالتے ہوئے لمبا سا ہو گیا، اس کی کمر جھک سی گئی، یوں لگتا تھا کہ بَیل چھلانگ لگانے والا ہے، گڈ بار بار اوپر اُٹھ کر گر رہا تھا۔ شاید بَیل کی کمر پر گڈ کا دباؤ تھا، بَیل کانپا اور یوں لگا جیسے ہمت ہار چکا ہو۔ گڈ رُک سا گیا۔ بَیل کا جسم آندھی کے مخالف ترچھا ہو گیا۔ مٹی اور جھاڑیوں کی مار کو گڈ کے پھٹوں نے روکا لیکن پھٹوں کے درمیان سے پوہلی، لکڑیوں کو چیر کر آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پوہلی کی مار سے جسم چھلنی ہو رہے تھے۔ نہ جانے کتنی ہی چیخیں اُبھر رہی تھیں، آندھی کا شور سب کو نگل رہا تھا۔ میری گردن سے

---

[39] پوہلی۔ ایک باریک کانٹوں والی بوٹی۔ [40] کھدو۔ گیند۔

Scanned with CamScanner

پوہلی ٹکرائی، یوں لگا جیسے ڈنڈے واگی کا اُسترا پھر گیا ہو۔ میں چیخا لیکن میری چیخ کو آندھی یوں اڑا لے گئی کہ خود مجھے اپنی چیخ کا صرف احساس ہوا، وہ بھی سینے کے اندر۔ میں پھر چیخا، میری چھوٹی سی چیخ کو آندھی کی شائیں شائیں پوہلی کے کانٹے کی طرح لے گئی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ پلکوں پر لگی مٹی سے آنسو کیچڑ سا بن گئے، میں نے کیچڑ بھری آنکھوں سے چٹان کی سمت دیکھا۔ بیل کے جسم پر خاردار، چکراتی، گھومتی جھاڑیاں اس شدت سے برس رہی تھیں کہ اس کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ پھر اچانک گڈ کو جھٹکا لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے گڈ اُلٹ جائے گا۔ بیل نے ایک بار پھر پوری قوت سے گڈ کو کھینچا۔ گڈ قدم قدم آگے بڑھ رہا تھا۔ بیل پھر تڑپتا ہوا، سر جھکایا، جسم کو لمبا کیا، کمر جھکائی اور تین چار قدم گڈ کو کھینچ لے گیا۔ پھر تڑپتا ہوا... کسی کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ مٹی اور پوہلی کی مار میں، آندھی کے انتہائی شور میں، سب گڈ سے چمٹے ہوئے تھے۔ شاید بیل کو بھی کسی کی پروا نہیں تھی، وہ اپنے لیے، اپنی جان کے لیے چٹان کی سمت بڑھ رہا تھا۔ مجھے سارا منظر کیچڑ بھری آنکھوں سے یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی گھنی جھاڑی میں سے دیکھ رہا ہوں جو مٹی سے اٹی ہوئی ہے۔ ولیا پٹنے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گڈ کے تختوں پر گھروں بن چکا تھا۔ میرے ہاتھ گول لکڑی پر پھسل رہے تھے۔ اچانک ولیے کے نیچے سے کوئی چیز شاں کرتی ہوئی اڑی اور میرے سر کے پاس سے نکل گئی۔ میرے اور ولیے کے کپڑوں کی گٹھڑی آندھی اڑا لے گئی۔ بیل پھر کانپا، تھرتھرایا، سیدھا ہوا، آگے بڑھا اور پھر جیسے دوڑا، گڈ پتھروں پر اُچھلا، گرا، دائیں بائیں جھولا اور پھر بیل کے قدم جیسے دو پتھروں کے درمیان سے جھٹکے کھاتا، چٹان کی اوٹ میں پہنچ گیا۔

اوٹ میں آتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے وہ طاقت جو بدن کو دھکیل رہی تھی، ختم ہو گئی ہے۔ جس سمت سے آندھی کے طوفانی ریلے جسم کو مار رہے تھے، اس سمت سے جسم بہت ہلکا محسوس ہوا اور بازو پر، کمر پر، رانوں پر، ٹانگوں پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اب صرف شور تھا، شائیں شائیں کا شور، جو چٹان کی اوٹ میں آ کر نمایاں اور خوفناک سا ہو گیا تھا۔

"شی ای ای شواواو..." جیسے سیلابی پانی کا ریلا پتھروں سے ٹکرا رہا ہو۔ گڈ کے اوٹ میں آ جانے کے بعد بھی نہ جانے ہم کب تک دبکے رہے۔ میں آنسوؤں اور مٹی سے کیچڑ بھری آنکھوں سے، کبھی گڈ کے اندر اور کبھی اوپر دیکھتا رہا۔ چٹان کے اوپر گرد یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے گرمیوں کی

شادیوں میں شامیانہ تان دیا جاتا ہے۔ گرد کی چھت سی بن گئی تھی چٹان پر، بلند، وسیع، دور تک پھیلی ہوئی مٹیالی چھت۔

''ہال اوئے... '' وتے نے سر اٹھایا، چیخا، اس نے اپنے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر یوں تیزی سے اٹھایا جیسے بچھو نے ڈنک مارا ہو، پوہلی کے کانٹے اس کی انگلیوں میں چبھے۔ ''ہال اوئے، میں تیڈی... '' اس نے گالی دی۔ ''ہنارے!'' وتے نے آندھی کو یوں گالی دی جیسے وہ کوئی جاندار شے ہو، کوئی درندہ ہو۔ آندھی بھی جواب میں یوں پھنکار رہی تھی جیسے ناگن پھنکارتی ہے۔ آندھی کی کتنی ہی آوازیں تھیں... شی ای ای... شواواو... شاں آں آں... وقفے وقفے سے آندھی کا شور بلند ہو کر جیسے گرتا تھا، پھر بلند ہوتا تھا۔ چاچے نے سر اٹھایا اور کمر کی سمت ہاتھ لے گیا۔ مجھے اچانک گردن کے پچھلے حصے میں درد کا شدید احساس ہوا، جسے میں آندھی کی دہشت میں بھول سا گیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے گردن پر ہاتھ پھیرا، ایک لمبی سی خراش کے ساتھ ساتھ کئی کانٹے گردن میں پھنسے ہوئے تھے۔ ولیا اٹھا اور اس نے سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ چاچے نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''حوصلہ کر!'' چاچے نے اچانک غصے سے کہا۔ ''پوہلی کے کانٹے ہیں، بھڑیں تو نہیں ہیں۔''

چاچے نے پھر اپنی کمر پر ہاتھ پھیرا۔

''پوہلی نہیں!'' ولیے نے روتے ہوئے کہا۔ آندھی کا شور بلند ہوا۔ چاچے نے ولیے سے نگاہیں ہٹا کر اوپر گرد کی چھت کی سمت دیکھا۔ چٹان کے اوپر سیلابی پانی کی طرح مٹی کا ریلا بلند ہو رہا تھا۔ پیلی رنگی پوہلی زناٹوں کے ساتھ اڑتی جا رہی تھی، مٹی کے ریلے میں زرد لکیریں سی نمایاں تھیں۔

''حوصلہ کر پتر!'' چاچے کا لہجہ بدل گیا۔ ''کانٹے نکال آرام آرام سے۔'' چاچا اتنی زور سے بول رہا تھا کہ نرم آواز چیخ سی محسوس ہوئی۔

''کانٹے نہیں... '' ولیے نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

''پھر کیا ہے؟'' چاچے نے پھر غصے سے کہا۔ ''بہت ڈرپوک ہے تو!''

''ڈرپوک نہیں... '' ولیے نے روتے ہوئے کہا۔

''تو پھر ہے کیا؟'' چاچے نے جھنجلا کر کہا۔ آواز پھر چیخ سی بن گئی۔

''میڈے چیڑے... '' (میرے کپڑے...) ولیے نے سسکیاں لیں۔ ''ہناری لے

گئی۔" اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ولیے نے بار بار ناک سے سانس جھٹکے سے اندر کھینچا جیسے ستاراں نے ڈولی چڑھتے ہوئے بار بار کھینچا تھا۔ "نئے تھے میرے کپڑے... ہناری لے گئی۔" ولیے نے کچھ اس لہجے میں کہا کہ چاچا خاموش ہو گیا۔ مجھے اچانک نقصان کا شدید احساس ہوا۔ ولیے کی گٹھری میں میرے کپڑے بھی تھے۔

"ٹھہر..." چاچے نے پھر آندھی میں اُڑتی پوہلی کی پیلی لکیروں کو دیکھا۔ "زور کم ہو لینے دے ہناری کا، ڈھونڈیں گے۔" چاچے کا بلند لیکن نرم لہجہ پھر چیخ سی بن گیا۔ "حوصلہ کر!" چاچے نے پھر آندھیوں میں گولیوں کی طرح جاتی، چیختی چلاتی، پوہلی کو دیکھا۔ "صرف تیرے ہی تو نہیں گئے۔" دتے نے اچانک سر پر ہاتھ پھیرا۔ پٹکا غائب تھا۔ "ہاں اوئے، میں... ہنارے!" دتے نے پھر چنگھاڑتے ہوئے آندھی کو گالی دی۔ چاچے کا پٹکا بھی آندھی لے گئی تھی۔ پراٹھوں اور ساگ والی پوٹلی بھی نہیں تھی۔ چاچے کے کندھے والی چادر نہ جانے کیسے بچ گئی تھی۔ ایک دو لمحوں بعد ولیے کی سسکیاں پھر بلند ہوئیں... اس نے چولے کے بازو سے ناک پونچھا۔

"تو فکر نہ کر..." چاچے کی بلند آواز بھی آندھی کے شور میں دبی دبی سی تھی۔ "ڈھونڈیں گے!"

"بن گئے!" (اب کہاں۔) دتے نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے دردی سے کہا۔ "اُڈتاں گئے ہناری نال... بھل ونج..." (وہ تو گئے آندھی کے ساتھ، بھول جا۔) ولیے کی سسکیاں تیز ہو گئیں، چاچے نے کھا جانے والی نظروں سے دتے کو دیکھا۔

"جھلڑا!" (بے وقوف!) چاچے نے دتے کو چیخ کر ڈانٹا۔ "رُلا تو نہ لڑکے کو..." چاچے نے پھر ولیے کو دیکھا۔ "مل جائیں گے۔ نہ ملے تو میں لے کر دوں گا نئے کپڑے۔" چاچے نے مجھے بھی دیکھا۔ "نئے لے کر دوں گا کپڑے۔"

ولیے نے پہلی بار پوری آنکھیں کھول کر چاچے کو دیکھا۔

چٹان پر کھڑ بڑ سی محسوس ہوئی، پھر ایک بھاری خاردار سیاہ جھاڑی، چٹان سے گدھ کی طرح اُڑی، اوپر اٹھی، گھومی، چکر کھایا اور کچھ دور پتھروں پر گرنے سے وہ دبی، پھر گیند کی طرح اُچھلی، چکر کھایا اور آندھی کے ریلے میں دوبارہ اُڑی اور سامنے گرد کی دیوار میں گم ہو گئی۔

جھاڑی کے اڑنے کی آواز اس ہوائی کی طرح تھی جو شب برات کولڑ کے گاؤں میں اڑایا کرتے تھے۔

''تو نڈی میں... '' دتے نے پھر کہا: ''ہنا رہے!''

آندھی کا زور بڑھتا گیا۔ چٹان کے اوپر گرد کا طوفان چیختا چلاتا اور بلند ہوا۔ ہر سمت اس شدت سے پھیلا کہ اندھیرا گہری شام جیسا ہو گیا۔ ہم گڈے سے اتر کر چٹان سے ٹیک لگائے، سہمے ہوئے خرگوشوں کی طرح بیٹھے آہستہ آہستہ کانٹے نکال رہے تھے۔

''تھک لا کے!'' (تھوک لگا کر۔) دتا چیخا۔ ''تھک لا کے کنڈ و پوہلی... نئیں تے وسن کنڈے...'' (تھوک لگا کر نکالو پوہلی... پکڑے جائیں گے کانٹے۔) دتے کی بات سچ تھی۔ کانٹے میری گردن کے پچھلے حصے میں ٹوٹ ٹوٹ نے لگتے تھے۔ منہ کے لعاب سے وہ میری انگلیوں سے چپک چپک جاتے تھے اور میں انھیں کھینچ کھینچ کر نکال رہا تھا۔ ہر کانٹا ایک ٹیس کے ساتھ نکلتا تھا۔ ولیا ابھی تک آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ اس کے کندھے پر پوہلی کی مار پڑی تھی، چاچے کی کمر پر، دتے کی پشت چھلنی تھی۔ ایک سیاہ سایہ سا گڈ کے پہیے سے چپٹا محسوس ہوا۔ دتا اٹھا، وہ سیاہ خاردار جھاڑی تھی۔ دتے نے جھاڑی کو پہیے سے جدا کرنے کے لیے، نیم تاریکی میں جھاڑی کی ایک قدرے موٹی ٹہنی پکڑ کر کھینچی۔ جھاڑی کھینچ کر پہیے سے نکلی، کچھ خشک ٹہنیاں ٹوٹ گئیں۔

''تینڈی میں... '' دتے نے جھاڑی کو ٹھوکر ماری۔ جھاڑی نے ایک دھیما سا چکر کھایا۔ دتے نے چپل سے جھاڑی کو دھکیلا، پھر ٹھوکر ماری... چٹان کے کونے تک جھاڑی دتے کی ٹھوکروں اور چپل کے زور سے پہنچی اور کونے سے نکلتے ہی آندھی کے زور سے سیدھی اُڑی اور شائیں شائیں کرتی ہوا میں، گرد آلود اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

''تو آں تندورے اِچ پاواں... '' (تجھے تندور میں ڈالوں۔) دتے نے مڑتے ہوئے کہا اور پھر ہمارے پاس بیٹھ کر کانٹے نکالنے لگا۔ کسی کو بیل کا خیال نہیں تھا۔ دھنی کے خوبصورت، کالے چٹے، اونچی کوہان والے بیل کے چکنے جسم پر سیاہ خاردار جھاڑیوں کے نوکدار کانٹے گڑے ہوئے تھے۔ کسی کو بیل کا خیال ہی نہیں تھا... چھوٹے چھوٹے مضبوط سینگوں والے، لمبی سیاہ آنکھوں والے بیل نے جھاڑیوں اور پوہلی کی مار کھا کر ہمیں چٹان کی اوٹ میں پہنچایا تھا۔ میرا جی چاہا کہ بیل کے کانٹے

Scanned with CamScanner

نکالوں، لیکن چاچے کے سامنے ہمت ہی نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں میں ڈر سا گیا تھا۔

''بہت دور تو نہیں گئے ہوں گے،'' ولیے نے میری کلائی پکڑتے ہوئے کان میں کہا۔

''کیا؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کپڑے؟''

''ہاں،'' ولیے نے سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کسی جھاڑی، کسی درخت سے اڑ گئے ہوں گے؟''

''شاید۔'' میں خود مایوس تھا۔

''مل جائیں گے؟'' ولیے نے پوچھا۔

''کیا پتا۔۔۔'' میں نے سامنے گرد کے طوفان کو دیکھا۔ نہ جانے کیوں مجھے بار بار خیال آ رہا تھا کہ کپڑے نہیں ملیں گے۔ مجھ پر مایوسی گہری ہو گئی۔ پھر اپنی مایوسی پر قابو پاتے ہوئے میں نے ولیے کو تسلی دی۔ ''نہ ملے تو۔۔۔'' میں نے ولیے کو دیکھا۔ ''نہ ملے تو چاچا نئے لے دے گا۔''

''ہاں۔'' ولیے نے مختصر سا، امید بھرا جواب دیا۔ اچانک وتا سائے کی طرح اٹھا۔ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا دایاں بازو آگے نکالا، ہاتھ پھیلایا، پھر مٹھی بند کی، ہاتھ کی پہلی انگلی سیدھی کی اور اپنے چہرے کے سامنے اکڑی ہوئی انگلی سے ہوا میں لکیریں سی کھینچنے لگا۔

''کیا ہوا ہے؟'' چاچے نے بیزاری سے پوچھا۔

''ہناری ہنساں۔۔۔'' (آندھی باندھوں گا۔) وتے کا لہجہ جوشیلا تھا۔ ''ماں پتا اے، میں بن کھیساں۔۔۔'' (مجھے معلوم ہے۔ میں باندھ لوں گا۔)

''بیٹھ جا'' چاچے نے غصے سے کہا۔ ''آندھی باندھے گا، بڑا آیا ماندری (شعبدہ باز)۔۔۔ جھلا!''

٭

کتنی ہی ساعتیں گزر گئیں۔ شائیں شائیں کرتی آندھی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ آندھی کی آوازوں میں اب پہلی سی شدت نہیں تھی۔ آوازوں میں تیزی نمودار ہوتی تھی لیکن کم ہوتے ہوتے چیخ سی رہ جاتی

Scanned with CamScanner

تھی۔ سر پر گرد کی چھت سکڑ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے صبح سے پہلے کا منظر ہو جب کبھی کبھی ماں مجھے اٹھا دیا کرتی تھی اور چاٹی سے مکھن نکال کر میرے منہ میں ڈال دیا کرتی تھی۔ میری آنکھیں ادھ کھلی سی ہوا کرتی تھیں اور میں مکھن کو چبائے بغیر نگل جایا کرتا تھا۔ چٹان سے ٹیک لگائے میں نے مکھن کا ذائقہ مٹی سے بھرے ہونٹوں اور ریتلے احساس والی زبان پر محسوس کیا۔ اداسی مجھ پر بوجھ سا بن کر اتری۔ میں کبھی بھی ماں سے اداس نہیں ہوا تھا۔ اس آندھی میں بار بار مجھے ماں کا چہرہ نظر آتا تھا اور پھر میری حالت کچھ یوں ہو گئی جیسے میں رو پڑوں گا۔

شائیں شائیں اب سنسناہٹ میں بدل گئی تھی۔ چٹان کے اوپر گرد کی تہہ کم ہونے پر روشنی یوں نیچے اتری جیسے کسی مٹیالے خیمے کے پیچھے سورج ابھر رہا ہو۔ اب بھی، کبھی کبھی آندھی میں پیلی رنگی پوٹلی بیتی کی طرح اڑتی نظر آتی تھی۔

''تکیا نیں!'' (دیکھا آپ نے!) وٹے نے تیز لہجے میں کہا۔ ''بن گدی کہ نیں...'' (باندھ لی کہ نہیں') چاچے نے وٹے کی سمت دیکھا۔ مسکرایا اور پھر اٹھا۔ ''جھلا! کیا ہمیشہ آندھی ہی چلتی رہے گی؟''

وٹا خاموش ہو گیا۔ وہ بھی اٹھا۔ اس نے بیل کے کندھے پر تھاپڑا مارا، بیٹھ گیا اور بیل کے جسم میں چبھے ہوئے کانٹے نکالنے لگا۔

''ماسڑ...'' (خالو...) ویلے نے کہا، ''میںڈے چیڑے...'' (میرے کپڑے...)

آندھی کی سنسناہٹ اب سرسراہٹ میں بدل چکی تھی۔ سورج کی شعاعیں پھر ہر سمت چمکتی نظر آئیں۔ چٹان کے سامنے اور دائیں ہاتھ کا منظر دیکھ کر مجھے پھر خوف محسوس ہوا۔ درختوں کی ٹہنیوں کو، خاردار جھاڑیوں کو، پوٹلی کو اور پتھروں کی درمیان اگی ہوئی گھاس کو کسی نے اس قدر ٹھوکریں ماری تھیں کہ وہ سب بے حس و حرکت ادھر ادھر یوں بکھری پڑی تھیں جیسے ان پر بیلوں کا کوئی بڑا ریوڑ بھاگا ہو۔ ادھر ادھر ٹوٹی ہوئی ٹہنیاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے ان پر کسی نے کلہاڑی چلائی ہو۔ پوٹلی کی پتلی پتلی تیلیاں سوئیوں کی طرح نظر آ رہی تھیں جو اکثر فضا سے بارش کی طرح اترتی تھیں اور زمیں سے چپٹ جایا کرتی تھیں۔

ویلے اور میرے کپڑوں کی گٹھڑی، چاچے اور وٹے کے پٹکے اور ساگ پراٹھوں والی پوٹلی

ڈھونڈتے ڈھونڈتے سہ پہر ہو گئی۔ آندھی شاید انھیں کوسوں دور اڑا لے گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دلیا پھر رونا شروع کر دے گا لیکن اس نے گڈ کی کنارے والی لکڑی کو پکڑا، بندر کی طرح جھول کر ایک ٹانگ اٹھائی اور گڈ میں کود گیا۔

"ماسٹر،" دلیے نے مضبوط لہجے میں کہا، "نئے کپڑے لے دے گا ناں؟"

"ہاں پتر،" چاچے نے آہستہ سے کہا۔

دتّے نے گڈ موڑا، چٹان سے باہر آتے ہی دھیمے دھیمے ہوا کے جھونکوں میں ارد گرد کا منظر یوں نظر آیا جیسے کھوڑ اور حاصل کے درمیان کا علاقہ نہیں بلکہ کوئی انجانی جگہ ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کھوڑ سے حاصل جانے والی سڑک، کسی دوسرے گاؤں کو جانے والی انجانی سڑک محسوس ہوئی۔ جگہ جگہ سے باڑ ٹوٹ چکی تھی اور کہیں کہیں سرے سے تھی ہی نہیں۔ کچی سڑک پر ٹوٹی ہوئی جھاڑیاں اور پوہلی کی تہہ جمی ہوئی تھی جس پر گڈ لکیریں ڈالتا ہوا چل رہا تھا۔ ہوا میں خنکی سی تھی، ساون تو بہت دور تھا، خنکی کیوں تھی؟ مجھ میں ہمت ہی نہ تھی کہ چاچے سے پوچھتا۔ گڈ اب چٹانوں کے درمیان چل رہا تھا۔ چاچا اور دتا آندھی کی شدت پر مسلسل بول رہے تھے۔ اچانک دتّے کی آواز بلند ہوئی۔

"ہیا تے بے نمیں..." (یہی تو ہے۔) اس نے تیز چمکیلی آنکھوں سے چاچے کو دیکھا۔ "خونی ہناری..." (خونی آندھی۔) اس نے بیل کے رسے کو جھٹکا دیا۔ "کوئی مشوم قتل ہو گیا نیں (کوئی معصوم قتل ہو گیا ہے)... خونی ہناری..."

مجھے دتّے کی پلکوں پر جمی گرد دیکھ کر اچانک احساس ہوا کہ ہم سب مٹی سے اٹے ہوئے ہیں، بالوں میں مٹی، کپڑوں میں مٹی، جسموں پر مٹی کی تہیں سی جم گئی تھیں۔ اچانک مجھے بدن پر خارش سی محسوس ہوئی... وہم کی طرح۔

*

بیل کے گلے کی گھنٹی پھر ٹناٹن بجنے لگی۔ گڈ کے پہیوں سے پھر چوں اوں چوں ای کی آوازیں آنے لگیں۔ چٹانوں کے درمیان سوکھے برساتی نالے میں جھاڑیوں اور پوہلی نے ریت کو چھپا دیا تھا۔

جہاں چٹانیں بلند ہوتی ہوئی ختم ہوتی تھیں، وہاں بھی کھیتوں کے کناروں سے خاردار باڑ اُڑ گئی تھی۔ ہر سمت جھاڑیوں اور پوہلی کے درمیان، کسی کھلیان سے اُڑ کر آنے والا پچھلے سال کا جمع کیا ہوا بھوسا بکھرا پڑا تھا۔ ایک درخت کے نیچے، چھوٹے سے پہلاہی کے جھاڑی نما درخت کے نیچے، کتنی ہی چڑیاں مری پڑی تھیں۔ اِدھر اُدھر سب سے بے نیاز، وہ مری پڑی تھیں۔

''شودیاں... '' (بے چاریاں۔) ودلے نے آہستہ سے کہا۔ ''پتھروں کی طرح ٹکرائی ہوں گی پہلاہی سے، سانس بھی نہیں لے سکی ہوں گی۔'' اس نے حسرت بھری نظروں سے چڑیوں کو دیکھا۔

''شکر کرو... '' چاچے نے مڑ کر ہمیں دیکھا، ''پہاڑیاں نزدیک تھیں۔ ورنہ تم بھی پڑے ہوتے۔''

چاچے کا جملہ سن کر مجھے بدن میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔ چڑیاں کہاں سے اُڑتی ہوئی آئی ہوں گی آندھی میں؟ کیا وہ پوہلی کی طرح آندھی میں آندھی کے زور سے آئی ہوں گی؟ کیا ہر درخت کے نیچے چڑیاں مری پڑی ہوں گی؟ درختوں سے ٹکرانے پر انھیں کتنا درد محسوس ہوا ہوگا؟ وہ کھیتوں میں دبک کیوں نہیں گئیں؟ کئی سوال میرے ذہن میں ابھرے۔ ایک کا جواب بھی میرے ذہن میں نہیں تھا، سو ہی میں نے کسی سے پوچھا۔

''حرام... '' ودلے نے چہرے کو چڑیوں کی سمت گھمایا۔ ''حرام تھی گیاں... '' (حرام ہو گئیں...) اس نے عجیب لالچی سے لہجے میں کہا۔

چاچے کو پھر غصہ آ گیا۔ ''چڑیاں کھاؤ گے؟... بازُ بلے... جھلا!''

ودلے نے پہلی بار ہنستے ہوئے دانت نکالے۔

''میں ہک واری پشور گیاں... '' (میں ایک بار پشاور گیا تھا...) اس نے بیل کا رسا بیل کی پشت پر پھینکا۔ ''اوت ویساں... '' (پھر جاؤں گا...) اس نے دائیں بائیں سر کو جھلایا۔ ''آنے آنے چڑا، آنے آنے چڑا!'' ودلے نے کسی پٹھان کی طرح ہانک لگائی۔ ہم سب ہنسنے لگے۔ آندھی کا جو خوف ابھی تک مجھ پر طاری تھا، کم سا ہو گیا۔

شام سے کچھ پہلے ہم ساحل پہنچے۔ ساحل کی گلیاں بھی جھاڑیوں کی ٹہنیوں، پوہلی اور بھوسے

سے اٹی پڑی تھیں۔ عورتوں نے اپنے صحنوں میں سے جھاڑیوں، پوہلی اور بھوسے کی تہوں کو جھاڑ دوں سے باہر گلیوں میں پھینک دیا تھا۔ ہر گھر کے آگے ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ وٹے کے گڈے سے اُتر کر ہم گلیوں میں جھاڑیوں پر سے پھلانگتے، پوہلی اور بھوسے کو روندتے گھر پہنچے۔

ماسی دوڑ کر دروازے پر آئی۔ وٹے کو چوما، مجھے پیار کیا، چاچے کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے پڑوس میں مریز خان کے گھر سے رونے کی آواز آئی۔ کاراں رو رہی تھی۔ میرا بدن کانپ گیا۔ کھوڑ میں لام پر جانے والوں کے گھروں سے ایسی سسکیاں میں کئی بار سن چکا تھا۔ وٹا بھی سُن سا ہو گیا۔ ماسی نے چارپائیاں بچھائیں۔ وٹے نے چارپائی پر بیٹھتے ہی کچی دیوار کی سمت دیکھا۔

"ہے ہے۔۔۔" وٹے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، "امیر خان۔۔۔"

"امیر خان کو کچھ نہیں ہوا پتر۔۔۔" ماسی نے باورچی خانے کے دروازے کے پاس پڑی چاٹی[41] سے لسی کا پیالہ بھرا۔ چاچے کو دیا۔ "خیر خیریت ہے۔۔۔" چاچے نے پہلی بار پڑوس سے آنے والی سسکیوں پر دھیان دیا۔ "ہوا کیا ہے؟" چاچے نے لسی کا پیالہ ہونٹوں کی سمت لے جاتے ہوئے کہا۔

"پڑوسی ہے نا مریز خان۔۔۔" ماسی نے چاچے کو دیکھا۔ "اس کا بیٹا امیر خان لام پر ہے۔" ماسی نے مڑ کر پھر چاٹی کی سمت قدم بڑھایا۔ "کانی نکاح ہوا ہے اس کا۔" ماسی نے دوسرا پیالہ بھرا۔ مجھے دیا۔ میں نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ماسی کو دیکھتے دیکھتے پیالہ لیا۔ ماسی مڑی۔ "کانی دروازے میں لٹکائی ہوئی تھی۔۔۔" ماسی نے پھر چاٹی کا رخ کیا۔

"آندھی سے ٹوٹ گئی ہے۔"

لسی کا گھونٹ میرے گلے میں پھنس سا گیا۔ ماسی نے پھر پیالہ بھرا۔ وٹے کو دیا۔ پڑوس سے پھر سسکیاں ابھریں۔ ماسی اداس اداس سی تھی۔ "بہت بُری بات ہوئی ہے۔۔۔" ماسی نے کچی دیوار کی سمت دیکھا۔ "ستاراں آندھی آنے پر دروازہ بند کرنے گئی تھی کہ جھکڑ سے، کانی زور سے دروازے سے ٹکرائی۔ آنے کی سری ٹوٹ گئی ہے۔۔۔ وہ چھانک ہو گئی ہے۔۔۔ شگون اچھا نہیں ہے۔" ماسی نے پھر چاچے کی طرف دیکھا۔ "وہ تو۔۔۔" ماسی نے چاچے سے پیالہ لیا۔ "اور لے گا؟"

---

41 چاٹی: چوڑے منہ والا گھڑا۔

''نہیں نہیں... '' چاچے نے مونچھیں کندھے پر پڑی چادر سے پونچھیں۔

''وہ تو... '' ماسی نے پھر کچی دیوار کی سمت دیکھا جس کی اوٹ سے گاراں کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ ''وہ تو... سری پر دھاگے بندھے ہوئے تھے۔ نہیں تو نیچے گرتی... درمیان سے ٹوٹ گئی ہے اور کانی کا ایک بازو بھی... لٹک گیا ہے۔'' ماسی نے ولیے سے پیالہ لیا۔ ''گاراں کو بہت تسلیاں دی ہیں... ستاراں تو جھلی (پگلی) ہوگئی ہے۔ اسی وقت سے بند کمرے میں رو رہی ہے شودی۔''

''کانی ٹوٹ جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔'' چاچے نے کہا۔ ''سمجھا گاراں کو... کانی نیچے نہیں گرنی چاہیے۔''

''سمجھایا ہے۔'' ماسی نے مجھ سے پیالہ لیا جس میں دو گھونٹ لسی ابھی باقی تھی۔ ''بہت سمجھایا ہے۔ ماں ہے نا! چین کیسے آئے... ماں ہے۔'' ماسی نے پیالے چائی کے قریب رکھ دیے۔ ''اوپر سے... '' ماسی پھر ہماری طرف آئی۔ ''اوپر سے امیر خان بھی آنے والا ہے''۔

میں چونکا۔ ولیے نے بھی تیزی سے پہلو بدلا۔

''کب؟'' ولیے نے تیزی سے کہا۔

''اسی مہینے'' ماسی نے جواب دیا۔ پھر چاچے کو دیکھا۔

''ٹکر؟'' (روٹی؟)

''ہاں بہن'' ماسی کے مختصر سوال کا چاچے نے اتنا ہی جواب دیا۔ میرے جسم میں کپکپاہٹ سی تھی۔ کانی نیچے گر جانے پر کیا ہوتا ہے؟ میرے پاس اپنے کسی سوال کا جواب نہیں ہوتا۔ بدن میں کپکپاہٹ بڑھ سی گئی۔ ماسی نے مجھے غور سے دیکھا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔'' ماسی شاید میری گھبراہٹ کو سمجھ گئی۔ پھر اس نے ولیے کو دیکھا۔ ''جاؤ پتر، سوال پر نہا آؤ، بھوتنے بنے ہوئے ہو اور... '' ماسی نے چاچے کو دیکھا۔ ''جا تہا لے۔''

اچانک ولیے کا منہ سوج سا گیا۔

''بے بے!'' ولیے نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا ''میںڈے چیڑے... '' (میرے کپڑے...)

Scanned with CamScanner

✻

ماسی نے مجھے اور ولیے کو ایک پرانا سا لکڑی کا صندوق کھول کر ولیے کے پرانے کپڑے دیے۔ سواں پر جانے سے پہلے میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ امیر خان کے پتلے کو دیکھوں۔ میں نے ولیے کو دیکھا: شاید اس کے دل میں بھی یہی خواہش تھی۔ ہم نے کچی دیوار پر ہاتھ رکھے، اچھلے اور عمریز خان کے گھر میں جھانکا۔ ستاراں والے کمرے کے دروازے میں پتلا لٹک رہا تھا۔ سوتی دھاگے کی ڈوری پر سیاہ نقطے نمایاں تھے۔ مکھیوں نے سفید ڈوری سیاہ کر دی تھی۔ پتلے کے سر پر سرخ لیر کا پٹکا نہیں تھا۔ آٹے کی سری کے بیچ میں لکیری نمایاں تھی۔ نیا آٹا لے کر سری کو جوڑا گیا تھا۔ ٹوٹا ہوا بازو شاید دھاگوں سے باندھا گیا تھا۔ دھاگے چولے میں چھپے ہوئے تھے۔ پتلے کا سبز چولا سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ سفید شلوار مٹیالی سی تھی۔ کندھے پر میلی چادر موجود تھی لیکن سرسوں کے پھولوں جیسی چادر کندھے ہوئے بیسن کی طرح ہو گئی تھی۔ پتلے کے سر پر شاید آٹا سوکھ جانے پر سرخ لیر کا پٹکا باندھا جائے گا۔ سرخ پٹکے کا رنگ بھی عنابی ہو چکا ہو گا۔ ستاراں کے کمرے سے مسلسل سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ تاریک کمرے میں اس کا غم بھی سیاہ تھا۔ وہم کی شدت نے صدمے کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ اُن دنوں کی طرح جو ایک دوسرے پر جھاڑیوں کی ٹہنیوں، پوہلی کی میلی چھتوں اور بھوسے کے تنکوں کی طرح تہہ در تہہ جمتے رہتے ہیں، کئی گنا ہو جاتے ہیں، ہمیں گاراں نظر آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں، چہرے پر غم کی شدت تھی، فکر کی اُبھری ہوئی لکیریں تھیں، ذہنی کھچاؤ سے ماتھے پر شکنیں گہری تھیں۔ عمریز خان گھر پر نہیں تھا۔ ہم دیوار سے پیچھے کی سمت آہستہ سے کودے۔ چچی سواں پر نہانے جا چکا تھا۔

✻

سواں کی طرف جاتے ہوئے ہمیں راستے میں، سواں سے آتے ہوئے، نہا کر آتے ہوئے لڑکوں کی ٹولی نظر آئی۔ اکثر لڑکوں نے چولے کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ ننگے بدن شاید ہوا میں خنکی تلاش کر رہے تھے۔ لڑکوں نے ہمیں دیکھا تو دوڑتے ہوئے آئے۔ ''ہلا آ آ!'' کا مخصوص دیہاتی نعرہ بلند کرتے ہوئے لڑکے

Scanned with CamScanner

کی زبان پر تھا۔ لڑکے ہم سے بڑوں کی طرح گلے ملے، خیر خیریت پوچھی۔ اچانک گلی میں گٹھا بھورا نبو نظر آیا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے بکری کے بچے کی طرح چھلانگ لگائی، دوڑا اور سید حماد ولیے کی جانب گیا اور لپٹ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا اور بڑے انداز سے ہاتھ ملایا۔ نبو سوان پر نہانے جا رہا تھا۔ وہ ہمارا ساتھی بن گیا۔ کانی ٹوٹ جانے کی بات پورے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔

''بہت بُری بات ہوگئی ہے۔'' نبو نے ماسی کی طرح کہا۔ ''اب امیر خان کی خیر نہیں۔'' نبو اپنی بلی جیسی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دے رہا تھا۔

''کیا ہوگا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کانی ٹوٹ گئی ہے۔۔۔'' نبو نے اپنی آواز میں خوف سا پیدا کیا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔ ''کہتے ہیں کہ کانی ٹوٹ جائے تو۔۔۔'' نبو کا لہجہ سچ مچ خوفناک سا ہو گیا۔ ''کانی ٹوٹ جائے تو جس کا نکاح ہوتا ہے، جس کی کانی ہوتی ہے۔۔۔ وہ مر جاتا ہے۔''

''کانی نیچے تو نہیں گری۔'' ولیے نے کہا۔

''ہاں یہ بات تو ہے۔۔۔'' نبو نے اپنا بھورا سر اِدھر اُدھر جھلایا۔ ''امیر خان کے بازو کی خیر نہیں، سر تو ضرور بچے گا۔'' نبو نے فیصلہ سا دیتے ہوئے کہا۔

یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ میرے ذہن میں الجھن سی تھی، جو گرو بنتی جا رہی تھی، میری سوچ پر جمتی جا رہی تھی۔ نبو نے ولیے کا بازو پکڑا۔

''وہ جو ہے نا۔۔۔'' نبو کا لہجہ دھیما سا ہو گیا۔ ''وہ۔۔۔ جو۔۔۔'' نبو نے اِدھر اُدھر دیکھا، جیسے اسے خوف ہو کہ کوئی اس کی بات سن رہا ہے۔ ''وہ جو ہے نا۔۔۔''

''کون؟'' ولیے نے پوچھا۔

''شیشو خان۔۔۔'' نبو کی آنکھوں میں وحشت سی تھی۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے گلی میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا کہہ رہا تھا۔۔۔'' نبو کی آواز سرگوشی سی بن گئی۔ ''کہہ رہا تھا کہ اگر امیر خان نہ آیا تو وہ ستاراں کو رنڈی نہیں رہنے دے گا۔''

❋

ہم سواں کے اُتھلے پانی میں خوب نہائے۔ سواں کے اس پار پہاڑیوں پر ڈوبتے سورج کی کرنوں نے زردی مائل سرخی بکھیر دی تھی۔ سواں کا پانی بھی سنہری سا تھا۔ ہم دیر تک مچھلیاں بنے تیرتے رہے۔ تیرتے ہوئے ہمارے پیٹ اکثر آندھی میں اڑ کر سواں میں گرنے والی جھاڑیوں کی ٹہنیوں سے ٹکراتے تھے، جو شاید کوسوں دور سواں میں گری ہوں گی اور ڈوبتی ابھرتی مسلسل بہے جا رہی تھیں۔ آندھی کہاں سے آئی ہوگی؟ میں دیر تک سوچتا رہا۔

اگلے دن چاچے نے مجھے اور ولیے کو ایک ایک جوڑے کا کپڑا لا کر دیا۔ ولیے کا کھدر اونٹ رنگا تھا، میرا سفید۔ ماسی نہ نہ کرتی رہی۔ ماسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی تھی۔ چاچا اُسی دن دئیے ماچھی کے گدھے پر بیٹھ کر کھوڑ چلا گیا۔ گاؤں میں کانی ٹوٹ جانے کی خبریں بھوسے کے تنکوں کی طرح اڑ رہی تھیں۔ شیشو خان نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی گاؤں کے ہر گھر میں پہنچ چکا تھا۔ نہ جانے کیسے۔

سہ پہر کے وقت جب دھوپ کی تمازت لُو میں بدل جاتی ہے اور گاؤں کی مٹی کے لیپ والی دیواریں سرخ سرخ سی ہو جاتی ہیں۔ میں، ولیا، اور نبو مسجد کے قریب چوڑی کھلی جگہ میں کھڑے سواں کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے تھے کہ مسجد کی طرف سے آتے ہوئے کئی بوڑھے نظر آئے۔ ان میں مریز خان اور گلریز خان بھی تھے۔ دونوں کے چہروں پر پریشانی مٹی کے لیپ جیسی تھی۔ ناہموار، شکنوں کی مانند، دراڑوں کی طرح۔ نبو کا خیال تھا کہ کانی ٹوٹ جانے کا سارے گاؤں کو بہت دکھ ہے، لیکن شیشو خان بہت خوش ہے۔ اسے یقین ہے کہ اب امیر خان لام سے نہیں آئے گا، مارا جائے گا گولی سے، گولی سر میں لگے گی اور بازو بھی ٹوٹے گا، اور ستاراں رنڈی ہو جائے گی، اور وہ ستاراں کو بیاہے گا۔

"شیشو خانے کی ستاراں پر آنکھ ہے۔" گنجے بھورے نبو نے سرگوشی میں کہا۔ نبو کی بات پر مجھے گلریز کا تشویش بھرا وہ چہرہ نظر آیا جب وہ مریز خان کے گھر بیٹھا بار بار کہہ رہا تھا: "مجھے نہیں پتا... مجھے نہیں پتا... بلاؤ امیر خان کو۔"

"اگر امیر خان آ گیا تو...؟" میں نے پوچھا۔

"شیشو خان..." نبو نے بڑے اعتماد سے جواب دیا: "بھول جائے گا ستاراں کو۔"

مسجد کا صحن بوڑھوں سے بھر گیا۔ مولوی ہست خان نے اعلان کیا کہ جمعے کے روز دعا ہوگی۔

Scanned with CamScanner

مریز خان نے کھانوں 42 کی نیاز دینے کا اعلان کیا۔ وہ تھال نیاز کے کھانے۔
''دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے مریز خان،'' مولوی ہست خان نے مسجد سے نکلتے ہوئے کہا۔
گلریز خان بھی اداس اداس سا باہر آ رہا تھا۔ تمام بوڑھے مسجد کے قریب دیوار کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔
''کانی ٹوٹ ضرور گئی ہے،'' عجائب خان نے کہا، ''نیچے تو نہیں گری۔''
سب بوڑھوں کے چہرے مریز اور گلریز کی طرف ہو گئے۔ دونوں کی آنکھیں چمکیں... چہروں پر سکون سا نمودار ہوا۔
''امیر خان ضرور آئے گا،'' فراست خان نے کہا۔
''دعا...'' مولوی ہست خان نے لفظ پر پورا زور دیتے ہوئے کہا، ''دعا میں اثر ہوتا ہے۔''
جمعے کے روز ماسی نے جلدی جلدی ناشتہ تیار کیا، کام ختم کیا اور گاراں کے گھر چلی گئی۔ فضا میں آہستہ آہستہ حدت نمودار ہو رہی تھی۔ میں اور ولیا دیر تک گاؤں کی گلیوں میں پھرتے رہے۔ سورج کی روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ لو کے تھپیڑے اب دوپہر کو ہمیں کمرے میں بند کر دیا کرتے تھے۔ پھر بھی ماسی سو جاتی تو ہم اکثر سواں کے کنارے کنویں کے پاس، پتھریلی چٹانوں کے نیچے ٹھنڈی ریت پر پہنچ جاتے تھے۔
گلیوں میں پھرتے پھرتے چاشت کا وقت ہو گیا۔
ہم گھر آئے۔ صحن میں مٹی لپا فرش تپ رہا تھا۔ گاراں کے گھر شور سا مچا ہوا تھا۔ ہم سیدھے چھت پر گئے۔ گاراں کا صحن بھی تپ رہا تھا۔ غلطی کا احساس ہونے پر ہم پھر نیچے اترے۔ تمام عورتیں برآمدے اور کمروں میں تھیں۔ کچی دیوار پر سے دیکھنے پر ہی برآمدہ نظر آ سکتا تھا۔ کچی دیوار پر ہاتھ رکھتے ہی گرمی کی شدت ہتھیلیوں پر محسوس ہوئی، لیکن دیکھنے کا شوق ہمیں اچھلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ہم اچھلے، اچکے اور دیوار سے لٹک گئے۔ کئی عورتوں نے ہمیں دیکھا۔ برآمدے میں زیادہ تر بوڑھی عورتیں بیٹھی تھیں۔ کسی نے ہمیں اہمیت نہ دی۔ سب باتوں میں مشغول تھیں۔ ستاراں کے کمرے سے لڑکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کمرے کے دروازے میں امیر خان کے پتلے کا آٹے سے بنا سر

42 کھانے: سفید شکر کی مٹھائی۔

اب ننگا نہیں تھا۔ سرخ ریشمی لیر سے پھر پٹکا باندھ دیا گیا تھا۔ سرخ لیر گندی ہو کر عنابی سی ہو گئی تھی۔ سر کے نیچے، کانی خشک ہو کر زردی مائل خیالی سی ہو چکی تھی۔ کندھے کی پیلی چادر پھر غائب تھی۔

''ہا، نی... ہا!'' گاراں نے شاید ماسی سے کہا جو قریب ہی بیٹھی تھی، ''دیکھو شیشو کی بدمعاشی... مجھے غصہ ہے... غصہ ہے۔ لیکن وقت ایسا ہے کہ میں بول نہیں سکتی۔'' گاراں نے برآمدے میں پڑے دو بڑے بڑے کھانوں کے تھالوں میں سے ایک تھال کے کچھ کھانے دوسرے میں ڈالتے ہوئے کہا، ''ورنہ میں کہتی دھی پئی کو... سمجھا لے اپنے پتر کو... بہت بک بک کرنے لگا ہے۔''

''ہا، نی... شرم!'' ایک اور عورت بولی۔ ''شرم نہیں آئی شیشو کو۔''

اچانک سناراں والے کمرے کے دروازے سے نسیم میراثن کا چہرہ باہر آیا۔ پھر بازو باہر نکلا۔ نسیم کے ہاتھ میں جوتی تھی۔

''زیادہ بک بک کرے گا تو...'' نسیم نے جوتی ہلائی۔ ''ہاں ایک نہیں چھوڑوں گی۔''

''تو چپ کر!'' نسیم کی ماں بوڑھی نیکو نے چیخ کر کہا، پھر گاراں کی طرف مڑی۔ ''چھوڑ، نی گاراں...'' نیکو کے منہ میں دانت نہیں تھے۔ وہ بولتی تھی تو دونوں ہونٹ دب جاتے تھے، ٹھوڑی ناک تک چلی جاتی تھی۔ ''چھوڑ... لڑکا ہے... بول پڑا ہے۔''

''لڑکا ہے؟'' سناراں کے کمرے سے کسی لڑکی کی بلند آواز آئی۔ نہ جانے کون تھی۔ ''ایسے ہوتے ہیں لڑکے... کھگر[43]۔''

اچانک ماسی کی نظر ہم پر پڑی۔

''کیا کر رہے ہو دھوپ میں؟'' ماسی ہمیشہ کی طرح غصے سے بولی۔ پھر لہجہ نرم سا ہو گیا۔ ''جاؤ پتر... چھاؤں میں کھیلو۔''

ہم پیچھے صحن میں اترے۔ ولیے نے ہتھیلیوں کی سمت دیکھا۔ سرخ بوٹی ہو گئی تھیں۔ میرے ہاتھوں میں بھی ٹیسیں سی اُبھریں۔ ولیے نے دیوار سے جلی ہتھیلیوں کو چولے سے یوں ملنا شروع کر دیا، جیسے وہ سواں کی ٹھنڈی ریت ہو۔

---

43 کھگر چھوٹا سا، لمبا تیز اور مکار چیتا، جو سواں کے کنارے پہ جھاڑیوں میں ملتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میں اور ولیا ہمیشہ ایک ہی بات سوچتے تھے۔ ایک لفظ کہے بغیر ہم دروازے سے نکلے اور مسجد کا رخ کیا۔ مسجد میں سارا گاؤں جمع تھا۔ مولوی ہست خان وعظ کر رہا تھا۔ نہ مجھے وعظ سے دلچسپی تھی نہ ولیے کو۔ ہم پھر گلیوں میں ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ سواں کی طرف جانے والی گلی میں لڑکے جمع تھے۔ ایک لمبے تڑنگے موٹے لڑکے نذیرو (نذیر خان) اور بھورے گٹھے نبو میں جھڑپ ہو رہی تھی۔

''لگا شرط!'' نذیرو نے کہا۔

''لگا لے!'' بھورا گٹھا نبو اچھل کر بولا۔

''اگر امیر خان نہ آیا تو... '' نذیرو جوش میں تھا ''تو تو مجھے کندھے پر بٹھا کے سواں کے پار لے جائے گا!'' لمبے موٹے نذیرو کی بات سن کر لڑکوں نے شور مچایا اور زمین سے کچھ ہی اونچے نبو کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔

''کوئی اور لگا شرط... '' نبو نے اپنی بلی جیسی آواز میں کہا۔

لڑکوں کا شور بلند ہوا اور موٹے لمبے نذیرو نے مکا بنا کر زور زور سے سواں کی طرف اشارے کیے۔ ''میری یہی شرط ہے... یہی... یہی۔''

''اچھا... اچھا... '' نبو ہار ماننے والا نہ تھا۔ لڑکے خاموش ہو گئے۔ ''اچھا پھر... اگر امیر خان آ گیا تو... '' نبو نے اچھل اچھل کر نذیرو کے منہ کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ''اگر امیر خان آیا تو... '' نبو کی بلی جیسی آواز اور بھی تیز ہو گئی: ''تو تو وریز خان کے گھوڑے کے نیچے سے سات بار نکلے گا۔''

لڑکوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ نذیرو کا منہ اتر گیا۔ ولیے نے ہنستے ہوئے مجھے بتایا کہ نذیرو گھوڑے سے بہت ڈرتا ہے۔ نبو نے حریف کا چہرہ اترا ہوا دیکھا تو خوشی سے ادھر اُدھر اچھلا۔ وہ واقعی چھوٹا سا بھورا بندر لگ رہا تھا۔ لڑکوں کی ہنسی سے شور اور بھی بلند ہو گیا۔

''کوئی اور لگا شرط... '' لمبا موٹا نذیرو بڑی طرح شکست کھا گیا۔

نبو نے اس کی نقل اتاری: ''میری یہی شرط ہے... یہی... یہی... '' اور لڑکوں کے شور سے گلی میں آتا ہوا ایک ڈولی کتا بھونکنے لگا۔

Scanned with CamScanner

ہم سب ہنستے شور مچاتے مسجد کے قریب پہنچے تو مولوی ہست خان دعا کر رہا تھا۔ سب کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے۔ مسجد میں بوڑھے، ادھیڑ عمر کے اور نوجوان دیہاتی سبھی موجود تھے۔

"مولا کریما... "مولوی ہست خان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔" ہم دُکھیوں کی عرض سن مولا کریما... "اچانک ایک سمت سے شیشو خان نمودار ہوا۔ میں نے پہلی بار شیشو خان کو غور سے دیکھا۔ دبلے جسم، لمبے قد، سفید لمبوترے چہرے، لمبی ناک، تنگ ماتھے اور لمبی لمبی آنکھوں میں عقابی چمک والے شیشو خان نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے تیل میں بھیگے ہوئے پٹے کانوں پر پڑے تھے۔ مولوی ہست خان کے ہاتھ کپکپائے۔

"مولا کریما... "مولوی ہست خان کی آواز رندھی ہوئی تھی۔" تیرا رحم بے شمار، تیرا فضل بے شمار، تو بھولوں کو راہ دکھانے والا، تو بد کو نیک بنانے والا... ہم دُکھیوں کی عرض سن مولا کریما۔"

شیشو خان کے اٹھے ہوئے ہاتھ دیکھ کر سب حیران تھے۔ کئی چہروں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہم حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"مولا کریما... "مولوی ہست خان نے کپکپاتے ہوئے کہا۔" امیر خان کو خیر خیریت سے گھر لا۔"

"آمین!" سب یک زبان ہو کر بولے۔ شیشو بھی بولا۔

"مریز خان اور گل ریز خان پر رحم کر مولا کریما۔ گھر آباد رکھ۔"

"آمین!" ہر دعائیہ جملے کے بعد سب آمین کہتے تھے۔ مولوی ہست خان کی آواز پھر بھرا گئی۔ "خوشیاں دے مولا کریما... بلاؤں کو دور کر، اپنے حبیب کے صدقے، پنجتن پاک کے صدقے... مولا کریما۔ جوڑی قائم رکھ... جوڑی سلامت رکھ..."

"آمین!" دیر تک مولوی ہست خان دعا کرتا رہا۔ وہ بار بار کئی جملے دہراتا تھا۔ پھر اس نے لمبی دعا کی جس کا ایک لفظ بھی مجھے سمجھ نہ آیا۔ چہرے پر ہاتھ پھیرے۔ سب نے چہروں پر ہاتھ پھیرے۔ پھر باتوں کا شور بلند ہوا، مولوی ہست خان سیدھا شیشو خان کے پاس آیا۔

Scanned with CamScanner

''آ پتر... '' مولوی ہست خان نے شیشو کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''پتر... معافی مانگ مریز سے۔تو نے دل دُکھایا ہے... معافی مانگ... ''

مریز خان نے مڑ کر شیشو خان کو دیکھا۔وہ قدم آگے آیا۔

''معاف کردے... ''شیشو کی آواز بھاری تھی۔

مریز خان نے آگے بڑھ کر شیشو کے کندھے پر اپنا مضبوط، ہڈیوں بھرا ہاتھ رکھا۔''اس طرح نہیں کرتے پتر... ''مریز کی آواز بھرا سی گئی۔''دھیاں بھیناں عزت ہوتی ہیں پتر... '' مریز کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

تین چار دنوں بعد امیر خان کا خط آ گیا۔

وہ ٹھیک چار دنوں بعد آ رہا تھا۔خط کی خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ماسی نے کچی دیوار سے اُچک کر گاراں کو مبارکباد دی۔اچانک سامنے گلی میں دھا تنک دھا تنک دھا تنک دھینگ بنک دھینگ بنک کی آواز سن کر میں دروازے کی سمت بھاگا۔ ولیا بھی دوڑا۔ میں چھوٹے قد کے، گھنگھریالے بالوں والے، موٹی ناک اور چھوٹی آنکھوں والے مستی میراثی کو جیسے بھول چکا تھا۔

وہ گلی میں کھڑا تھا۔سر ترچھا تھا، بدن بھی ترچھا تھا، ایک پاؤں آگے بڑھا ہوا تھا۔پسینے کے قطرے اس کے کالے ماتھے پر چمک رہے تھے۔دھا تنک دھا تنک دھینگ بنک دھینگ بنک۔مستی مخصوص جوشیلی تال بجا رہا تھا۔گلی میں مسکراتے چہرے ابھرے۔مریز خان اور گلریز خان گلی میں کھڑے تھے۔ان کے چہرے خوشی سے سرخ تھے۔چہرے پسینے کے قطروں سے دمک رہے تھے۔گلی میں مولوی ہست خان نظر آیا۔اس کا چہرہ بھی دمک رہا تھا، ہاتھ دعا کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔ہاتھ اٹھائے، آنکھوں میں چمک لیے وہ چلا آ رہا تھا۔پسینے کے قطرے اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں سے پھسل کر داڑھی میں اتر رہے تھے۔گلی میں بھیڑ سی ہو گئی۔مبارکباد دینے والوں میں شیشو خان بھی تھا۔

پھر ایک جانب سے عورتیں اور لڑکیاں آئیں۔مردوں نے ان کے لیے راستہ چھوڑا اور کچھ دیر بعد مریز خان کے گھر سے مُبارکاں مُبارکھاں کا شور اٹھا، جو نہ جانے کتنی ہی دیر جاری رہا۔مبارکاں مبارکھاں میں ہنسی تھی، قہقہے تھے، شرارتیں تھیں، شوخیاں تھیں...

Scanned with CamScanner

ہاڑ مہینے کی گرمی نے دنوں کو جھلسا دیا تھا۔ سورج کی کرنیں ہر پتھر پر یوں چمکتی تھیں جیسے وہ آئینہ ہو۔ گھر کا صحن، مٹی کا لیپ، لیپ والی دیواریں، دوپہر کو تنور کی طرح تپ جاتی تھیں، سرخ سی ہو جاتی تھیں۔ گلیوں میں تپش تھی، گاؤں جیسے سلگ رہا تھا۔ کھوڑ میں درخت ہیں، حاصل میں درخت بھی نہیں تھے۔ پہاڑیوں کی چٹانیں تپ کر جیسے اپنا گرم سانس گاؤں کی سمت چھوڑتی تھیں جو گلیوں میں دوڑتا تھا، جھلسا دیتا تھا۔ ایک دن گزرا، دوسرا گزرا، تیسرا، اور پھر چوتھی صبح کو ماسی کے نہ جگانے پر بھی میں اور ولیا بیدار ہو گئے۔ گلی میں شور سا تھا۔ ہم دروازے پر گئے۔ مہدی گھوڑا لیے کھڑا تھا۔ گلی میں مریز خان، گلریز خان، مولوی ہست خان اور کتنے ہی بوڑھے کھڑے تھے۔ مریز خان نے ایک تگلے کا ہار چھوٹے سے ڈبے میں ڈال کر مہدی کو دیا اور مہدی کھوڑ کی جانب سرپٹ ہو گیا۔ امیر خان نے راولپنڈی سے کھوڑ پہنچنا تھا۔ مہدی اسے لینے کے لیے روانہ ہوا۔ گاؤں کے بوڑھوں نے پھر مولوی ہست خان کے پیچھے دعا کی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ آسمان کا رنگ صبح کی روشنی میں گہرا نیلا تھا، پہاڑیوں پر چوٹیاں ہلکی سنہری تھیں۔ ماسی کے گھر کے پیچھے، کمرے کی کھڑکی کے پاس، پھلاہی کے چھوٹے سے جھاڑی نما درخت پر جھانجل بول رہی تھی۔

✻

وہ دن شاید حاصل گاؤں کے تمام دنوں سے بھاری تھا۔ ہر شخص بے چین تھا۔ فکر، اندیشہ، انتظار اور تیاریاں۔ فضل خان نائی بڑے اعتماد سے ولیمے کا سامان لینے سواں پار روزہ ال چلا گیا۔ امیر خان کے آنے پر شادی کی تمام رسمیں ادا ہونا تھیں۔ اگلے روز ولیمہ تھا۔ گاؤں میں اس سے پہلے بھی کافی نکاح ہو چکے تھے۔ میرے ہم عمر لڑکوں نے اس سے پہلے کافی نکاح نہیں دیکھا تھا۔ کسی کو رسموں کا علم نہیں تھا۔

سورج کے بلندی پر آنے سے گرمی بڑھ گئی۔ لڑکیوں نے مریز خان کے گھر ڈیرا جما لیا۔ عورتیں بھی آ گئیں۔ ہم بھی دیوار پر لٹک گئے۔ ہمیں کسی نے کچھ نہ کہا۔ برآمدے میں نسیم ڈھولکی لیے بیٹھی تھی۔ لڑکیوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ نسیم کی کسی ہوئی مینڈیوں پر سرخ دوپٹہ جیسے اٹکا ہوا

تھا۔

"مل وے ماہیا، کیہا پتر ڈھولے ناں دل وے ماہیا"

نسیم نے وہی گیت چھیڑا جو کالی نکاح کے وقت گایا تھا۔ لڑکیاں اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

مل وے ماہیا، کیہا جھلاند کھلے ناں دل وے ماہیا

دھینکی دھینکی بجی بجی... دھینکی دھینکی بجی بجی

وے آموں ڈلیاں

مشہ ماہی ناں مقدس وے میں حاضر کھلی آں

مل وے ماہیا... دھینکی دھینکی بجی بجی...

(آم کی ڈلیاں ہیں... میرے ماہی کا چہرہ مقدس ہے، اور میں حاضر کھڑی ہوں)

جموں کالے

دے کیتی میںڈی ڈھولا میںڈے دم نال اے

مل وے ماہیا... دھینکی دھینکی بجی بجی...

(جامن کالے ہیں... میں جو بھی کر چکی ہوں، میرے محبوب، اب تو میری آخری سانس تک وہ میرے ساتھ ہے)

نسیم نے ڈھولکی پر سیدھے ہاتھ سے تین بار تھاپ دی، تال بدلی...

دھینکی دھینکی بجی... تی بجی بجی بجی دھینگ

میں اتھے تے ماہیا لاوے

میںڈا ماہی وطناں تے آوے... ونجن نہ دیساں

مل وے ماہیا... دھینکی دھینکی بجی بجی...

(میں یہاں ہوں اور میرا محبوب لاوہ میں ہے... میرے محبوب کو وطن آنے دو، پھر جانے نہ دوں گی)

دھینکی دھینکی بجی... تی بجی بجی بجی دھینگ

میںڈے بوہے وچ کوئی شے دے

تو ںٔوں سے بتی نی لگ گئی لے وے

ڈھولا... وںجن نہ دیاں... مل وے ماہیا

کیہا پتھر دھولے تاں دل وے ماہیا

ڈھینگی ڈھینگی بجی بجی...

(میری جیب میں کوئی چیز ہے... مجھے تو تیرے بت ہی کا عشق لگ گیا ہے۔ میرے محبوب آن ملو۔ میرے محبوب کا تو دل بھی پتھر کی طرح ہے)

ڈھولکی کی ڈھینگی ڈھینگی میں دوپہر ہوگئی۔ گرمی کی شدت سے گاؤں سلگ اٹھا تھا۔ ماسی نے ہمیں کمرے میں بند کر رکھا تھا۔ باہر جانے نہیں دیتی تھی۔ خود ہمارا حوصلہ بھی نہیں تھا سواں کی سمت جانے کا۔ ہم کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی کھول کر دیکھتے تو آنکھیں چندھیا جاتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب ہی پھلاہی کی ٹہنیوں سے چپٹے بینڈے[44] مسلسل ریں ریں کر رہے تھے۔ ایک ٹہنی پر فاختہ بیٹھی تھی، چونچ پروں میں دبائے۔ خاموش، تا حد نظر پھیلی ہوئی دھوپ میں دھول سی نظر آتی تھی۔ تپش میں گہری اداسی تھی، سوناپن تھا۔

پسینہ پونچھتے پونچھتے میرے چولے کا بازو بھیگ چکا تھا۔ کمرے میں عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پٹھے کا بنا ہوا پنکھا، بڑا سا پنکھا، ماسی یوں جھلاتی تھی کہ ہم تینوں سے ہوا کی لہریں ٹکراتی تھیں۔ پسینے پر ہوا کی ہر لہر سواں کی ٹھنڈی ریت بن جاتی تھی۔ ہم چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ میں اور ولیا ایک چارپائی پر اور ماسی دوسری پر۔ اچانک ماسی نے ہنسنا شروع کر دیا۔

''کیا ہے بے بے؟'' ولیے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''وہ جب...'' ماسی پھر ہنسی۔ ''وہ جب امیر خان...'' ماسی کی ہنسی رکتی ہی نہیں تھی۔ ''وہ جب... امیر خان... آج شام آئے گا تو...'' ماسی نے بمشکل ہنسی پر قابو پایا۔ ''تو کانی کی خیر نہیں۔''

''کیا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''کانی کے ٹوٹے ٹوٹے (ٹکڑے ٹکڑے) ہو جائیں گے پتر۔''

---

44 بینڈے: جھینگر۔

Scanned with CamScanner

ماسی نے کمرے کی چھت پر گول لکڑی کے شہتیروں کو دیکھا جو جگہ جگہ سے دیمک زدہ تھے۔

ماسی پھر زور سے ہنسی۔

''کالی کے ٹوٹے؟'' ویلے نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ہاں پتر!'' ماسی نے کروٹ بدلی اور چہرہ ہماری طرف کر لیا۔ ''جب امیر خان گھر میں داخل ہو گا تو دو وکیل ستاراں کے پاس جائیں گے۔ ستاراں کا جواب ہاں میں لائیں گے۔'' ماسی نے پنکھا جھلایا۔ ''پھر سب لڑکیاں امیر خان کا مذاق اڑائیں گی... کہیں گی کہ امیر خان تو کالی ہے... کالی تجھ سے اچھی ہے... تو کون ہے؟ کہاں سے آ گیا ہے؟... ستاراں تو کالی کی ہے! امیر خان کو غصہ آئے گا... مگر یز خان امیر خان کو مندری پہنائے گا۔ لڑکیاں طعنے دیں گی... مندری والے تو کون ہے؟... جا جا، لے جا مندری... ستاراں تو کالی کی ہے! امیر خان کو بہت غصہ آئے گا پتر... مریز خان آگے بڑھے گا اور کمرے سے کالی کھول کر امیر خان کے آگے پھینکے گا۔'' ماسی بولے جا رہی تھی، بتائے جا رہی تھی، سب کچھ بتائے جا رہی تھی... ''امیر خان کے دوست اسے کلہاڑی دیں گے اور وہ کالی پر مار مار کر...'' ماسی نے پھر ہنسنا شروع کر دیا۔ ''مار مار کے کالی کے بیجے بیجے[45] کر دے گا... کالی نکاح میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے پتر۔'' ماسی نے سب کچھ بتا دیا۔

■

نہ جانے کیوں میرے ذہن کے کسی گوشے سے اٹھتے ہوئے ایک عجیب سے خیال نے مجھے پریشان سا کر دیا۔ مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ جو کچھ میں نے خود دیکھنا تھا، وہ تو ماسی نے بتا دیا ہے۔ کیا خبر... کیا پتا امیر خان ہی نہ آئے، لمبا سفر ہے، اندیشہ سا ابھرا۔ تشویش بینڈے کی ریں ریں کی طرح کھنچتی جا رہی تھی، طویل سی ہوتی جا رہی تھی۔ میں بے چین سا ہو گیا۔ مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ ماسی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ کیوں بتا دیا ہے؟ بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ امیر خان نہیں آئے گا...

---

45 بیجے بیجے: چھوٹے ٹکڑے۔

پھر ماسی کے خرّانے سنائی دیے۔ ولیا بھی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پڑوس سے ڈھولکی کی آواز کبھی کبھی ابھرتی، کبھی لڑکیوں کا شور سنائی دیتا تھا۔ بے چینی سے میری حالت کچھ ایسی ہو گئی تھی جیسے شاید... شاید ستاراں کی ہو گی... ! ستاراں کے کمرے میں شور سا اٹھا۔ لڑکیاں شاید اسے سجا رہی تھیں۔ پسینے میں وہ کیا دلہن بنے گی۔ یہ کیسی شادی ہے، شادیاں تو بہار کے موسم میں یا ساون بھادوں میں ہوتی ہیں۔

میں نے لیٹے لیٹے گھوڑے سے ساحل تک کا سفر گھوڑے پر طے کیا۔ کتنی دیر لگے گی امیر خان کو آتے آتے؟ گھوڑا اتنی گرمی میں مہدی اور امیر خان کو کیسے لائے گا؟ کیا خبر گھوڑے کو گرمی نہ لگتی ہو! ... کیا خبر وہ مہدی اور امیر خان کو لے آئے! امیر خان گھوڑ پہنچ گیا تبھی آ سکے گا۔ کیا پتا وہ گھوڑ ہی نہ پہنچے... امیر خان کے پاس ایک صندوق تو ضرور ہو گا... گھوڑے پر صندوق کیسے آئے گا؟... گرمی میں، دھوپ کی تپش میں، اگر میر خان آ بھی گیا تو وہ تو بہت گندہ ہو گا، پسینے اور مٹی سے وہ تو بھوتنا بنا ہو گا۔ دولہا کیسے بنے گا؟ دولہے تو سجا کرتے ہیں، سہرا باندھتے ہیں... یہ کیسی شادی ہو گی؟... امیر خان کیسا ہو گا؟ شیشو کی طرح لمبے قد کا یا مستی کی طرح چھوٹے قد کا؟

پتا نہیں میں نے کیا کیا سوچا۔ بس ایک خیال تھا، ایک احساس، ایک اندیشہ، میرے ذہن میں بینڈے کی طرح چمٹا ہوا تھا کہ امیر خان نہیں آئے گا... پھر کیا ہو گا؟... کیا ہو گا پھر؟... ستاراں بے چاری کیا کرے گی؟... میرا سر بھاری ہو گیا۔ میں نے پنکھے کا بھاری پنکھا جھلنے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی اکتا کر نیچے پھینک دیا اور چارپائی سے سر لٹکا کر پنکھے ہی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پنکھے میں لگی ہوئی پنکھے کی چھلکے جیسی تیلیاں مجھے پوہلی کی طرح زرد ضیائی محسوس ہوئیں۔ میں اٹھا، آہستہ سے میں نے کھڑکی کھولی۔ بینڈوں کی ریں ریں بلند ہو گئی۔ ہر سمت دھول سی تھی۔ چھلائی پر اب دو فاختائیں بیٹھی تھیں۔ دونوں کی چونچیں پروں میں تھیں۔ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ سورج کی روشنی اب کچھ دھیمی تھی۔ میں نے سر نکال کر کھڑکی سے اوپر آسمان کو دیکھا۔ آسمان پر ہر سمت سرخی مائل ضیائی دھول تھی۔ پتا نہیں میرے کندھے سے لگ کر کھڑکی کا پٹ چوکاٹھ سے ٹکرایا تھا، چھلائی پر بیٹھی ایک فاختہ نے چونچ پروں سے نکالی، مجھے دیکھا اور اڑ گئی۔ دوسری فاختہ نے بھی پروں سے چونچ نکالی، ادھر اُدھر دیکھا اور وہ بھی اڑ گئی۔

Scanned with CamScanner

مجھے اپنے دل میں ٹیس سی محسوس ہوئی... یہ میں نے کیا کیا؟ آسمان پر کہیں بھی افقی خطوط پر گردی کوئی دیوار چلتی نظر نہ آئی۔ میں نے سر کھڑکی سے اندر کھینچا، کھڑکی بند کی اور واپس چارپائی پر لیٹ گیا۔ ایک گہری اداسی مجھ پر اتری۔ میں نے آنکھیں بند کیں، کسی بے حد فضا میں، کسی انجانی سمت دو فاختائیں اڑتی محسوس ہوئیں۔ میں گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ چھت پر گول لکڑی کے شہتیروں پر میری نظریں جم گئیں۔ شہتیروں کا خاکستری رنگ کہیں کہیں سے سیاہ تھا...

❁

سورج ابھی حاصل گاؤں کے باہر پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے اوپر تھا جب ایک بار پھر بوڑھے، ادھیڑ عمر اور نوجوان دیہاتی انہی پتھروں کی چٹانوں پر جمع ہونے شروع ہو گئے جن پر وہ کانیاں لانے کے وقت انتظار میں اکٹھے ہوئے تھے۔

سردیوں کی وہ شام کپکپا دینے والی تھی۔ وہ شام بہت جلد آئی تھی۔ گرمیوں کی یہ شام، تپتے پتھروں اور تنور سے اٹھتی ہوا والی یہ شام، موٹے سر والے کالے چیونٹے کی طرح، سست چیونٹے کی طرح رینگ رہی تھی۔ گرمی دوپہر جیسی تو نہ تھی لیکن پتھروں سے اٹھتی ہوئی ہواڑ[46] سے دل گھبرا رہا تھا۔ سروں پر بڑے بڑے پٹکے باندھے، سورج کی ترچھی کرنوں میں ماتھوں سے پسینہ پونچھتے، سبھی اس رستے کی سمت دیکھ رہے تھے جو کھوڑ کی طرف بل کھاتا، چکر کاٹتا ایک دھیمی سی لکیر بنتا نظر آ رہا تھا... دور، بہت دور، ان پہاڑیوں میں چھپتا ہوا جن کے درمیان برساتی نالہ بہتا ہے۔ میں، ولیا، نیو اور بہت سے لڑکے چٹانوں پر موجود تھے۔ لمبا تڑنگا موٹا نذیرو غائب تھا۔ چٹان پر ایک سست گھاس کے پیلے، سوکھے ٹکڑے پر مستی میراثی چوکڑی مارے بیٹھا تھا۔ اس کا ڈھول سامنے پڑا تھا اور مستی کے گھٹنے ڈھول کے نیچے دبے دبے سے تھے۔ مستی کے چہرے پر عجیب سی تھکن تھی۔ مستی کے قریب ہی ایک سوکھی سی جھاڑی کے نیچے چاٹی پڑی تھی جس پر مٹی کا ٹھل اوندھا پڑا تھا۔ چاٹی میں لسی تھی۔ گاؤں میں گائیں زیادہ نہیں تھیں پر لسی ہر گھر میں موجود رہتی تھی۔ بوڑھے چٹان پر کھڑے تھے۔ نوجوان ایک

[46] ہواڑ: گرم سانس۔

Scanned with CamScanner

طرف ہجوم سا بنائے ہوئے تھے۔ اسی جمگھٹے میں شیشو خان بھی تھا۔ شیشو کے چہرے پر کھچاؤ سا تھا، ایک گمبھیری خاموشی تھی۔ لمبی آنکھیں کھنچی کھنچی سی تھیں۔ لمبی آنکھوں میں عقاب جیسی چمک تھی۔ وہ تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

مرید خان اور گلریز خان بوڑھوں کے درمیان کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی کھچاؤ تھا۔ گلریز بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ وہ سر نیچے جھکا کر پہلی انگلی ماتھے پر پھیرتا تو پسینے کے قطرے نیچے چٹان پر گرتے تھے۔ چٹان پر دو چہرے کہیں نظر نہ آئے — مولوی ہست خان اور فضل خان نائی۔

"بہت گرمی پڑی ہے آج تو۔" عجب خان نے کہا۔

"تبھی تو دیر ہوئی ہے۔" فراست خان نے کھوڑ جانے والے رستے پر نگاہیں جمائیں۔ حضرت خان نے فراست کو دیکھا، مڑا اور چہرہ گلریز کی سمت کیا۔

"چلتے ہی آ رہے ہوں گے۔" اس نے کہا۔ "مہدی نے گھوڑے کو مارنا تو نہیں ہے۔"

"یہی بات ہے۔" گلریز نے ماتھے کا پسینہ پونچھا۔ "چلتے آ رہے ہوں گے، پہنچ جائیں گے۔" اس نے مرید خان کو دیکھا جو باتوں سے بے نیاز، پتھر کی طرح خاموش، دور پہاڑیوں میں گم ہوتی دھیمی سی لکیر کو دیکھ رہا تھا۔

مستی نے ڈھول کو ترچھا کیا۔ ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر ڈھول پر کے چمڑے کے ساتھ بندھی رسیوں پر ٹھک ٹھک مارنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی ڈھول کی کنار پر ٹینگ ٹینگ بجائی۔ ڈھول کو پھر سامنے رکھا، بائیں ہاتھ سے پتلی سیدھی چھڑی اٹھائی۔ وہ چھڑی ڈھول پر مارنے ہی والا تھا کہ عطا چنگھاڑا

"وہ دیکھو۔۔۔"

عطا کی آواز پر جھٹکوں کے ساتھ نگاہیں دھیمی سی لکیر کی طرف مڑیں۔ مستی کا چھڑی والا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ وہ تیزی سے اچھل کر کھڑا ہوا۔ عطا کا بازو سیدھا راستے کی سمت اٹھا ہوا تھا، انگلی اشارہ کر رہی تھی۔ اچانک شور بلند ہوا۔ کئی نوجوان جو ایک سمت کھڑے تھے، دوڑ کر چٹان پر چڑھے۔ عطا کی انگلی کی سیدھ میں دھیمی سی لکیر پر ایک نقطہ سا حرکت کر رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

❁

مستی ڈھول بجانا بھول گیا۔ وہ دور تک جاتے راستے کی مدھم سی لکیر پر حرکت کرتے، ابھرتے نقطے پر آنکھیں جمائے ہوئے تھا۔ اس کی نظروں میں گھبراہٹ سا تھا۔ آوازوں کے شور میں ایک موٹے موٹے شیشوں والی عینک والے بوڑھے نے اپنا کمزور کانپتا ہوا ہاتھ آنکھوں پر رکھا۔

”کس جگہ ہے؟“ بوڑھے کی آواز تھرتھرائی۔

میری نگاہیں نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا، جسامت میں بڑھ رہا تھا۔ راستے کا ایک بڑا چکر کاٹ کر جب وہ نمایاں ہوا تو نوجوان شور مچاتے دوڑے۔ گھوڑے پر دو سوار بیٹھے تھے۔

مستی نے ڈبکی لگائی۔ ڈھول اٹھایا، لٹکایا، سر ترچھا کیا، پاؤں آگے بڑھایا، اس کا بدن بھی ترچھا سا ہو گیا۔ ”دھانگ دھانگ دھانگ دھینگ بک دھینگ بک۔“

چٹان پر بوڑھوں کے تمتماتے چہروں میں سب سے نمایاں عمریز خان کا تھا۔ وہ چٹان سے بڑی شان کے ساتھ اترا۔ اس کے پیچھے مبارک مبارک کہتے بوڑھے بھی اترے۔ ہر شخص بول رہا تھا، سب کی آنکھیں چمک رہی تھیں، چہرے خوشی سے سرخ ہو گئے تھے۔ شیشو خان بھی مسکرا رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں میری نگاہیں بار بار اس کے چہرے کی سمت جاتی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شیشو خان کی مسکراہٹ زبردستی کی ہے۔ اس کے ماتھے پر، ابرو کے قریب، دائیں جانب ایک رگ اُبھری ہوئی تھی۔ گھوڑے نے موڑ کاٹا، رستے کی سیدھ میں آیا۔ مستی میراثی کی دھانگ دھانگ میں عطا جھاڑی کی سمت بھاگا، اور اس نے ایک ہاتھ میں مشعل پکڑا اور دوسرے میں لسی کی چاٹی اٹھالی۔

امیر خان آ گیا تھا!

تھکا ہوا گھوڑا، سر نیچے لٹکائے، آہستہ آہستہ چٹانوں کے قریب پہنچا۔ گھوڑے پر آگے امیر خان بیٹھا تھا۔ سر پر خاکی ترچھی ٹوپی، فوجی وردی، خاکی وردی کے بازوؤں پر غلیل کی طرح سرخ پٹی سی بنی ہوئی تھی۔ دوسری سرخ پٹی، ماتھا آدھا ٹوپی میں چھپا ہوا، پتلے پتلے ابرو لیکن بڑھے ہوئے بالوں والے، رنگ گندمی، آنکھیں نہ چھوٹی نہ بڑی، ان میں چمک تھی، چہرہ نہ گول نہ لمبوترا، تجربے کی

Scanned with CamScanner

ہڈیوں سے تھوڑی تک قوسیں سی بنی ہوئیں، سیدھا کچھ لمبا ناک، چھوٹا دہانہ، ہونٹوں پر پھیلی ہوئی سیاہ مونچھیں... امیر خان نے آتے ہی گھوڑے سے نیچے چھلانگ لگائی۔ درمیانے قد کے امیر خان نے وردی پر بندھی چوڑی سی چمڑے کی پیٹی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور سیدھا مریز خاں کی طرف بڑھا۔ اس کے گلے میں تمغے کا ہار چمک رہا تھا۔ گھوڑے کی باگ ذریز خان نے پکڑی، زین پر ایک خاکی تھیلا اور ایک خاکی کپڑے میں کسی ہوئی پانی کی بوتل بھی لٹک رہی تھی۔ مہدی نے بھی مسکراتے ہوئے گھوڑے سے چھلانگ لگائی۔ امیر خان مریز سے لپٹ گیا۔ مریز خان کا سر اونچا، کھنچا ہوا تھا، آنکھیں غبار آلود تھیں، ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ مریز خان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

امیر خان نے گلریز کی طرف دیکھا۔ ''او چاچا!'' وہ گلریز سے لپٹ گیا۔ ہر سمت شور تھا، مستی کی دھا تک دھا تک تھی۔ بوڑھوں نے امیر خان کو گلے لگایا اور پھر تو جوانوں نے اسے گھیر لیا۔

''او امیر خانا، او امیر خانا اوئے... جان کڈ چھوڑی آ ظالما... او امیر خانا۔''

(او امیر خان، تو نے تو ہماری جان ہی نکال دی ہے ظالم۔)

شور مچا ہوا تھا، ہر بات شور میں شور بن رہی تھی، عطا تو جوانوں کے گھیرے کے باہر لسی کی چاٹی پکڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر بول رہا تھا۔ مستی گھیرا توڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس کی چھڑیاں نوجوانوں سے ٹکرا ٹکرا سی جاتی تھیں۔ وہ ڈھول کو پوری قوت سے بجا رہا تھا۔ دھا تک دھا تک! جوانوں میں مجھے شیشو خان بھی نظر آیا۔ زبردستی کی مسکراہٹ بہت نمایاں تھی۔ دور گاؤں کی چھتوں پر عورتوں، لڑکیوں اور بچیوں کا ہجوم تھا۔

امیر خان اور مہدی نے ٹھل ٹھل لسی کے پیے۔ امیر خان نے مڑ کر گلریز کو دیکھا۔ ''مجھے بتا دیا ہے مہدی نے۔'' امیر خان کی آواز میں مسکراہٹ تھی۔ ''کیوں، میرا اعتبار نہیں تھا چاچا؟... میں نے...'' امیر خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے کوئی گھکھر والی تو نہیں لے آنی تھی۔'' قہقہے شور میں نمایاں تھے۔

''لا تا تا... بچو'' گلریز چہک اٹھا۔ ''تا تا تا... تیری ٹانگیں نہ توڑ دیتا میں۔''

قہقہے بلند ہوئے۔ اچانک تیز، اونچی، بلی جیسی آواز پر سب چونکے۔

''میں... میں...'' گشا بھورا ہوا ایک اونچے سے پتھر پر کھڑا تھا۔ ''میں گھکھر والی کے

پیچھے مُڑ کی کتا لگا دیتا۔'' ہنسی سے جوان آگے کی سمت جھک جھک سے گئے۔

''اوئے تو... '' امیر خان نے نبو کو دیکھا۔ ''بالغ ہے۔''

''ہلا آ آ آ... تو نڈی نذیر ودنی... '' نبو نے پتھر سے چھلانگ لگائی اور گاؤں کی سمت پوری قوت سے دوڑا۔ ہم لڑکے ہنسی سے ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا گئے۔ سورج پہاڑیوں کی اوٹ میں جا چکا تھا، پہاڑیوں کی ڈھلوانیں گہرے سائے سے سلیٹی نما سیاہ ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ابھی ان کی چوٹیاں سنہری نہیں تھیں پھر بھی ہوا میں تپش نہیں تھی۔

مہریز خان نے دُریز خان کو بلایا، کچھ کہا اور دُریز خان نے مڑ کر بلند آواز میں تو جوانوں کو پکارا، ''بس بھئی بس۔ بس... بہت دیر ہو گئی ہے۔ امیر خان نے نہانا ہے، تیار ہونا ہے۔ اُدھر سواں پر فضل خان کپڑے اور سہرا لیے سو کو رہا ہے۔ بس... او مہدی... چلو بھائی سواں پر۔'' دُریز خان کا ہاتھ گاؤں کی سمت اٹھا ہوا تھا۔ ''چلو نہاؤ... اور چلو سب تیار ہو جاؤ... چلو چلو۔''

امیر خان گھوڑے پر سوار ہوا۔ مہدی پیچھے بیٹھا۔ دُریز خان نے گھوڑے کی زین پر لٹکا خاکی تھیلا اتارا۔ شیشو خان آگے بڑھا، اس نے خاکی کپڑے میں کسی ہوئی پانی کی بوتل اتاری۔

''پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہے،'' مہدی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لسی لاؤں؟'' شیشو خان نے بھاری آواز میں کہا۔ امیر خان نے سر گھمایا۔ شیشو خان کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کیا حال ہے شیشو خان؟'' امیر خان نے کہا۔ ''اتنی دیر تو کہاں غائب تھا؟... نہ دعا نہ سلام... ہیں!''

''دعا بھی کی ہے،'' شیشو خان نے خاکی کپڑے میں کسی ہوئی بوتل ہلاتے ہوئے کہا، ''سلام بھی کیا ہے... تو نہ سنے تو تیری مرضی!''

''شیشو'' امیر خان کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔ ''آتے ہی گلے شکوے شروع کر دیے تو نے... یار، مجھے سرت تو آ لینے دے۔''

مہدی نے شاید امیر خان کو شیشو کی بات نہیں بتائی تھی۔ اس نے دونوں کھیڑیاں[47] گھوڑے

---

47 کھیڑیاں: چپلیں۔

کے پیٹ میں ماریں، گھوڑا اچھلا۔ امیر نے باگ سنبھالی، گھوڑے کا رخ گاؤں کے باہر چٹانوں کی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ گاؤں کا چکر کاٹ کر پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ سواں پر جائیں گے۔ شام کا احساس دھول سے بھرے آسمان کے کچھ کچھ صاف ہونے پر اور ہوا کے جھونکوں میں تہ ہونے کے برابر ٹھنڈک سے ہوا۔ فضا کی تپش مٹ رہی تھی۔ بوڑھے، ادھیڑ عمر کے، نوجوان، سب تیز تیز قدموں سے گاؤں کی سمت جا رہے تھے۔ چتری کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے بیچ سوکھی بھرل پر زرد زرد دانے ابھرے ابھرے سے لگتے تھے۔ گاؤں کی طرف جاتی ہوئی کچی سڑک دور گاؤں کی پہلی گلی میں بدل جاتی تھی۔ گلی کے اندر سایہ گہرا تھا، یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی کھلی، روشن جگہ سے کسی تنگ تاریک مقام کی طرف جا رہا ہوں۔ میں نے گھبرا کر گلی سے نظریں ہٹائیں، مکانوں کی چھتیں روشن تھیں۔ ان روشن چھتوں کے نیچے گلی مجھے طویل گہرا سوراخ سا محسوس ہوئی، سیاہ سوراخ، جس میں جاتے ہوئے شاید میری کیفیت بھی اس موٹے سر والے چوہے جیسی ہوگی جو سست رفتاری سے چلتے ہوئے سوراخ میں غائب ہو جاتا ہے... میں نے پھر گھبرا کر چھتوں کو دیکھا، پھر میری نگاہیں پہاڑیوں کی طرف گئیں۔

جنگلی چڑیوں کا ایک ڈار پہاڑیوں پر سے گزر رہا تھا۔

*

ماسی نئے کپڑے پہنے ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی اسے غصہ آ گیا۔ ماسی نے ہمیں ڈانٹا کہ ہم نے اتنی دیر کیوں کی ہے۔ صحن میں پڑی چارپائی پر میرا سفید اور دولہے کا اونٹ رنگا کھدر کا نیا جوڑا پڑا تھا۔ ہم نے ابھی منہ دھونے تھے، کپڑے بدلنے تھے اور ماسی گاراں کے گھر جانا چاہتی تھی جہاں لڑکیوں کے شور میں ڈھولکی کی آواز دبی دبی سی تھی۔

"آنڈرے رکھے نیں۔" (انڈے رکھے ہیں۔) ایک عورت کی آواز آئی۔ میں نے دولہے کو اور دولہے نے مجھے دیکھا۔

برات میں انڈوں کا کیا کام؟ ہم دونوں دوڑ کر کچی دیوار سے لگ گئے۔ گاراں نے گلابی

جوڑا پہنا ہوا تھا اور وہ ایک پوٹلی اٹھا کر ایک اور عورت کے ساتھ، جس کے ہاتھ میں مٹی کی ڈولی سی تھی، کہیں جا رہی تھی۔ ماسی کی غصے بھری آواز سے ہم پیچھے کودے۔ ولیے نے غصے کی پروا نہ کرتے ہوئے ماسی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"انڈے کس لیے بے بے؟" ولیے نے پوچھا۔ ماسی کا ہمیشہ کی طرح فوراً غصہ اترا، لہجہ نرم ہو گیا۔

"سواں پرے کر جائے گی گاراں۔" ماسی نے ولیے کو بازو سے پکڑ کر پانی کے ڈول کی سمت کھینچا۔ "انڈے پراٹھے ہیں پتر، مہدی اور امیر خان کے لیے۔ بھوکے ہیں شودے..." ماسی نے ڈول سے پانی ہتھیلی پر نکالا اور ولیے کے منہ پر پھیرا۔ "امیر خان کا کانی نکاح ہوا ہے۔" ماسی نے مجھے بازو سے پکڑا۔ "دولھا بن کر آئے گا۔"

ہم کپڑے پہن رہے تھے جب ڈھولکی کی آواز نمایاں ہو گئی۔ لڑکیوں نے تسیم کے پیچھے گیت شروع کیا۔

ڈھینگی ڈھینگی بجی بجی... تی... ڈھینگ بجی بجی
میندے ماہی تیں کیہے سوہنے وال
اساں کیہوے مر گئے آں تیندے لمے وچھوڑے نال
(میرے محبوب کے بال کتنے خوبصورت ہیں... ہم کون سے تیری لمبی جدائی سے مر گئے ہیں)

کدی پگ بنھائیں کدی پٹکا
وے دنیا چار دیہاڑے لٹکا، وے اکھیاں لگیاں کانی نال
میندے ماہی تیں کیہے سوہنے وال...
(کبھی تو پگڑی باندھتا ہے کبھی پٹکا، یہ دنیا تو چار دن کا میلہ ہے... میری تو آنکھیں سرکنڈے سے لگ گئی ہیں... محبت ہو گئی ہے۔)

شابا سوائیں نیاں دنیا
وے چیڑے دھو کے نیل نہ سنیا، وے اکھیاں لگیاں کانی نال

Scanned with CamScanner

مینڈے ماہی میں... دھینگی دھینگی تکی تکی... تی... دھینگ بجی ان کی

(شاباش سواں کے پتر۔ تجھ پر کپڑے دھونے سے اتنے اُجلے ہو گئے ہیں کہ نیل بھی نہ چھینکنا پڑا... میری تو آنکھیں سرکنڈے سے لگ گئی ہیں۔)

ہم کپڑے پہنتے ہی گھڑیاں گھسیٹتے سوں کی طرف بھاگے۔

ﷺ

سامنے گلی میں گاراں اور ایک عورت لسی کی ڈولی اور پوٹلی اٹھائے چلی آ رہی تھیں۔ گاراں کی رفتار میں عجیب سا فخر تھا، تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی۔ کچھ دور گلی سوں کی طرف مڑتی ہے۔ موڑ کے قریب ایک تالا لگے بند دروازے کے باہر کھڑا نبو شور مچا رہا تھا۔

''نکل باہر... '' نبو نے بازو ہوا میں گھمایا۔ ''نکل باہر... سات بار... سات بار ڈریز خان کے گھوڑے کے نیچے سے... '' نبو چیخ رہا تھا۔ ''نکل باہر... تو نذیر ونی... ''

ولیے نے نبو کا کندھا پکڑا۔

''پاگل ہو گئے ہو؟'' ولیے نے تیز لہجے میں کہا۔ ''دروازے پر تو تالا ہے۔''

''اندر ہے!'' نبو جوش سے اچھلا۔ ''اندر چھپ ہوا ہے۔'' گلی کا موڑ کاٹ کر فراست خان اور عجائب خان سامنے آ گئے۔ نبو کا شور دور دور تک جا رہا تھا۔

''او!'' عجائب خان کھڑا ہو گیا۔ ''او... نبو!'' عجائب خان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ''کے بھنڈی پائی ہوئی آ؟'' (کیا شور مچا رکھا ہے؟)

''کچھ نہیں... '' نبو ایک دم سے ٹھنڈا ہو گیا۔ ''آپ جائیں۔'' عجائب خان اور فراست خان ہنستے ہوئے سواں کی طرف چل دیے جہاں سے مستی کے ڈھول کی مدھم مدھم دھینگ دھا تک سنائی دے رہی تھی۔

باہر نکل نذیرو... باہر!'' نبو نے پھر شور مچایا۔ فراست خان نے مڑ کر ہمیں دیکھا۔

''حرامی... بانڈ...''

٭

ذریز خان کا گھوڑا قدم مارتا گلی سے سواں کی جانب نشیبی پتھریلی پگڈنڈی پر اترا۔ ذریز خان نے اسے کنویں کے قریب گھما کر کھڑا کیا۔ کنویں پر سارا گاؤں موجود تھا۔ بارات تیار تھی۔

امیر خان نے وردی اُتار دی تھی۔ اس نے سبز چولے کے ساتھ سفید شلوار پہنی ہوئی تھی اور سرخ پٹکا باندھ رکھا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ شام کی رنگین کرنوں میں سرخ تھا۔ آنکھیں گہری گہری سی تھیں جن میں چمک تھی۔ امیر خان کے لباس نے اسے پٹلے ہی کے رنگوں میں رنگ دیا تھا۔ سواں کے اُتھلے بہتے پانی کی ہر شکن سیاہی مائل سنہری سی ہو چکی تھی۔ دریا کی روانی کے ساتھ ساتھ چلنے والی ہوا کے ہر جھونکے میں خنکی سی تھی۔ دن بھر کی شدید گرمی کو ہوا کے جھونکوں نے جیسے مار بھگایا تھا۔ مریز خان نے امیر خان کے سر پر، سرخ رنگے پٹکے پر، سنہری تلّے کا سہرا باندھا۔ مبارک مبارک کا شور مچا۔ امیر خان نے گھوڑے کی زین دونوں ہاتھوں سے پکڑی، رکاب پر دائیں پاؤں کی چھوٹی سی ضرب لگا کر اسے گھمایا اور پھرتی سے بایاں پاؤں رکاب میں ڈالا، امیر خان کا تلّے والا کھسہ رکاب میں جیسے پھنس سا گیا، وہ اچھلا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ مریز خان نے گھوڑے کی باگ پھر یوں پکڑی جیسے گھوڑے کے نتھنے پکڑ رہا ہو۔ مریز خان نے پھر شملہ باندھا ہوا تھا۔ دوتالی اس کے کندھے پر تھی۔

گھوڑا مستی کی دھا تک دھا تک میں پتھریلی پگڈنڈی پر قدم مارتا چڑھا، گلی میں بارات جمی۔ سب سے آگے مستی تھا۔ مستی کے پیچھے ابراہیم، جازو خان اور پہاڑ خان سیدھی لکیری بنا کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے پیچھے مریز خان نے گھوڑے کی باگ پکڑی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں اور پیچھے بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے دیہاتی مسلسل بول رہے تھے۔ مستی کے دائیں بائیں رقص کرنے والے نوجوان تھے۔ ہم لڑکے نوجوانوں میں پھنسے پھنسے سے تھے۔ بارات چلی۔

اس بار بھی مستی نے گیت چھیڑا۔ پہاڑ خان، جازو خان اور ابراہیم اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ مستی کی تال میں دھیمی دھیمی سی کیفیت تھی۔

گنج کنا گھن گنج کنا… گھن

گھیج سنا گھن گھیج سنا

تساں ہاماں وطناں ناں اساں ہاں یار پردیسی

(آپ کو اپنے وطن پر ناز ہے، ہم تو یار پردیسی ہیں۔)

اس بار رقص کا انداز مختلف تھا۔ تین تین نوجوان مستی کے سامنے آتے۔ دائروں میں گھومتے تھے، بازو اوپر اٹھا کر، جسموں کو جھٹکے دے کر، وہ رقص کرتے کرتے سامنے سے ہٹتے تھے اور تین جوان اسی طرح رقص کرتے کرتے مستی کے سامنے آتے تھے۔ مستی اور اس کے تینوں ساتھی اس بار گیت گا رہے تھے۔ دمنی کا مقبول گیت، سواں کا گیت، چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں، کریر اور پھلاہیوں سے ڈھکی ڈھلوانوں، برساتی نالوں، سیاہ کانٹوں والی خاردار جھاڑیوں، دور دور تک پتھریلی چٹانوں میں بکھرے کھیتوں کا گیت۔۔۔! تمام نوجوان ڈھول کی گھیج اور رگھیج پر تالیاں بجا رہے تھے۔

گھیج سنا گھن گھیج سنا۔۔۔ مستی نے رُخ بدلا اور ڈھول گھوم کر گھوڑے کی سمت گیا۔

"دے رنگ سائیاں وکھے لکھو تیرے

اڈیاں روزیاں دور کھلاریاں نی

جن گھر بیٹھے آرام کرنے، اڈیاں نت پردیس تیاریاں نی"

(اے خدا تیرے انداز بھی عجیب ہیں، ہم نے تیرے لاکھوں انداز دیکھے ہیں، تو نے ہمارا رزق دور دور تک بکھیر دیا ہے۔ لوگ گھر میں بیٹھے آرام کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ مسافرت کی ہوا ہمیں تنکوں کی طرح اُڑائے رکھتی ہے۔ ہماری نت پردیس کے لیے تیاریاں رہتی ہیں۔)

مستی کے بول کے ساتھ ہی شیشو خان گھوڑے کے سامنے آیا۔ اس نے دایاں بازو اوپر اٹھایا، انگلی نے آسمان کی سمت اشارہ کیا۔ شیشو خان کا سر سینے پر جھک گیا، بائیں جانب دل کی سمت۔ اس کی لمبی عقابی چمک والی آنکھیں مندی سی گئیں۔ شام کے سائے گلیوں پر عقاب کے پروں کی طرح پھیل سے گئے۔ گلی میں دوڑنے والے ہوا کے مدھم مدھم ٹھنڈے جھونکوں سے شیشو کے تیل چپڑے سیاہ پٹے کانوں پر لہرائے۔

وراگ اکھیاں اج ٹنگ دیجا ورا گن غم چھپا گھنسی

محبت پائی ایں سیں گھن کے کائی بت بنا گھنسی

Scanned with CamScanner

ڈراڈوں پے گیاں رسیاں، بیچ ہوٹی چکن ہسیاں
وراگی تھی گیاں کسیاں، اساں ہاں یار پردیسی

(جدائی آنکھوں میں خشک ہو جاتی ہے اور برہن اپنے غم کو چھپا لیتی ہے۔ ایسے میں محبت پانی سے سرکنڈا لے کر بت کا روپ بنا لیتی ہے۔ دیکھو، پھندے دوری نے ڈالے ہیں۔ اب ساربان چاہے کتنی ہی بار اونٹ کے گلے میں رنگ برنگے سوتی دھاگوں میں لگے، لکڑی کے پیڑھی سی بناتے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو پکڑ کر کھینچیں، اب اونٹ کا رخ نہیں بدلے گا۔ ب تو برساتی نالے بھی اداس سے ہو گئے ہیں۔ ہم تو یار پردیسی ہیں...)

گاؤں پر شام گہری ہو گئی۔ ہوا کے جھونکوں میں ٹھنڈک سرمئی سی ہو کر ہر سمت پھیل گئی تھی۔ کچھ نوجوانوں نے لالٹینیں جلا دیں، گھوڑے کے اردگرد ہجوم میں لالٹینوں کی لویں جگنو بن کر ادھر اُدھر چمک رہی تھیں۔ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے امیر خان کا، سنہرے سہرے کے نیچے سرکا پٹکا سیاہی مائل ہو گیا۔ مستی کے ڈھول کی تال پر تالیاں بج رہی تھیں۔ شیشو خان مسلسل ناچ رہا تھا۔ وہ بے خود سا ہو چکا تھا۔ کئی نوجوان اس کے ساتھ ناچ رہے، وہ مسلسل گھوم رہا تھا، اس کے تیل چپڑے پٹے گھوم رہے تھے۔ اس کا سر دل کی جانب سینے پر ڈھلکا ہوا تھا۔ قدم تال پر ادھر اُدھر اٹھ رہے تھے، گر رہے تھے، گھوم رہے تھے۔

کنج کنا گمن کنج کنا...

ایک نوجوان نے دوسرے کو کہنی ماری۔ وہ مسلسل آنکھیں جھپک رہا تھا۔

"جھلا تھی گیا اے..." (پاگل ہو گیا ہے۔)

"تو نے دلاں نی گل نہ ہلا..." (تو نے دلوں کی بات نہ چھیڑ۔) دوسرے نے آہستہ سے کہا۔ بارات ہمارے گھر کے سامنے والی گلی میں پہنچ گئی۔ مریز خان کے گھر کے سامنے لالٹینوں کی روشنی میں پھر لڑکیاں اسی طرح لڈی کھیل رہی تھیں، جس طرح کانی کے سامنے کھیلی تھیں۔ نسیم نے پھر ڈوپٹہ سر پر باندھا ہوا تھا، ڈوپٹے کا ایک پلو اس کے کاندھے سے ترچھا ہو کر ایک سمت لٹک رہا تھا۔ ڈھولکی اس کے گلے میں گھوم رہی تھی۔ وہ چکر کھا کر ٹھہر جاتی تھی۔ وہ گیت گا رہی تھی۔ مستی نے ڈھول کی ٹینگ سے بارات کو روکا۔ شیشو خان نے چکر کھاتے ہوئے سر اوپر اٹھایا۔ اس کے قدم رُکے،

وہ ایک سست دیوار کے پاس ۔ کریوں کھڑا ہو گیا جیسے سہارا لینا چاہتا ہو۔ اس کا بدن دھیمے دھیمے سے جھٹکے کھا رہا تھا۔

نسیم نے ڈھولکی پر تھی تال دی:

تی کی ٹی کی ٹی کی۔۔۔ دھینگی
تی کی ٹی کی ٹی کی۔۔۔ دھینگی

ہن بھاؤں تاں چرنہ لادیں وے۔۔۔ میں ڈاہڈی ورا گن ڈھولا
ہن آویں تاں وقت نہ جاویں وے۔۔۔ میں ڈاہڈی ورا گن ڈھولا

(اب زیادہ دیر نہ کرنا، میں بہت اداس ہو چکی ہوں۔ اب آنا تو پھر نہ جانا، میں بہت اداس ہو چکی ہوں۔)

نسیم کی تال پر ٹی ٹی کی آوازیں نکالتے ہوئے لڑکیاں لڈی کھیل رہی تھیں۔۔ وہ گھول دائرے میں گھوم رہی تھیں، تالیاں بجا رہی تھیں، جھکتی تھیں، اٹھتی تھیں۔۔۔ پاؤں پتھریلی گلی میں، چکروں میں گھسٹ رہے تھے۔

تو نڈی کانی تاں ساوا چولا وے
دل پھڑ پھڑ کے ڈھولا وے۔۔۔
دل پھڑ پھڑ کے ڈھولا وے۔۔۔
ہن آویں تاں گل نال لاویں وے۔۔۔ میں ڈاہڈی ورا گن ڈھولا

(تیرے سرکنڈے کا چولا سبز ہے۔ اس کی پھڑ پھڑاہٹ سے میرا دل پھڑکتا ہے۔ اب آنا تو مجھے گلے لگا لینا۔ میں، میرے محبوب، بہت اداس ہو چکی ہوں۔)

مریز خان کے گھر کی چھت پر عورتوں کا ہجوم تھا۔ کئی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں خوشی سے تالیاں بجا رہی تھیں۔ چھت پر گہری شام کی مدھم روشنی میں وہ چھوٹے چھوٹے سائے سے نظر آتی تھیں۔

تو نڈی کانی تاں رتا پھکا وے
مینڈے سرے چاویں مٹکا وے۔۔۔
ماں کھوئے تے نہ ترہاویں وے۔۔۔

Scanned with CamScanner

کھوے تے نہ ترہاویں وے
میں ڈاہڈی ورا گن ڈھولا

(تیری کانی کا پٹکا سرخ ہے۔ تو میرے سر پہ مٹکا اٹھوا دینا۔ مجھے کنویں پر پیاسا نہ رکھنا، میں، میرے محبوب، بہت اداس ہو چکی ہوں۔)

مریز خان بار بار کندھے سے لٹکی دونالی کو جھٹکے سے ٹھیک کر رہا تھا۔ گھوڑا لڑکیوں کی شی شی سے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش میں جھول رہا تھا، ادھر اُدھر، اس کا پچھلا دھڑ دائیں بائیں جھولتے ہوئے کبھی کبھی نیچے جھک سا جاتا تھا۔ امیر خان زین پر دائیں بائیں جھٹکے کھا کر سنبھلنے کے لیے گھٹنوں کو دبا رہا تھا۔

تو نڈی کانی نی چٹی شتھنی وے
پئی اونی گرایں ورتھنی وے... گلی اونی گرایں ورتھنی وے
آویں وے ڈھولا آویں وے... میں ڈاہڈی ورا گن ڈھولا

(تیرے سرکنڈے کی شلوار سفید ہے۔ گاؤں کی سمت اونٹنی چلی آ رہی ہے۔ آنا، میرے محبوب، تو آ جانا، میں بہت اداس ہو چکی ہوں۔)

لڑکیوں کی سمت سے بارات پر پتھروں کی بوچھاڑ سے پہلے، مستی کی دھاتمک سے پہلے، میں اور ولیا دوڑ کر اپنے گھر کے صحن میں پہنچے اور چھت پر سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے چڑھ گئے۔ مریز خان کی چھت پر موجود عورتیں تیزی سے نیچے صحن میں اترنے کے لیے ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ مسلسل بول رہی تھیں۔ شور مچا ہوا تھا۔ صحن میں بھی عورتوں کے شور میں کوئی بات، کسی کی کوئی بات، صاف سنائی نہ دیتی تھی۔ گاراں کے پاس ہی ماسی کھڑی تھی اور ایک جانب، دیوار کے پاس، ایک گوری چٹی، لمبی، دبلی، لمبی ناک اور لمبی چمکتی آنکھوں والی ایک عورت سیدھی، تختے کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر سختی سی تھی۔

"یہ شیشو کی ماں ہے،" ولیے نے مجھے بتایا۔ باہر گلی میں شور مچا۔ لڑکیاں چھوٹے پتھر بارات پر برسا رہی تھیں۔ پھر مستی کے ڈھول کی زبردست دھاتمک کے ساتھ ہی لڈی کھیلنے والی لڑکیاں، ہنستی، شور مچاتی، صحن میں آ گئیں، دروازے سے وہ پھنس پھنس کر گزریں۔ ڈوپٹے سنبھالتی،

شور مچاتی، وہ ستاراں والے کمرے کی سمت دوڑتے ہوئے گئیں۔

چھت سے گلی کی سمت دیوار کے پیچھے بارات نظروں سے اوجھل تھی۔ دیوار کے اوپر، امیر خان کا سیاہی مائل سرخ پٹکا اور کندھے نمایاں تھے۔ سہرے کا کچھ کچھ تلہ بھی شام کے گہرے، تاریک ہوتے ہوئے سایوں میں نمایاں تھا۔ امیر خان کا سر اور کندھے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے اور پھر دروازے کے قریب رک گئے۔ سر اوپر اٹھا، کندھے گھومے اور امیر خان گھوڑے سے اُتر گیا۔ مستی کی دھا تک دھا تک میں، کھلے دروازے میں مریز خان کا شملہ نمایاں ہوا۔ وہ جھکا، کندھے گھما کر اس نے دونالی کو دروازے سے اندر کی سمت نکالا، مریز خان کا خوشی سے تمتماتا چہرہ دیکھتے ہی صحن سے عورتیں برآمدے کی سمت یوں گئیں جیسے ساون کے پانی کا دھارا ہوں۔ صحن کے ایک کونے میں بہت سی تپائیاں سی پڑی تھیں جن پر لالٹینیں روشن تھیں۔ ایسی ہی لالٹینیں شاید برآمدے میں بھی تھیں جن کی روشنی آدھے صحن تک نمایاں تھی۔ صحن میں چارپائیاں بھی تھیں، ایک جانب، قطار کی طرح، دیوار کے ساتھ ساتھ۔

مریز خان کے ساتھ صحن میں گلریز خان اور مولوی ہست خان بھی داخل ہوئے۔ مولوی ہست خان نے بھی کھاتہ سا اٹھایا ہوا تھا اور اس کی پگڑی میں لگا ہوا قلم بھی نظر آرہا تھا۔ فراست خان، عجائب خان اور کئی بوڑھے صحن میں داخل ہوئے اور سیدھے چارپائیوں کی سمت گئے۔

نوجوانوں کے ساتھ، امیر خان دروازے میں نظر آیا۔ مستی میراثی نے شاید اپنی پوری قوت ڈھول بجانے میں لگا دی تھی۔ اس پر امیر خان کو دیکھتے ہی برآمدے میں عورتوں کا شور مچا، ستاراں کے کمرے سے لڑکیوں کی خوشی سے چیختی ہوئی آوازیں آئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر سمت قہقہوں، ہنسی سے اُڑتے ہوئے جملوں، تیز فقروں، خوشی سے ہوائی کی طرح اٹھتی چیخوں کی آندھی آ گئی ہو۔

نوجوانوں نے دیواروں کے ساتھ ساتھ ٹولیاں سی بنا لیں۔ امیر خان اور برآمدے کے درمیان صحن خالی تھا۔ دروازے میں شیشو خان نظر آیا۔ دو قدم آگے بڑھا، پھر ایک سمت ہٹتے ہوئے دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ دیر کے لیے زبردستی کی مسکراہٹ ابھری، پھر چہرہ، سفید لمبوترا چہرہ، بتی میں جلتی لو کی طرح سرخ سا ہو گیا آنکھیں کھنچ سی گئیں۔ شیشو کے پیچھے مہدی تھا۔ مہدی کے پیچھے کچھ نوجوانوں کے بعد ذریز خان دروازے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ

Scanned with CamScanner

میں چمکتے پھل والی، تیز دھار والی کلھاڑی تھی۔

مجھے ماسی پر غصہ آیا... بہت غصہ آیا۔ سب کچھ تو بتا دیا تھا ماسی نے... امیر خان نے کانی کے بھیجے بھیجے کرنے ہیں۔ ماسی نے سب کچھ پہلے بتا کر میرے تجسس ہی کو ختم کر دیا تھا۔ بہت غصہ آیا مجھے ماسی پر!

دروازے سے ٹھینگ ٹھینگ کرتا مستی داخل ہوا۔ اس نے چار پائیوں کے قریب اپنے لیے جگہ بنائی اور دھیگا دھیگا رانا نا نا، دھیگا دھیگا رانا نا نا کی تال لگا دی۔ ڈھول کی دھمک میں تیز آوازیں چیخیں محسوس ہو رہی تھیں، ہنستی چیخیں! سب سے نمایاں مستی کی بہن نسیم کی آواز تھی۔ گل ریز خان امیر خان کے قریب پہنچا، اس کے ہاتھ میں انگوٹھی والی ڈبیا تھی۔

"کون ہے تو؟" نسیم چیخی۔ "کہاں سے آیا ہے سہرا باندھ کے؟... جا جا... چلا جا یہاں سے..." نسیم کا ہر لفظ قہقہے کی طرح بلند ہو رہا تھا۔ "آ گیا ہے شادی کرنے!... جا ستاراں کنواری تو نہیں ہے... آ گیا ہے سہرا باندھ کے..." لڑکیوں کی ہنسی پھر چیخوں میں بدلی۔ "جا جا!... چلا جا!... ستاراں کا نکاح ہو گیا ہے... جا! کون ہے تو؟... ستاراں تو کانی کی ہے!"

صحن میں سب ہنس رہے تھے۔ بوڑھے، ادھیڑ عمر، نوجوان، سب قہقہے لگا رہے تھے۔ میری نظریں شیشو خان کی سمت گئیں۔ شیشو خان کا چہرہ لالٹینوں کی روشنی میں بہت نمایاں تھا۔ اچانک مجھے اپنے بدن میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔ شیشو خان کی دائیں آنکھ کے قریب رگ پھول کر پھوڑا بن چکی تھی!

میرا ہاتھ ولیے کی سمت بڑھا۔ میں ولیے کو شیشو خان کی آنکھ کے پاس ابھری ہوئی، پھولی ہوئی، پھوڑا سی بنی ہوئی رگ دکھانا چاہتا تھا کہ شیشو خان چیتے کی طرح اچھلا، اس نے دُریز خان کے ہاتھ سے کلھاڑی ایک ہی جھٹکے میں چھینی، دستہ دُریز خان کی کنپٹی پر پوری قوت سے مارا۔ دُریز خان دیوار سے ٹکرایا۔

"سنبھر او جانی آں... کانی ترٹ گئی آ!" (سنبھال اپنی جان کو... کانی ٹوٹ چکی ہے۔)

اس سے پہلے کہ امیر خان مڑتا، کلھاڑی بلند ہوئی اور بھیر ناگ کے پھن کی طرح، امیر خان

کے سر کے پچھلے حصے پر پڑی اور سہرا بند ھے سیاہی مائل سرخ پٹکے میں اتر گئی۔ امیر خان کے منہ سے چیخ بلند ہوئی جو باریک سی ہو کر ختم ہو گئی۔ وہ گلریز پر گرا۔ شیشو کلہاڑی چھوڑ کر انتہائی تیزی سے گھوما، اچھلا، اچھلتے ہوئے اس کا ہاتھ کمر پر تھا۔ انتہائی پھرتیلے درندے کی طرح وہ کھلے دروازے میں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں لمبا سا چاقو تھا جو دائیں بائیں تیزی سے کھل رہا تھا۔

''میںڈے مگر کوئی نہ آوے!'' (میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔) منہ کھلے، ماتھے پر خوفناک شکنوں والے شیشو خان کی آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اس کی آنکھیں، لمبی آنکھیں، گول سی ہو کر پوری کھلی تھیں۔ اس نے گلی کی جانب چیتے کی طرح جست لگائی اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ایک لمحے سے بھی کم مدت کے لیے صحن میں، برآمدے میں، ہر سمت سناٹا سا چھا گیا۔ پھر برآمدے سے گاراں کی دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ وہ برآمدے سے صحن میں دوڑی، منہ کے بل گری، دو عورتوں نے دوڑ کر اسے بانہوں میں جکڑ لیا۔ سریز خان چنگھاڑ کر امیر خان کی طرف دوڑا، جھکا، دونالی کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ گلریز خان کی قمیض کے بازوؤں سے خون کے قطرے مٹی کے لیپ والے صحن میں گر رہے تھے۔ ہر سمت شور مچ گیا۔ ہر سمت وحشت تھی، چیخیں تھیں میں کانپ رہا تھا، ولیے نے مجھے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ ولیے کا سارا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ بوڑھے امیر خان کے گرد ادھر ادھر چیختے پھر رہے تھے۔ امیر خان کو چارپائی پر لٹایا گیا۔ عطا نے آگے بڑھ کر کلہاڑی کو سر سے باہر کھینچا۔ سہرے والا پٹکا اتارا گیا۔ ہر شخص جیسے چھوٹے سے صحن میں چیختا ہوا بھاگ رہا تھا۔ برآمدے سے عورتیں باہر آتی تھیں اور پھر الٹے قدموں واپس چلی جاتی تھیں۔ برآمدے میں بھی شور تھا، چیخیں تھیں۔

گٹھے بھورے نیو نے دروازے کے اوپر سے گلی میں چھلانگ لگائی اور جنگلی بلے کی طرح اسی سمت گلی میں غائب ہو گیا جس سمت شیشو خان گیا تھا۔ کسی جوان میں شیشو کا پیچھا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

برآمدے سے ایک لمبی تڑنگی عورت بجلی کی سی تیزی سے صحن میں دوڑی، دروازے سے ٹکرائی، گلی میں جھٹکے سے گئی اور شیشو کی راہِ فرار کے مخالف، دوسری سمت دوڑی۔۔۔ وہ شیشو کی ماں تھی۔

امیر خان کی چارپائی کے قریب سریز خان، گلریز خان اور بوڑھے گھٹنوں کے بل گرے گرے سے نظر آئے۔ عجائب خان پٹکے سے امیر خان کا سر باندھ رہا تھا، بوڑھوں کے ہجوم میں بھی

کبھی، امیر خان کا سر، جسموں کے درمیان کسی لکیر سے نظر آتا تھا...

ذریز خان، کنپٹی پر ہاتھ رکھتے ہوئے، دیوار کے قریب فرش سے اٹھ، سیدھا کھڑا ہوا۔ اس کے گول ماتھے پر شکنیں تھیں، جازو خان نے چیخ چیخ کر ذریز خان سے کچھ کہا۔ ہر سمت شور تھا۔ ذریز خان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھنچی کھنچی سی تھیں، اس نے شاید دانتوں کو پوری قوت سے دبایا، چہرے پر خوفناک سا کھچاؤ نمودار ہوا۔ تیزی سے آگے بڑھا، اس نے دو تین نوجوانوں کو دھکے دے کر ہٹایا، بوڑھوں کو کندھوں کے زور سے دائیں بائیں ہٹایا اور پوری قوت سے دایاں ہاتھ عمریز خان کے کندھے پر مارا۔ ذریز خان نے دونالی کو جھپٹا اور سیدھا دروازے کی سمت دوڑا۔ دروازے میں گنجا بھولا نبو ذریز خان کی ٹانگوں سے ٹکرایا، پیچھے ہٹا۔ وہ اچھل اچھل کر کچھ کہہ رہا تھا، سواں کی سمت اشارہ کر رہا تھا۔ ذریز خان نے نبو کی بات سن کر مخالف سمت ڈبکی سی لگائی۔ بارات کے بیچ گھوڑے پر چڑھا، اس کا سر دیوار سے اوپر اٹھا اور وہ سرپٹ ہو گیا۔

"ہال او میڈا ابجڑا..." گلی میں شیشو کی ماں کی چیخ سنائی دی۔ وہ "میرا بیٹا، میرا بیٹا..." کہتی گھوڑے کے پیچھے بھاگی۔ گنجا بھولا نبو صحن میں چیخ رہا تھا۔

"نکل گیا... نکل گیا..." وہ مہدی کی طرف دوڑا۔ "تیرا گھوڑا کھول کر نکل گیا..."

نبو کی آواز چیخوں کی آندھی میں اڑ گئی۔ میں اور ولیا، دہشت زدہ، کانپتے، سیڑھیوں کی سمت دوڑے، نیچے اترے اور پھر دوڑ کر گلی دیوار سے لگ گئے۔ گاراں کو ابھی تک عورتوں نے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا، اس کا ایک بازو بار بار ہوا میں لہرا رہا تھا۔

مولوی ہست خان امیر خان کی چارپائی کے قریب سے اٹھا۔ اس نے اٹھتے ہوئے سر پر دوہتڑ مارا اور صحن میں کھڑی عورتوں نے چھاتی پیٹنی شروع کر دی۔ "... ہایا... ہایا ہایا... ہال اوئے... ہال نی... ہایا ہایا..."

امیر خان مر گیا۔

ستاراں کے کمرے سے دلدوز چیخیں بلند ہوئیں۔ سرخ ساٹن کے کپڑے پہنے ستاراں برآمدے میں دوڑی۔ اس کا دوپٹہ دروازے میں لگی کانی سے الجھا اور پیچھے کی سمت اتر گیا، سونے کی زنجیر سے لگا چھوٹا سا سونے کا پھول اس کے بالوں میں پھنسا ہوا تھا۔ نسیم اور قیصراں ستاراں کے پیچھے

دوڑیں۔ انھوں نے صحن میں ستاراں کو پکڑا۔ کندھوں سے پکڑ کر انھوں نے ستاراں کو واپس کمرے کی سمت گھسیٹنا شروع کر دیا۔ ستاراں کی ٹانگیں صحن کے مٹی بھرے فرش پر تھیں، کندھے نسیم اور قیصراں کے ہاتھوں میں تھے۔ آسمان کی سمت اٹھا ہوا چہرہ، ستاراں کے بائیں کندھے پر گرا۔ تہ الٹ کر ناک پر پھیل گئی۔ ستاراں کی آنکھیں بند تھیں، ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نسیم اور قیصراں اسے گھسیٹ کر کمرے میں لے گئیں۔ ستاراں کی تلے والی ایک گرگابی صحن میں رہ گئی۔

ہر شخص دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ چیخیں، نوحے، سینہ کوبی، ہر شخص جیسے کانپ رہا تھا، کپکپا رہا تھا۔ مستی میراثی نے ڈھول گلے سے اتارا۔ اس کے سیاہ چہرے پر تشنج سا ابھرا۔ اس نے گھما کر ڈھول دیوار سے مارا، سر پر دو ہتھڑ مارے اور دھاڑیں مارتا صحن کے فرش پر بیٹھ گیا۔

میرے بدن میں سنسناہٹ تھی۔ ہر سمت سنسناہٹ سی تھی۔ کپکپی سی تھی۔ امیر خان قتل ہو چکا تھا۔ قتل کے بعد کی دہشت بھری سنسناہٹ آوازوں میں تھی، چیخوں میں تھی، نوحوں میں تھی۔۔۔ ہوا میں تھی۔ میرا جسم تھر تھر کانپا، دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا دم گھٹ رہا ہو۔ تیز تیز سانسوں میں، دیوار پر میرے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں دیوار کے پیچھے، دیوار کی بنیاد پر، تاریکی سے سیاہ بنیاد پر گرا اور وہیں بیٹھ گیا۔

❁

''زندگی بھر اپنی آنکھوں سے میں نے۔۔۔'' بابا علی کا ہاتھ دھیمی روشنی میں چولے کی اندرونی جیب کی طرف گیا۔ ''اپنی آنکھوں سے میں نے ایک ہی قتل ہوتے دیکھا ہے پتر۔'' بابا علی نے جیب سے زنجیر لگی گول سی گھڑی نکالی۔ قبر میں دیے کی مدھم مدھم روشنی میں اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بابا علی کے چہرے پر بہت گہری، بہت الم ناک کیفیت تھی۔ اس نے گھڑی کو دیے کی لو کے قریب کیا۔ ''اس کے بعد پھر کانی نکاح بھی کبھی نہیں دیکھا میں نے۔'' بابا علی نے گھڑی سے نظریں ہٹائیں، مجھے دیکھا۔ اس کے ابرو کھنچے کھنچے سے تھے، پلکیں بند بند سی تھیں۔ گھڑی کو ہتھیلی پر لیتے ہوئے اس نے جیسے پلکیں کھولیں۔ ''شیشو نے مہدی کا دن بھر کا تھکا گھوڑا کھولا تھا۔ اس نے گاؤں کا چکر کاٹ کر سواں کے

راستے نکل جانے کی کوشش کی۔ ذریز خان نے کنویں والی گلی سے نکل کر گھوڑا سواں کی ریت پر دوڑایا اور شیشو کو راستے میں سامنے سے روک دیا تھا۔۔۔ "بابا علی نے گھڑی جیب میں ڈالی۔" غم اور غصے کی شدت میں ذریز خان نے دوتالی کی دونوں نالیاں شیشو خان پر خالی کر دی تھیں۔۔۔ اُسے۔۔۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ امیر خان زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اس نے شیشو خان کو چھلنی کر دیا! دوتالی بندوق چلنے کی دھیمی دھیمی آوازیں گاؤں میں بھی پہنچی تھیں۔ یقیناً سب نے سنی ہوں گی۔ سب نے ان سنی کر دی تھیں۔ سب خاموش تھے۔ بس ایک لمبی تڑنگی شیشو کی ماں تھی جو رات بھر گلیوں میں سائے کی طرح بھاگتی رہی، واویلا کرتی رہی۔ رات بھر وہ سواں کے کنارے سے خوفزدہ ہو کر واپس آتی رہی اور گاؤں کی گلیوں میں آ کر سینہ کوبی کرتی رہی۔

"ذریز خان واپس گاؤں آ گیا۔ ذریز خان صبح تک خاموش رہا۔ دوتالی خالی تھی۔ رات بھر سواں کی سمت جانے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اگلی صبح سورج کی کرنوں میں سواں کی گز بھر، خون سے سیاہ ریت پر، شیشو خان کی لاش پڑی تھی۔۔۔ "بابا علی نے اٹھنے کی کوشش میں گھٹنے پر ہاتھ رکھا، گھٹنا اٹھایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بابا علی کی ٹانگوں میں سکت نہیں تھی۔ "لوگوں نے ذریز خان کو بہت اُکسایا کہ وہ پہاڑوں میں بھاگ جائے لیکن ذریز خان نہ گیا۔ پنڈی گھیب سے پولیس آئی اور ذریز خان کو لے گئی۔ مقدمہ چلا۔ ذریز خان کو عمر قید ہو گئی۔ بچ گیا پھانسی سے۔۔۔ "بابا علی نے دوسرا گھٹنا اوپر اٹھایا، پہلو بدلا، اٹھنے کی کوشش کی۔

"ستاراں؟" میری آواز میں سنسناہٹ سی تھی۔

"ہاں۔۔۔ "بابا علی پھر بیٹھ گیا۔ "ستاراں تو پاگل ہو گئی تھی پتر۔۔۔ اس نے امیر خان کی کافی کمرے کے دروازے سے نہ اُترنے دی۔ وہ کمرے میں بند ہو گئی۔ ہر روز صبح سورج کی کرنوں سے پہلے اور شام روشنی کے بعد وہ کمرے سے نکلتی تھی۔ ماسی نے بتایا تھا۔۔۔ بہت سمجھایا، سب نے بہت سمجھایا۔۔۔ ستاراں نہ مانی۔ گاراں اور ستاراں کی ماں نور بھری رو رو کر ہلکان ہوتی رہیں۔۔۔ ستاراں نہ مانی۔۔۔ سوکھ کر کانٹی ہو گئی۔۔۔ "بابا علی کی آواز رندھ گئی۔ "اُسی سال سردیوں میں ستاراں کو پوہ ماگھ کا تاپ چڑھا اور وہ۔۔۔ کھانستے کھانستے چلی گئی اپنے امیر خان کے پاس۔"

بابا علی کی آنکھوں میں آنسوؤں نے شیشے جیسی تہہ سی ابھار دی۔ وہ اچانک اٹھا۔ سیدھا کھڑا

ہوا۔ قبر کی دیوار سے گھسنتا سیڑھی تک پہنچا۔ سیڑھی پر چڑھتے ہوئے بابا علی کی سسکی سی اُبھری۔ میں سیڑھی چڑھتے ہوئے قبر سے نکلا۔ شام بہت گہری تھی۔ بابا علی مسجد کی محراب میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ کانوں پر تھے۔ وہ اذان دینا چاہتا تھا لیکن... شاید اس کی آواز حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔

❁

خاموشی سے، اداسی کی ایک گہری اور انجانی سی کیفیت میں، میں مسجد سے نکلا۔ ہر سمت تاریکی سی پھیل رہی تھی۔ جنوب مغربی افق پر، کھوڑ گاؤں کی سمت، وقفے وقفے سے بجلی چمک رہی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی، سنسناہٹ تھی۔ برساتی نالے کی ریت پر سے گزرتے ہوئے مجھے بادلوں کی آواز کسی غصیلے درندے کی غراہٹ محسوس ہوئی۔ ویسی ہی خوفناک غراہٹ...

''یہ سب کیا تھا؟'' میں نے برساتی نالے کے پتھریلے کنارے پر چڑھتے ہوئے سوچا۔ ''میں اسے کیا کہوں؟'' یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ میں نے خود دیکھا ہے۔ ''میں اسے کیا کہوں؟ کیا یہ انسانی رقابت کی کہانی تھی یا سحر بابلی کی کرشمہ سازی؟... میں اسے کیا کہوں؟ کیا یہ ایک بھولی بھالی، سیدھی سادی، دیہاتی لڑکی کی انتہائے وفا تھی، ضد تھی یا امتناع کی، ٹیبو (taboo) کی سنگینی؟... میں اسے کیا کہوں... کیا کہوں؟''

جنوب مغربی افق پر بجلی چمکی بھولی کے گھر کی سمت میرے قدم تیز ہو گئے۔ بادلوں کی آواز پھر دہشت بھری غراہٹ محسوس ہوئی۔ اچانک مجھے اپنے جسم میں سنسنی سی محسوس ہوئی۔ سنسناہٹ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی محسوس ہوئی۔ میں کپکپایا... نہ جانے کیوں! مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کلہاڑی لیے، میرے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

خالد طور

سائیں موسم

مل کسرا ئک آئل کمپنی کی آؤٹ فیلڈ ہے۔ چکوال سے تیرہ میل پرے، تلہ گنگ سے گیارہ میل ادھر، چکوال تلہ گنگ جانے والی تارکول کی چھوٹی سی سڑک دو تہذیبوں کے بیچوں بیچ خاموشی سے گزر جاتی ہے۔ سڑک کے جنوب میں کچے مکانوں والا بلکسر گاؤں، شمال میں خوبصورت بنگلوں، سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی لمبی لمبی کوارٹروں کی لائنوں والی بلکسر کالونی ہے۔ جنوبی بلکسر میں اکثر رات گئے تک دیوں اور لالٹینوں کی مدھم اور اداس روشنی میں لوگ بیٹھے میراثیوں کا تماشا دیکھتے ہیں۔ شمالی بلکسر میں اکثر رات گئے تک کلب میں تیز چیختی ہوئی دھنوں پر رقص ہوتا ہے۔

ہم شمالی بلکسر میں رہتے تھے۔

اگر ایک دائرہ کھینچ دیا جائے تو شمالی بلکسر کے ماسکے پر دو خوبصورت لیکن تنہا بنگلے عجب متانت سے کھڑے نظر آئیں گے۔ نگاہ ان بنگلوں کے مشرق میں دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کے اوپر لاتعداد درختوں میں سے ہوتی ہوئی افق سے پہلے ایک گدلی دھندلی لکیر پر جم جائے گی جہاں سے دھواں اٹھ رہا ہوگا۔ دو میل دور ہی ماڑی گاؤں ہے۔ مغرب میں ایک میل کے فاصلے پر ٹک آئل کا پمپ اسٹیشن ہے جہاں چوبیس گھنٹے گیس جلتی رہتی ہے۔ جنوب میں ایک میل کے فاصلے پر چکول سے تلہ گنگ جانے والی سڑک ہے۔ جنوب مشرق میں کلرکوں اور مزدوروں کے کوارٹر ہیں۔ بلکسر کا سب سے زیادہ آباد حصہ یہی ہے۔ جنوب مغرب میں کمپنی کا دفتر ہے۔ اس کے آگے سڑک کے جنوب میں بلکسر گاؤں ہے۔ شمال مغرب میں خوبصورت بنگلے ہیں۔ شمال میں دور تک جنگلی خودرو بیروں کی جھاڑیوں کا سلسلہ

Scanned with CamScanner

چلا گیا ہے جہاں کمپنی نے فالتو لوہے کا سامان ڈال رکھا ہے۔ اس سامان میں لوہے کے لمبے لمبے پائپ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مقامی لوگ جھاڑیوں کے اس سلسلے کو اس لحاظ سے 'پمپ جھاڑ' کہتے ہیں۔ پمپ جھاڑ کے شمالی کنارے پر موجود نے گاؤں کو 'منڈے' کہتے ہیں۔

ماسکے پردو تنہا بنگلوں میں ایک ہمارا تھا۔

پمپ جھاڑ کے جنوبی کنارے پر، ان بنگلوں سے چند سو گز کے فاصلے پر، پیر قدرت اللہ شاہ کی ڈھوک ہے۔ ڈھوک کے سامنے ایک اونچا چلاہی کا درخت خوفناک انداز سے جھکا ہوا ہے جس کے چاروں طرف مٹی کا گول سا چبوترہ بنا ہوا ہے۔ اس اونچے درخت پر پیر کا جھنڈا بڑی شان سے پھڑ پھڑاتا رہتا ہے۔ مقامی لوگ اس ڈھوک کو 'باوے نی ڈھوک' کہتے ہیں۔ یہاں کے دیہاتی پیر کو ادب سے 'باوا' کہتے ہیں۔

آج سے دس سال پہلے میری عمر دس سال تھی۔ میری ہم عمر نوکرانی نارو اور میں اکثر دوپہر کو پمپ جھاڑ میں جنگلی بیر توڑنے جاتے تھے۔ ہم بے تکلف تھے۔ عموماً کسی جھاڑی میں کسی سرخ سونے بیر پر للچائی ہوئی نظریں جمائے جب میں خاردار ٹہنیوں کو پکڑتا تو نارو چیختی: ''کشتی لڑے گا؟'' میں مڑ کر دیکھتا تو نارو اپنی شلوار گھٹنوں سے اوپر اٹھائے رانوں پر زور زور سے ہاتھ مار رہی ہوتی۔ لڑکی سے کشتی لڑنا آسان کام نہیں۔ میں کبھی نہ لڑ سکا۔ نارو زور و شور سے چیلنج کرتی رہی۔ کسی لڑکے سے لڑتے ہوئے اسے گرا کر مجھے اتنا ہی لطف آتا تھا جتنا کسی بچے کو قینچی سے مکھی کا سر کاٹنے میں آتا ہے۔ اور نارو کوئی مکھی نہ تھی کہ اس کا سر کاٹا جاتا۔ گول سا چہرہ تھا، رنگ گورا تھا، آنکھیں لمبی اور بھوری تھیں۔ ناک غیر معمولی حد تک اونچی اٹھی ہوئی۔ وہ خوبصورت تھی۔ امی اسے بلی کہا کرتی تھیں۔ امی کا خیال تھا کہ وہ بلی کی طرح مکار تھی۔ شاید ہو گی، مجھے کبھی تجربہ نہ ہوا تھا۔ ہم بہت جلد علیحدہ ہو گئے تھے۔ بہر حال، مجھے اچھی لگتی تھی۔ ہم ساری دوپہر جنگلی بیر توڑنے، آنکھ مچولی کھیلنے، لڑنے اور پھر آپ ہی من جانے اور تھک کر لمبی لمبی گھاس پر لیٹ کر باتیں کرنے میں گزارتے تھے۔ جب ہم ساتھ ساتھ لمبی لمبی گھاس پر لیٹ جاتے تو نارو مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی ہم کسی نہ کسی بات پر ضرور الجھ پڑتے اور روٹھ کر منہ بنا کر آگے پیچھے گھر چلے آتے۔ نارو چائے کی پیالیاں میز پر سجانے کے لیے ڈائننگ روم میں چلی جاتی اور میں باہر لان میں تتلیاں

پکڑنے چل دیتا۔

وہ بہار کا موسم تھا۔ لان میں سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی چھوٹی سی روش، خوبصورت کیاریوں سے نکلتی ہوئی بیرونی پھاٹک تک چلی جاتی تھی۔ لان دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ڈیلیا اور پنک کے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ بائیں جانب گلاب اور ست برگا کے پھولوں کے درمیان بے شمار ایسے پیلے پیلے پھول تھے جن کا درمیانی حصہ سیاہ مخملیں روئیں دار اُبھرا ہوتا ہے۔ اس ابھرے ہوئے حصے سے اٹھتی ہوئی خوشبو کچھ یوں محسوس ہوتی تھی جیسے ایک مدت تک ہواؤں کے سمندروں میں مچھلی کی طرح تیرتی رہی ہے اور اس آوارگی نے اسے لطیف اور البیلا بنا دیا ہے۔

ان پھولوں کے ابھرے ہوئے سیاہ گول گول نقطوں سے شہد کی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں دیوانہ وار ٹکراتی تھیں۔ میں بھونروں اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ میں تتلیاں پکڑنا بھی بھول جایا کرتا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سچ مچ کوئی پریوں کی شہزادی اڑتی ہوئی آتی ہے اور اپنے غیر مرئی پروں سے میرے جسم کو چھوتی ہوئی نہ جانے کدھر کو نکل جاتی ہے۔ میرے بدن میں کپکپی سی دوڑ جاتی اور میں اس کے بعد آنے والے خوشبودار جھونکے میں اس اَن دیکھی شہزادی کا منتظر رہتا۔ پھر میرے چاروں طرف روشنی کا باریک پردہ سا تن جاتا۔ اس کے آگے دھندی چھا جاتی۔ اس دائرے میں ایک میں ہوتا، پیلے پیلے پھول ہوتے، شہد کی بھنبھناتی ہوئی مکھیاں اور بھوں بھوں کرتے بھونرے ہوتے، گھاس میں چھپے ہوئے گاتے ہوئے ٹڈے ہوتے اور ایک اَن دیکھی پری اڑتی پھرتی۔ میرا جی چاہتا کہ پھولوں پر لیٹ جاؤں اور زمین کا یہ پھولوں بھرا خوبصورت ٹکڑا ایسی جگہ چلا جائے جہاں اور کوئی نہ آ سکے۔ پھر جب کوئی بھونرا میری آنکھوں کے سامنے ہوا میں تھرکنے لگتا تو مجھے شاید "شکنتلا" کا ایک جملہ یاد آ جاتا: "تیرے چہرے پر بھونرے کو پھول کا دھوکا ہو گیا اور وہ پاگلوں کی طرح تیرے چہرے کے چکر کاٹنے لگا۔" میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوتی کہ کوئی مجھے بھی یہ کہے، لیکن وہاں کوئی نہ ہوتا۔ تارو مجھ سے روٹھی ہوتی۔ میں مڑ کر دیکھتا تو اکثر وہ برآمدے میں کھڑی مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی ہوتی۔ میں غصے میں گھاس کو ٹھوکریں لگا اس کی سمت چل دیتا۔ ٹھوکریں لگنے سے گھاس میں چھپے ہوئے ٹڈے میرے سامنے دور تک اچھلتے چلے جاتے۔

Scanned with CamScanner

2

پھر ایک ایسی دوپہر آئی جب ہم ہپ جھاڑی اونچی اونچی جھاڑیوں میں گھرے ہوئے لمبی لمبی گھاس کے ایک ٹکڑے پر بیٹھے تھے۔ نارو کے سرخ دوپٹے پر ہم چوکڑے مارے آمنے سامنے بیٹھے، جمع کیے ہوئے جنگلی بیر کھا رہے تھے۔ نارو نے ایک خوفناک کہانی کا آغاز کیا۔ جنوں کی باتیں، بھوتوں کے قصے، درندوں سے لڑائیاں، سانپوں کے ناچ، غرض دنیا بھر کی خوفناک باتیں اس کہانی میں تھیں۔ کبھی کبھی میں چونک اٹھتا اور خوفزدہ نگاہوں سے جھاڑیوں کو دیکھتا۔ مجھے اس طرح جھاڑیوں کو دیکھتا پا کر نارو بھی ڈر جاتی۔ کہانی اپنی بلندی پر تھی۔ دفعتاً نارو چھلانگ مار کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کے حلق سے ایک چیخ چنگھاڑ بن کر نکلی۔ اس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ ایک تیز چیختی ہوئی آواز آئی ''کیا کر رہے ہو... ایں؟''

میں آواز کی سمت گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہی پوری طاقت کے ساتھ چلایا اور بھاگتی ہوئی نارو کے پیچھے بھاگا۔ بھاگتے ہوئے میں نے دوپٹے کا ایک کنارہ پکڑ لیا۔ ایک جھاڑی سے الجھ کر دوپٹے کا ایک کونا جھاڑی کے ساتھ ہی لٹکا رہ گیا۔ کپڑا پھٹنے کی آواز سے میرے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔ ہم جھاڑیوں میں آڑے ترچھے بھاگتے ہوئے غیر معمولی ہیبت ناک انداز سے چیخ رہے تھے۔ چرر کی آواز پھر گونجی۔ دوپٹہ ایک جھاڑی سے لٹک گیا۔ ہم چیختے چلاتے آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ پھر کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ گھر کے قریب میرے ہاتھ میں دوپٹے کا بس وہی پلو رہ گیا جسے میں نے تھاما تھا۔

وہ کیا شے تھی؟ کیا وہ آدمی تھا؟ نہیں، بس وہ ایک شے تھی۔ ایک ڈراؤنی شے۔ کالا رنگ تھا، ایک آنکھ، سر گنجا، بڑے بڑے میلے دانت اور لٹکا ہوا نچلا ہونٹ، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ، خمیدہ ٹانگیں۔ کوئی کبڑی شے...

''وہ کیا تھا؟'' نارو نے مجھ سے پوچھا۔ وہ تھرتھرا رہی تھی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔

''وہ کیا تھا؟'' میں نے نارو سے پوچھا اور ہم ایک بار پھر پہلے کی طرح خوفناک انداز سے چیختے چلاتے لان میں دوڑے۔ خالی برآمدے میں یکلخت بیبیں امی نظر آئیں۔ ہم دونوں ان سے لپٹ گئے۔ ہماری چیخیں اب رونے میں بدل گئیں۔

Scanned with CamScanner

"کیا ہوا... کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ کیوں... کیوں؟" امی بھی گھبرا گئیں ہم امی کو کچھ نہ بتا سکے کہ وہ کیا تھا۔ ہمیں خود بھی معلوم نہ تھا۔ ہم بس اتنا بتا سکے کہ وہ کوئی شے تھی جس نے ہمیں ڈرایا تھا۔ امی نے ہمیں ایک ایک چانٹا جڑ دیا اور غصے سے چیخ کو بولیں: "خبردار جو آئندہ تم پپ جھاڑ گئے... جہنم میں جائیں تمھارے پیر۔"

پھر جب ہمارے حواس بجا ہوئے تو ہم نے خوب کہانیاں گھڑیں کہ وہ ایک بھوت تھا... وہ آیا... اس نے ہمیں کہا کہ میں تمھیں کھا جاؤں گا۔ ہم نے کہا، تو ہمیں کیوں کھائے گا؟ وہ بولا، بس کھا جاؤں گا... نگل جاؤں گا۔ ہم نے پوچھا، کیسے نگلے گا؟ وہ دانت نکال کر آگے بڑھا۔ ایسے... ہم نے اسے پتھر مارے اور پھر اسی طرح پتھر مارتے ہوئے گھر تک آ گئے اور وہ بھاگ گیا...

تین بجے کے قریب اباجی دفتر سے آئے تو امی نے بڑے ہی خوفناک لہجے میں سب بات بتائی۔ تارو نے خودساختہ قصہ سنایا۔ میں صرف اتنا سا سچ بولا کہ وہ کوئی ڈراؤنی شے تھی۔ سر گنجا تھا، ایک آنکھ پھوٹی ہوئی تھی، ٹیڑھے میڑھے ہاتھ تھے اور ٹانگیں بھی مڑی ہوئی تھیں اور وہ شے کبڑی بھی تھی۔ یہاں اباجی نے اونچا قہقہہ لگایا۔ پھر انھوں نے تارو سے پوچھا: "کیا کہا تھا اس نے؟ میں تمھیں کھا جاؤں گا؟"

"جی ہاں... کہا تھا..." تارو نے جھوٹ بولا۔

"اچھا، میں پوچھوں گا اس سے... بچوں کو ڈراتا ہے! میں سمجھتا تھا بڑا مسکین ہے۔" اباجی مسکرا رہے تھے۔

"کون ہے وہ؟" امی نے پوچھا۔

"سائیں موسم۔"

"سائیں موسم!" ہم سب بیک زبان حیرت سے بولے۔

"ہاں، موسم... نام ہے اس کا۔" اباجی نے کہنا شروع کیا۔ "پیر صلابت شاہ کا مرید ہے۔ تم نے دیکھے نہیں ملنگ لوگ؟ بس اسی طرح کا ہے۔ گلے میں مالا ہوتی ہے۔ ہاتھوں میں کڑے ہوتے ہیں۔"

"منحوس ہوگا اس کا نام۔" امی نے کہا۔

''نہیں، محسن نہیں . . . موسم،'' اباجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

مجھے اور نارو کو یقین نہ آیا کہ وہ ڈراؤنی شے کوئی انسان ہو سکتی ہے۔ امی آج تک اسے سائیں محسن ہی کہتی ہیں۔ ہم پھر کبھی پمپ جہاز کی طرف نہ گئے اور پھر تعلیمی وجوہ سے مجھے بلکسر چھوڑنا پڑا۔

3

چھ سال گزر گئے۔ میں واپس بلکسر جا رہا تھا۔ بس میں اپر کلاس کی اگلی سیٹ پر میں بیٹھا تھا، پچھلی سیٹ پر بھابھی اور بہن عصمت تھی اور ان کے بائیں ہاتھ کی سیٹ پر ایک بھینگا سا شخص بیٹھا تھا۔ ایک چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں بس رکی تو میں نیچے اترا۔ دھوپ خوشگوار تھی۔ اچانک وہ بھینگا سا شخص میرے قریب آیا۔

''میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔''

''دیکھا ہوگا . . . کہاں دیکھا تھا آپ نے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بلکسر میں رہتے ہیں؟''

''ہاں . . . وہیں رہتا تھا۔'' میں نے اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کی۔

''پھر آپ کہیں چلے گئے تھے؟''

''ہاں۔ اب میں واپس جا رہا ہوں۔''

''آپ پمپ جہاز کے پاس والے بنگلوں میں سے ایک میں رہتے تھے۔'' وہ مسکرایا۔

''ہاں۔ اب بھی وہیں جا رہا ہوں،'' میں نے جواب دیا۔

''جانتا ہوں۔'' اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ''تو آپ نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں صلابت شاہ کا بیٹا جابر شاہ ہوں۔ آپ کے بنگلے کے پاس وہ جو ڈھوک ہے نا . . . ہماری ہے۔''

میرے ذہن میں سائیں موسم کا نام گونجا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''وہاں ڈھوک میں . . . ایک سائیں ہے . . . کیا نام ہے اس کا، سائیں موسم۔''

''ہاں ہاں، وہ ہمارا ہی بالکا[1] ہے۔''

---

[1] بالکا: مرید۔

Scanned with CamScanner

''کیا اب بھی وہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تو اور اسے کہاں جانا ہے!'' جابر شاہ نے آور کو غیر معمولی حد تک کھینچا۔

''بچپن میں ایک دن میں اس سے ڈر گیا تھا،'' میں نے مسکرا کر کہا۔

جابر شاہ نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''وہ خبیث ہے ہی ڈراؤنا۔''

''موسم...'' میں نے کہنا شروع کیا، ''موسم... بھئی نام خوب رکھا ہے اس نے۔''

''اجی اصلی نام سرفراز ہے۔''

''تو یہ موسم کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''بس جی... اس کو یقین ہے کہ جب وہ مر جائے گا تو موسم ختم ہو جائیں گے۔ یعنی اگر برسات میں مرا تو سدا برسات رہے گی، اگر سردی میں مرا تو سردی، اور اگر بہار میں—''

''میں سمجھا... میں سمجھ گیا!'' میں ہنستے ہوئے کہا۔ بس نے ہارن دیا اور ہم اپنی اپنی نشستوں پر جا بیٹھے۔

''موسم اگر گرما میں مرے گا تو گرمی رہے گی، اگر سردی میں مرا تو سردی—اسے کس موسم میں مرنا چاہیے؟'' میں نے یونہی مسکراتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔ بس چلتی رہی۔

جب میں بلکسر پہنچا تو ہر شے بدل چکی تھی۔ نارو کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ چنڈی کھیب کے پاس منگھیاں نامی گاؤں میں ایک دکاندار کی بیوی بن چکی تھی۔ نارو کا باپ مر چکا تھا۔ میں بھی چار فٹ پانچ انچ سے بڑھ کر پانچ فٹ دس انچ لمبا ہو چکا تھا۔ میرے گول ماتھے کے اطراف میں بال اڑ گئے تھے اور نوکیں سی نکل آئی تھیں جنھیں دیکھ کر مجھے بڑے ہو جانے کا احساس ہوا کرتا تھا۔

وہ بہار ہی کا موسم تھا۔

لان میں اب بھی پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھولوں سے اٹھتی ہوئی خوشبودار ہوا اب بھی وہی تھی۔ کسی غیر مرئی شے کا احساس اب بھی تھا لیکن ادراک بدل چکا تھا۔ اب وہ پریوں کی شہزادی نہ تھی، اب وہ سراپا میرے تخیل کا حسن تھی۔ وہ اب بھی اپنے ان دیکھے ہاتھوں سے میرے چہرے کو چھو کر نکل جاتی، اب بھی میرے جسم میں کپکپی سی دوڑ جاتی، پیلے پیلے پھولوں کے ابھرے ہوئے سیاہ روئیں دار مخملیں مچھے سے اب بھی شہد کی مکھیاں ٹکرا کر بھنبھناہٹ پیدا کرتی تھیں، اب بھی

بھونرے ہوا میں تھرکتے تھے۔ لیکن مجھے کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور میں اداس تھا۔

مجھے سائیں موسم کا خیال آیا۔ جابر شاہ نے مجھے راستے میں ڈھوک آنے کی دعوت دی تھی۔ میں ڈھوک کی سمت چل دیا۔ ڈھوک اور جنگلے کے درمیان بے شمار جھاڑیوں اور آک کے پودوں کے درمیان پتھریلی پگڈنڈی ہے۔ جب میں ڈھوک کے قریب پہنچا تو ونچے مضبوط جسم اور چوڑے جبڑے والا ایک کتا چھلانگیں لگاتا ہوا میری سمت آیا۔ میں بچاؤ کے لیے ایک جھاڑی کے پیچھے کود گیا اور پاؤں کے تلے بکھرے ہوئے ان گنت پتھروں میں سے دو تین پتھر اٹھا لیے۔ کتا مجھے مسلح دیکھ کر چند گز کے فاصلے پر رک گیا اور زور زور سے غرانے اور پچھلے پیروں سے مٹی اڑانے لگا۔ ڈھوک سے ایک تیز چبھتی ہوئی آواز آئی: "ہے رچھو... بے حرام مال امڑ پیچھے... مڑ، تیری ماں..."

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ تیز چبھتی ہوئی آواز میں نے کبھی کبھی خواب میں بھی سنی تھی۔ وہ سائیں موسم ہی تھا — وہی کبڑا جسم، پھوٹی ہوئی آنکھ، ٹیڑھے ہاتھ، مڑے ہوئے بازو، خمیدہ ٹانگیں اور لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کے اوپر نظر آتے ہوئے سیاہ گندے ٹوٹے ہوئے دانت، ویسی ہی تیز چبھتی ہوئی آواز... میرے ذہن میں دو بچے تیزی سے دوڑے اور ایک دوپٹے کی دھجیاں ہوا میں اڑ گئیں۔ میں مسکرا دیا۔ کتا دم ہلاتا واپس سائیں کے قدموں میں چلا گیا۔

"تم سائیں موسم ہو؟"

"جی صاحب جی،" اس نے کہا۔

"جابر کہاں ہے؟"

"باوا جی؟... جی وہ اندر ہیں۔" سائیں نے ڈھوک کے اندرونی کمرے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ہم دونوں کمرے کی سمت چلے۔

"ہے لا — آؤ جی آؤ جی!" جابر شاہ چارپائی سے چھلانگ لگا کر اٹھا۔ "مجھے پتا تھا جی، آپ آئیں گے۔"

"میں نے وعدہ جو کیا تھا،" میں نے کہا۔

"ہاں جی، وعدہ پورا کرنا مردوں کا کام ہے۔" ایک اور بولا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ بھوری بھوری خطرناک آنکھیں تھیں، جسم خاصا مضبوط تھا اور رنگ زنگ لگے لوہے کی طرح جلا جلا سا

تھا۔ وہ دانت پیس کر بات کرتا تھا اور زیادہ سر لب پہ ہر کرتا تھا۔ یہ سائیں ملک تھا۔ باقی کمرے میں ایک اور وقار۔ ایک لنگڑا، مصنوعی پلاسٹک کی ٹانگ والا چوکیدار اللہ داد تھا۔ یہ سب جابر شاہ کے مرید تھے۔ جابر نے سب سے میرا تعارف کرایا۔

سب سے پہلے سائیں ملک بولا۔ "کیا ذات ہے جی آپ کی؟"

"ذات؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ "کوئی ذات نہیں میری۔"

"ہو ہی... ایسا بھی نہیں ہوگا" لنگڑا اللہ داد بولا۔

"ذات تو ضرور ہوگی آپ کی۔" سائیں ملک نے کہا۔

"نہیں، میری کوئی ذات نہیں۔" میں نے ہنس کر کہا اور وہ سب کھلکھلا کر ہنس دیے جیسے میں نے بڑی احمقانہ بات کی تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ واقعی یہ میری حماقت تھی۔ پوٹھوہار اور دھنی کے علاقے میں پہلے ذات پوچھی جاتی ہے، پھر سلام کیا جاتا ہے۔ پہلے نسب پوچھا جاتا ہے پھر حال۔ اگر آپ سید ہیں، ملک ہیں، راجہ ہیں، تو آپ کی ہر احمقانہ بات درست تسلیم کی جائے گی۔ اگر آپ کچھ اور ہیں تو آپ کی ہر بات ہنسی میں اڑا دی جائے گی۔ یہاں عزت سے رہنے کے لیے سید، راجہ، ملک ہونا بے حد ضروری ہے۔

4

شہر سے باہر ایک بنگلے میں مجھے تنہائی کا احساس کچھ زیادہ ہی تھا۔ ڈھوک میں چودھری صاحب مجھے وہاں جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے، "جنگلیوں، چرسیوں اور بدمعاشوں کی جگہ ہے۔ شریفوں کا وہاں کوئی کام نہیں۔" یہاں مجھے شرافت کے نام سے چڑ آتی تھی۔ شریف ہونا بھی ایک خاصی مصیبت ہے۔ جب میں دو تین بار ڈھوک گیا تو ہمارے بڑے منیجر نے مجھے بلایا۔ وہ بڑے غصے سے بولے، "یور فادر از این آفیسر۔ یو آر اے نوبل پرسن۔ یو آر ایگزیکٹو آفیسر۔ تم وہاں کیوں جاتے ہو؟ اپنے ڈیڈی کی پوزیشن کا خیال کرو... تم میرے ساتھ کلب چلا کرو۔ وہاں اچھی سوسائٹی ہے۔ ہماری تنظیم کی لڑکیاں ہیں، لڑکے ہیں۔ ان سے دوستی بناؤ۔ ورنہ آرام کرو۔ شاید تم وہاں نشہ کرنے جاتے ہو۔ ہیں؟ یہ بات ہے تو جاؤ، میرے فریج سے وسکی کی

بوتل نکال لو۔ بھنگ تو ذلیل لوگ پیتے ہیں... اٹ از ویری بیڈ... ویری بیڈ۔''

بھنگ ذلیل لوگ پیتے ہیں۔ وسکی باعزت لوگوں کے لیے ہے۔ سب درست ہے۔ میں ہر بات تسلیم کرتا ہوں۔ اس لیے کہ کسی کے سامنے میں اسی کے ذہن کے مطابق سوچتا ہوں اور جو کچھ کوئی کہتا ہے اپنے ذہن میں درست سمجھ کر ہی کرتا ہے۔ لیکن کسی بات کو اپنے طور پہ ماننا یا نہ ماننا تو میرے اپنے بس میں ہے۔

دوسرے دن میں پھر ڈھوک چلا گیا۔ مئی کے آخری ایام تھے، وہ لوگ پھلاہی کے جھنڈے والے درخت کے نیچے چٹائیاں بچھائے بیٹھے تھے۔ سائیں موسم اور سائیں ملک بھنگ گھوٹ رہے تھے۔ سائیں موسم نے کان ململ کی صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس میں وہ ننگا ہو رہا تھا۔ اپنی ٹوٹی ہوئی انگلیوں میں بمشکل ڈنڈا اٹھائے وہ بھنگ کے پتوں کو دھما دھم کوٹ رہا تھا۔ میں مٹی کے بنے ہوئے چبوترے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چبوترے کی سختی کو اپنی پشت پر محسوس کرتے ہوئے میں نے جابر شاہ کو دیکھا۔ ''یہ چبوترہ کس لیے بنایا گیا؟''

''یہاں ہمارے دادا جی نے ڈیرہ لگایا تھا۔'' جابر شاہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ بڑے فخر سے بولا۔ ''اس وقت یہاں صرف جنگل ہی جنگل تھا۔ یہ پھلاہی کا درخت باوا جی نے خود لگایا تھا اور یہ جگہ...'' جابر شاہ نے چبوترے کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ ''یہ وہ جگہ ہے جہاں باوا جی بیٹھ کر چلہ کاٹتے تھے ... ہاں، اور—''

''ہاں ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔

''جی دیکھیے نا... ہمارے لیے یہ جگہ—''

''ہاں درست ہے،'' میں نے کہا۔

''اسی لیے یہاں ہم نے چبوترہ بنایا ہے۔ آخر وہ بھی تو ہمارے—''

''میں سمجھ گیا۔ ہاں... یہ درست ہے،'' میں نے تیزی سے کہا۔

سائیں موسم اور ملک بھنگ کو ململ کے کپڑے میں چھان رہے تھے۔

''پی لو جی سرکار نال پیالہ۔

ہووے جھوٹیاں نال منہ کالا... ایلی۔''

میرے دیکھتے ہی دیکھتے سائیں موسم نے آدھ سیر کا حُقل [2] چار مرتبہ پیا اور آستین سے منہ پونچھ کر بڑبڑایا۔ چند لمحوں بعد سائیں کے جسم میں رعشہ سا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹوٹی ہوئی انگلیاں چٹائی پر ٹیک دیں۔ ذرا سا جھکا اور سارے وجود کو جھٹکا سا دیا۔ سارا جسم ذرا اٹھا اور گر گیا سائیں کی آنکھیں بھر سی گئیں۔ "مدد کر مولا!"

دوسرے جھٹکے پر وہ اٹھ گیا۔ نیم رعشہ زدہ بدن ڈگمگاتا کمرے کی جانب آگے پیچھے یوں ہلتا چلا گیا جیسے کوئی آہنی لکڑی پر کلہاڑا چلا رہا تھا۔ سائیں کے اندر جاتے ہی کمپنی کا چھٹی کا وسل بجا۔ میں اٹھا اور گھر کی سمت چل دیا۔ پھلاہی کی ٹھنڈی چھاؤں سے نکلتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ہوا میں تپش ہے۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے پیر کا جھنڈا پھڑ پھڑایا۔ میری نگاہیں اس پر جم سی گئیں۔ اچانک مجھے ایک بات سوجھی۔

میں آج سے اسے پھلاہی کا عظیم درخت کہوں گا!

5

جون کا پہلا ہفتہ تھا۔ دوپہر تھی۔ میں پھلاہی کے عظیم درخت کی چھاؤں میں چبوترے سے گندا سا تکیہ جمائے لیٹا تھا۔ میری نگاہیں پتوں سے چھن چھن کر آنے والی چمکیلی کرنوں سے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے دائروں پر جم سی گئی تھیں۔ اپنی ناک کے نیچے ایک انچ کے فاصلے پر بنے ہوئے ایک چھوٹے سے دائرے میں سے گزرتی ہوئی ایک چمکیلی چیونٹی مجھے کافی بڑی نظر آئی۔ چند گز کے فاصلے پر ببولوں کی ٹہنیوں سے چپٹے ہوئے جھینگر بول رہے تھے۔ جون کی تپتی دوپہروں میں ان کی آواز بیزار کن حد تک اداس محسوس ہوتی ہے۔

اس وقت اداسی کا احساس کچھ زیادہ شدید تھا۔ اس بار معمولی سے وقت میں کئی واقعات ایسے پیش آئے جنہوں نے ہم سب دوستوں کو بیزار کر دیا۔ میں اداس لیٹا تھا۔ جابر شاہ میرے قریب تیوری چڑھائے بیٹھا تھا۔ سائیں موسم اندر کمرے میں چلا گیا تھا۔ سائیں ملک سر جھکائے، چٹائی پر نظریں جمائے، کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ لنگڑ اللہ داد اپنی پلاسٹک کی مصنوعی ٹانگ کو ایک چھڑی سے مسلسل

2 حقل: بالے۔

بجا رہا تھا۔ ہم سب بیزار تھے۔

اس بار جب میں ڈھوک میں گیا تو سائیں ملک اور سائیں موسم کسی بات پر الجھ رہے تھے، پھر وہ سنجیدگی سے لڑنے لگے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا وہ گالی گلوچ پر اتر آئے۔ جابر شاہ پہلے تو خاموش بیٹھا رہا پھر چیخ اٹھا۔ ''او ملکا... او ملک کے بچے... کنجر خانہ ختم کرو!... اوئے کیا ہو گیا جو لے لیا موسم نے تیرا اتبا کو؟ مر تو نہیں گیا تو۔''

''او، برباد اجی...'' ملک چیخا۔'' کوئی ایک بار ہو تو خیر ہے.. یہاں تو بس باپ کا گھر سمجھ رکھا ہے خبیث نے۔''

''تو خبیث... تیرا باپ خبیث... تیرا...'' سائیں موسم چلایا۔

جابر شاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے اٹھ کر سائیں موسم کی پشت پر گھونسا مارا۔ وہ چلایا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا ہاتھ پڑتا، میں نے جابر شاہ کو مضبوطی سے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

''چھوڑو! ختم کرو!... بس ختم کرو!'' اب میں چلا رہا تھا۔ جابر شاہ نے دانت کٹکٹائے، میری گرفت سے نکلنے کے لیے پہلو بدلے، سائیں موسم کو جلتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ''ماں کا... پاڈی کا پتر... حرامی پاڈی کے پتر... اوئے!'' جابر شاہ نے میری گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی۔ ''اوئے... تیری ماں کو سؤر لے جائیں... تیری ماں کو کتے لے جائیں... حرامی... پاڈی کے پتر۔''

سائیں سر جھکائے، مار کھائے ہوئے کتے کی طرح دانت نکالتا اندر چلا گیا۔ پھر سب خاموش ہو گئے۔ میں جابر شاہ کو ملامت کرنا چاہتا تھا، نہ کر سکا۔ جابر شاید کچھ اور گالیاں دینا چاہتا تھا، نہ دے سکا۔ لنگڑ اللہ داد دو مرتبہ بولنے کی کوشش میں بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔ ملک بھی کبھی جھکا ہوا سر اٹھا کر کچھ کہنے کی کوشش کرتا، نہ کہہ سکا۔ طویل خاموشی نے اداسی کو شدید بنا دیا۔ اس پر جھینگروں کی تیز چیختی ہوئی تانیں... میں نے گھبرا کر کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

''کیا ہے؟'' جابر شاہ نے پوچھا۔

''یہ جھینڈے...'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''میرے تو کان پھٹ گئے ہیں۔''

''ان حرامیوں نے بھی کون سا تھوڑا سر کھایا ہے۔'' جابر شاہ نے ملک کی طرف ہاتھ اٹھا کر اندر

کمرے کی سمت جھٹکا دیا۔ "حرامی... مفت کی روٹیاں توڑتے ہیں اور حرام خوری کرتے ہیں... سؤر نے... دو دن فاقہ پڑے تو پتا چل جائے لفنگوں کو۔"

ایک بار پھر خاموشی کے جھونکے ہمارے احساس پر تھپیڑے مارتے ہوئے چلے۔ پھر ایک سسکی سی ابھری۔ ملک نے سر اٹھایا۔ "میرا کیا ہے..." وہ اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے آگے کو جھکا۔ "میرا کیا ہے... ایک پیالہ لسی اور ایک نمکین روٹی۔ میں اسی پر جی لوں گا۔"

انسان ہمیشہ المناکی کا تصور اپنی ذات سے ملا کر دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہوئے ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں جانتا تھا، ملک کو اپنی حالت کی عکاسی سے کہیں زیادہ مرعوب کرنے کا خیال تھا۔

6

میں نے اکثر محسوس کیا کہ مجھے سائیں موسم کی ذات میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔ اب میں ہر روز ڈھوک کا ایک چکر لگایا کرتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میں اتنی جلدی ان لوگوں سے کیسے گھل مل گیا۔ یہ ماحول ہی بے تکلفی کی گود میں پلتا ہے۔ مجبوراً مجھے بھی اس کا اثر قبول کرنا پڑا۔ اکثر محفلوں میں جھجک اور حجاب کا پیدا کردہ بناوٹ کا رنگ، جو میرے ذہن پر چڑھ جاتا تھا، یہاں مفقود تھا۔ چند ہی دنوں میں ہم سب بے تکلف ہو چکے تھے۔ سائیں موسم سے جو قدرتی انس مجھے پیدا ہو چکا تھا، اس نے میری توجہ کا مرکز اسی ہستی کو بنائے رکھا۔

اس کا نام سرفراز تھا۔ بلکسر گاؤں کے ایک جولاہے کا بیٹا تھا۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی اور کچھ کھڈیاں تھیں جن پر دن رات سرفراز کے گھر والے بڑی جانفشانی سے کھیس اور چادریں بنتے تھے۔ سرفراز کے ذمے کھیتی باڑی کا کام تھا۔ اس وقت سرفراز کا جسم سیدھا تختے کی مانند تھا۔ مضبوط ہاتھوں سے ہل تھامے، بلند آواز سے دوہے گاتے، چمکیلی دھوپ میں بیلوں کو ہنکارتے ہوئے سرفراز سمجھتا تھا کہ زندگی کھلے کھیتوں میں ہل چلانے اور گانے کے سوا کچھ نہیں۔

چوپال میں ایک دن پیر صلابت شاہ نے کہا کہ زندگی کا مقصد عظیم ہے، ہل چلانا اور گانا کچھ بھی نہیں۔ انسان کو چاہیے کہ زندگی کی عظمت کو حاصل کرے جو پچی سرکار کا دامن تھامنے سے ملتی ہے۔

Scanned with CamScanner

انسان جب خود کو ختم کر دیتا ہے، یہی سرکار اسے عظیم بنا دیتی ہے۔ سرفراز کے ذہن نے یہ استدلال بہت جلد قبول کر لیا۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ زندگی کا عظیم مقصد سامنے رکھوں گا اور یہی سرکار کا دامن تھام کے عظیم بنوں گا۔

ان دنوں پیر صلابت شاہ کی ڈھوک میں سائیں ملک اور چند دوسرے ملنگ رہتے تھے۔ اخراجات بڑھ گئے تھے۔ ایک صورت تھی کہ کوئی ملنگ کاسۂ گدائی اٹھائے اور ہر دروازے پر صدا لگائے۔ سب ملنگ پرانے گھاگ تھے، کوئی آمادہ نہ تھا۔ کسی نئے شکار کی ضرورت تھی۔

جال بچھایا گیا۔ سرفراز بڑی آسانی سے پھنس گیا۔ ڈھوک میں جابر شاہ نے سرفراز کو اپنے سامنے بٹھایا۔ سائیں ملک نے بھنگ تیار کی۔ بھنگ کا پیالہ جابر شاہ نے سرفراز کو خود پیش کیا۔ سنا ہے سرفراز نے پہلے تو انکار کیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، جابر شاہ کسی عامل کی طرح اس کے جو اس پر چھا گیا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟... پی جاؤ... دل کا میل دھل جاتا ہے سرفراز... یہی سرکار کا پیالہ تمام گناہوں کو دھو دیتا ہے... پی لو دیکھو یہ میں تمھیں اپنے ہاتھ سے دے رہا ہوں۔ ڈرتے کیوں ہو؟ کچھ نہ ہوگا... شاباش، پی لو۔''

اور پیالہ سرفراز کے ہونٹوں سے چپک گیا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟ کود جاؤ... دیکھو میں نے تمھیں اس بلندی پر پہنچایا ہے... نیچے دیکھو... ہاں، ان گندے غاروں میں کود جاؤ!... یہی سرکار کا یہی حکم ہے۔ تمھارے سب گناہ مٹ جائیں گے... گناہ کیا، تم خود مٹ جاؤ گے، فنا ہو جاؤ گے... تباہ ہو جاؤ گے... شاباش! کود جاؤ! بڑھو... آگے بڑھو... ایک قدم اور... شاباش، اچھلو، کود جاؤ!... کود جاؤ!''

اور سرفراز گہرے تاریک دلدلی غاروں میں کود گیا۔ نہ جانے کتنے سیر بھنگ سرفراز کو پلائی گئی۔ وہ اٹھارہ گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد جب اٹھا تو اسے ٹائیفائیڈ ہو گیا۔ اسے کسی نے ہسپتال تک نہ پہنچایا۔ گاؤں کے حکیموں نے اس کا علاج کیا۔ اس کی جان تو بچ گئی، لیکن اب وہ سرفراز نہ تھا۔ سیدھا تختے جیسا جسم آگے کو جھک گیا۔ لمبی مضبوط ٹانگیں خم کھا گئیں۔ سڈول بازو مڑ گئے۔ انگلیاں ٹوٹ گئیں۔ ایک آنکھ عضلات کے تناؤ سے ایسی بند ہوئی کہ پھر نہ کھل سکی۔ پہلی نظر میں وہ پھوٹی ہوئی لگتی تھی۔ اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ مجبوراً اس نے ڈھوک میں پناہ لی۔ جہاں اس کا نام سائیں موسم رکھا

Scanned with CamScanner

گیا، اس کے گلے میں کاسۂ گدائی لٹکایا گیا اور کہا گیا کہ "ہر دروازے پر مولا پچی سرکار کا نام لے کر بلائیں دور کرنا تمہارا فرض ہے، اگر کوئی کچھ دے دے تو پچی سرکار کا انعام سمجھ کر لے لینا۔ تمہارے ذمے پچی سرکار نے یہی کام لگایا ہے۔ تم خوش نصیب ہو... یہ ریاضت ہے ریاضت... یہ کسی کسی کو ملتی ہے۔" کھلے کھیتوں میں متوالے گیت گانے والا سرفراز اب سائیں موسم بن کر ہر دروازے پر بھیک مانگنے لگا۔ اب وہ گدا تھا، فقیر تھا۔ اب وہ ڈھوک کے شریف انسانوں کا پالا ہوا کتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا سائیں موسم کا ضمیر بھی مر چکا ہے۔ وہ ایک ایسا پتھر ہے جسے جس وقت جی چاہے ٹھوکر لگائی جا سکتی ہے۔ یا پھر وہ پتھر کی ہی چلتی پھرتی مورتی ہے: ٹیڑھے بازوؤں، خمیدہ ٹانگوں، ٹوٹی ہوئی انگلیوں والی کبڑی مورتی، جو اگر اپنی پھوٹی ہوئی آنکھ دبا کر، سر جھٹک کر، ٹوٹے ہوئے، کرم خوردہ میلے دانت نکال کر، اجنتا کے غاروں میں چلی جائے تو وہ بھی شرما جائیں۔ یہ بھی انسان کی تخلیق ہے۔ قدرت نے تو اسے بڑے سادہ سے خدوخال عطا کیے تھے۔ اسے انسانی فن نے عظیم بنا دیا۔ میرے دل میں فنکار کا رعب بیٹھ گیا۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا، سائیں کو گریباں سے پکڑ لوں اور جھنجھوڑتے ہوئے چیخ چیخ کر کہوں "سائیں تو نے کھیتوں میں گندم کے لہلہاتے پودوں میں کہیں کہیں کرم خوردہ سیاہ خوشے نہیں دیکھے تھے جنھیں کسان بے دردی سے اکھاڑ پھینکتے ہیں، ماں سے جدا کر دیتے ہیں۔ بہنیں جدا ہو جاتی ہے، بھائی چھوٹ جاتے ہیں، گھر چھوٹ جاتا ہے۔ سائیں تو نے انھیں نہ دیکھا۔ تو نے اپنا انجام نہ سوچا۔ تو نہیں مانے گا، تو ضدی ہے۔ کاش تو جان لے کہ تو گندم کا کرم خوردہ سیاہ خوشہ ہے جسے بے دردی سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ ماں سے جدا کر دیا گیا ہے، بہنیں چھین لی گئی ہیں، بھائی مار دیے گئے ہیں۔ گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ جلاوطن کر دیا گیا ہے۔ تو اپنے دیس میں پردیسی ہے۔ تو اپنوں میں رہتے ہوئے بیگانہ ہے... اجنبی ہے۔ اسلم کا ہوٹل میرے یار کا ہوٹل نہیں ہے۔ ماسی نیکو کی ڈھوک تیری منہ بولی بہن کی ڈھوک نہیں ہے۔ یہ ڈھوک تیرا گھر ہے، جہاں تو خارش زدہ مفلوج کتے کی طرح رہتا ہے۔ تو بہت پیسے کا خریدا ہوا کتا ہے۔ اب تیری کوئی اہمیت نہیں، خارش زدہ مفلوج کتا... ذلیل... کمینہ... الو کا پٹھا... تو بس اسی لیے ہے کہ جب تجھے گالیاں دی جائیں تو سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا تیرے سامنے پھینکا جائے۔ جب ٹھوکر لگائی جائے تو ٹھیکرے میں پانی پلایا جائے۔ تو بس رحم

Scanned with CamScanner

کے قابل ہے، مگر تجھ پر رحم آتا بھی ہے تو مارنے کے بعد۔ او پاڈلی کے پتر... تیری ماں کو کتے لے جائیں...!

پھر میرے دل میں ایک باغیانہ خیال شدت سے تڑپ اٹھتا۔ "سائیں، مجھے معاف کر دے... میں بڑا ظالم ہوں۔ میں بے درد کسان ہوں، میں کرم خوردہ خوشے کو توڑتا جاتا ہوں۔ میں نے کیڑے کے متعلق کبھی نہیں سوچا۔ میں بڑا ظالم آقا ہوں۔ مجھے تجھ پر رحم آتا ہے، اس لیے کہ میں تجھے خوراک دیتا ہوں... لیکن تو کسی کام کا نہیں۔ کاش تو کیڑا نہ ہوتا... کاش تیرے ہاتھ سلامت ہوتے... کاش تیرے بازو طاقتور ہوتے... کاش تو تیز دوڑ سکتا... تو... تو ماڑی کی ملیاری[3] اٹھا لانے کی سعادت تجھے بخشتا...

"پاڈلی کے پتر... تو کسی کام کا نہیں۔"

7

جولائی کی جلتی دھوپ میں عاشورے کے دن آ گئے۔ بلکسر گاؤں میں امام باڑے اور مسجد اہل سنت کی چٹائیاں ہر شام سیاہ و سفید کپڑوں سے سجنے لگیں۔ سب گاؤں کے باشندے امام باڑے اور مسجد میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چندہ اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ چکوال سے لاؤڈ اسپیکر منگوائے گئے تھے۔ دسویں محرم کو ایک مشہور ذاکر اور ایک عظیم مولانا، سرگودھا اور جہلم سے آنے والی بسوں سے، آگے پیچھے بلکسر اڈے پر اترے، سیاہ و سفید جلوس آگے پیچھے گاؤں پہنچے۔

صبح کے دس بج رہے تھے جب میں بلکسر کی مسجد کی جانب جا رہا تھا۔ میں مولانا صاحب اور ذاکر صاحب کے وعظ سننا اور نوٹ کرنا چاہتا تھا۔ میری جیب میں نوٹ بک اور قلم صبح سے رکھے تھے۔

جب میں گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو مخصوص دیہاتی لہجے میں کوئی قریب سے بولا، "کدھر چڑھائی ہے؟" یہ لنگڑا اللہ داد تھا۔ "باواجی نے آپ کو بلایا تھا۔"

مجھے یاد آیا، جابر شاہ نے مجھے آنے کی تاکید کی تھی۔ میں اللہ داد کے ساتھ چل پڑا۔

"آج سائیں موسم نے چاقو مارے ہیں۔" اللہ داد نے کہا۔ میں چونک کر ٹھہر گیا۔

---

[3] ملیاری: سبزی بیچنے والی لڑکی۔

"کیا؟"

"چاقو مارے ہیں۔" اللہ داد مسکرا کر بولا۔ "سائیں موسم نے۔"

"کسے مارے ہیں؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاؤ..." اللہ داد نے دانت نکالے۔ "کسے مارے ہیں! او صاحب جی، اپنے سینے پر مارے ہیں... کسے مارے گا پاؤلی کا پتر۔"

میں خاموش ہو گیا۔ اللہ داد سارا راستہ باتیں کرتا رہا۔ میں نے کچھ سنیں کچھ نہ سنیں۔ بیرونی دروازے پر مجھے چند دھبے نظر آئے جو قریب ہوتے ہوتے جمے ہوئے خون کی طرح سیاہی مائل سرخ ہو گئے۔ پھر کوئی قریب سے بولا۔ "پاؤلی کا پتر!"

بے چارہ پاؤلی کا پتر ایک کچے ستون کے قریب کوئلوں کے ڈھیر کی طرح پڑا تھا۔ اس کی سیاہ قمیص خون سے لتھڑی ہوئی تھی۔

پھر مجھے جابر شاہ نے پکڑ لیا۔ "بھئی ایک کام کرو... وہ سائیں موسم... حالت خراب ہے اس کی۔"

"پھر..." میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"میں نے ملک کو گھوڑی لانے کے لیے کہا ہے۔ تم ڈوردو کو ساتھ لے کر اڈے پر اسلم کے ہوٹل میں اسے لے جاؤ... وہاں گھوڑی پہنچ جائے گی۔ پھر اسے ڈھوک پہنچا دینا... تمھیں بھی تو گھر جانا ہے۔ پیدل کیسے جاؤ گے... یہ آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہو رہی ہے۔ ہاں... شاید تم—"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے لے جاؤں گا... ڈوردو کہاں ہے؟"

"ہاں..." جابر شاہ نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر دائیں ہاتھ کچے ستون کی سمت چل دیا۔ میں بھی پیچھے پیچھے گیا۔ سائیں موسم اور ہم نے سائیں موسم کو سہارا دیا اور امام باڑے سے باہر آ گئے۔ ڈوردو اور سائیں ملک دروازے کے پاس کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

"او ملکا... او خنزیر... ابھی تک یہاں ہے؟ میں نے کہا نہ تھا..." جابر شاہ چلایا۔

"یاد ہے باوجی... بس جاتا ہوں!" ملک دھوتی کا پلو جھٹک کر سیدھا گلی میں چل دیا۔ میں اور ڈوردو سائیں موسم کو تقریباً کندھوں پر اٹھا کر اسلم کے ہوٹل میں لائے۔ ڈوردو واپس چلا گیا۔

کچی اینٹوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے کمرے کی گارے سے لپی ہوئی کچی دیواروں میں جا بجا مٹی جھڑنے سے سوراخ نمایاں تھے۔ کچھ فرش پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ گیلی زمین کی مخصوص بو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا دریچہ گاؤں کی سمت کھلتا تھا۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ سائیں یک چارپائی پر لیٹا یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی اونٹ کی کوہان پر کالی بوری رکھی ہو۔ میں دریچے کے قریب بیٹھ گیا۔ سورج کی ہر شعاع عمودی تھی۔ باہر کھیتوں میں پھیلی ہوئی تیز روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ ہر کرن ایک شعلہ تھی۔ سورج سے گرتے ہوئے لاتعداد شعلوں کو چیر کر گاؤں سے آنے والی چکی کی تک تک نے مجھے اداس کر دیا۔ کمرے کی تاریکی، اُمس اور خاموشی نے بے دردی سے مجھ پر اپنا سارا بوجھ ڈال دیا۔ سائیں کے کالے چولے کو جمے ہوئے خون کے داغوں نے جگہ جگہ پر اکڑا اکڑا ابھار دیا تھا۔ مجھے ان دھبوں سے خوف آ رہا تھا۔

گھوڑی کی ٹاپیں دروازے کے قریب رکیں اور سائیں ملک اندر آیا۔ وہ پسینے سے بھیگ رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ ''لو صاحب جی... لے جاؤ اس اپنی ماں کے لاڈلے کو... ہمپ... ہزار بار لاٹ صاب سے کہتا تھا، اتنی بوٹی نہ پی... پر... یہ... ہاں... کس کی مانتا ہے یہ حرامی پاؤلی کا پتر۔''

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملک کو دیکھ رہا تھا۔ ملک مجھے اس طرح گھورتے دیکھ کر کچھ گھبرایا، پھر اس نے سائیں کو ایک بازو سے جھٹکا دیا۔

''آنہہ... کون ہے؟'' سائیں موسم کی آواز کسی کونے سے نکلتی محسوس ہوئی۔

''اٹھ... چل ڈھوک... صاحب جی کے ساتھ!'' ملک چیخا۔

''آں... صاب... ہاں... پانی...'' سائیں موسم نے کروٹ لی۔ ملک باہر سے پانی لایا۔ پانی پی کر سائیں موسم نے آنکھ کھولی۔ اف!... سائیں کی آنکھ پکی ہوئی انجیر کی طرح گلی گلی سی تھی۔ دائیں بائیں پیلا پیلا سا گندا مواد بہہ رہا تھا۔ ہم نے سائیں کو سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ گھوڑی پر صرف ایک تہہ شدہ کمبل ڈالا گیا تھا۔ میں سوار ہوا اور سائیں ملک نے اٹھا کر سائیں کو میرے پیچھے بٹھا دیا۔ سائیں نے سسکی سی بھری اور سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ سینے کے زخم پھر رسنے لگے تھے۔ میں نے باگیں اٹھائیں۔ گھوڑی کی پہلی ٹاپ پر ہی سائیں اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اس کے کالے

Scanned with CamScanner

کالے، سوکھے بازوؤں نے میری گردن کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کا سر میرے کندھے پر بوجھ کی طرح آ لگا۔ آگے کو جھکا ہوا سینہ میری پشت سے مس کرنے لگا۔ مجھے اپنی پشت جلتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سائیں کا گرم گرم سانس میری گردن کو جلانے لگا۔ پہلے مجھے دھبوں کا خیال آیا اور میں پشت کی جلن کو شدت سے محسوس کرتے ہوئے کانپ سا گیا۔ پھر، نہ جانے کیوں، مجھے کیچوؤں کا خیال آیا اور گردن پر سانسوں کے مس سے میں لرز گیا۔ جس کچی سڑک پر ہم جا رہے تھے اس کے کناروں پر جنگلی بیروں کی جھاڑیوں کا سلسلہ بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ سورج شدت سے آگ برسا رہا تھا۔ میں پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ سائیں غیر متناسب وقفوں میں لمبی "ہائے" کھینچتا۔

سائیں کے سینے کے زخم دُکھ رہے ہیں۔ میرے ہاتھوں کی گرفت باگوں پر ڈھیلی ہو گئی۔ نیم بیہوشی میں بھی وہ اس جلن کو محسوس کر رہا ہے۔ مگر مجھے نہ جانے کیا ہوا، مجھے تاؤ آ گیا اور میں نے کہنا چاہا، او سائیں۔۔۔ او الو کے پٹھے۔۔۔ اگر اب تو نے ہائے کی تو گھوڑی سے نیچے پھینک دوں گا!

تا حدِ نظر بیروں کی جھاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کچھ سوکھے بیر ابھی تک ٹہنیوں میں پتوں کے آگے پیچھے، اوپر نیچے، نظر آ رہے تھے۔ ایک جھاڑی کی اونچی ٹہنی پر جھانپل آگے جھک کر اپنی کھلی انگلیوں جیسی دم عمودی انداز سے اٹھائے دوہری آواز میں چیخ رہی تھی۔ مدھم سے تیز تیز ہوتی ہوئی۔۔۔ مدھم، پھر مدھم سے تیز۔۔۔ اُتم سے پنچم، پنچم سے اتم، پھر اتم سے پنچم۔۔۔ کاش یہ کسی اور وقت ہوتا۔ اس وقت سائیں کی جونکوں جیسی بانہوں نے میرے کندھوں کے قریب اپنے کراہت انگیز پنجے گاڑے ہوئے تھے اور مجھے سارا ماحول دلدل دکھائی دے رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ایک خیال میرے ذہن پر گھوڑی کی ٹاپ کی طرح پڑا: "میں آج سائیں موسم سے اتنی شدید نفرت کیوں محسوس کر رہا ہوں؟"

سائیں یکلخت زور سے کانپا اور ایک طرف جھک گیا۔ میں نے باگیں چھوڑ کر سائیں کو تھاما اور پھر پہلے کی طرح سائیں میری پشت سے چمٹ آیا۔ پھر اچانک ایک جھاڑی سے ایک گلہری پھدکی، سرسراہٹ سے گھوڑی بدک کر ذرا سی اچھلی۔ سائیں پھر کانپا۔ "مولا مدد!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

گلہری اچھل کر چڑ چڑ کرتی کچھ دور بھاگی، پھر عجب متانت آمیز شوخی سے اس نے اپنے اگلے پنجے اٹھائے، دم ہلائی، کچھ دیر یونہی کھڑی رہی، پھر چڑ چڑ کرتی ایک جھاڑی میں کود گئی، جہاں ایک

Scanned with CamScanner

ببول کا درخت، زمین کو اور جھاڑیوں اور گھاس کو سورج سے گرتی ہوئی آگ سے بچانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"مذہب بہت سے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہے..." میرے خیالات کا رخ بدل گیا۔ "مذہب بہت سے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے، متوازی، ہر انسان کی آخری منزل تک چلے جاتے ہیں، چاہے وہ دو قدم پہ ہو، چاہے کوسوں دور... زندگی کی جلتی پگڈنڈی یہاں عافیت اور سکون میں چلتی ہے۔ اس کے باہر تپش ہے، جلن ہے۔ اس چھاؤں میں سب سے پہلے آنے والے لوگوں نے دوسروں کو پیار سے اس چھاؤں میں بلایا۔ اس کے بعد آنے والے اس انانیت میں سرشار کہ ہم نے عافیت کی راہ تلاش کر لی، اور خاموشی سے گزر گئے۔ پھر یوں ہوا کہ اس چھاؤں میں چلنے والوں نے دھوپ میں جھلستے لوگوں سے بے حد ہمدردی جتانی شروع کر دی۔ اس کے بعد آنے والے لوگوں کو بزورِ شمشیر اس چھاؤں میں کھینچا... لیکن سب کے بعد آنے والوں نے حد کر دی۔ انھوں نے درختوں کو دیکھا، چھال سونگھی، پتے توڑ کر چکھے اور درخت اکھیڑ کر ساتھ لیتے گئے... اب زندگی کی جلتی پگڈنڈی اور اس عافیت کی راہ میں کوئی فرق باقی نہیں۔ وہاں بھی جلن تھی، یہاں بھی جلن ہے... اب ہم کہاں جائیں؟"

پسینے کے نمکین قطرے میری آنکھوں میں سوزش پیدا کر رہے تھے۔

"میں اس مذہب کا متلاشی ہوں جو کسی بزرگ کے نورانی چہرے پر پھیلی ہوئی شگفتگی کی طرح تھا، جو ایک معصوم بچے کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کی طرح تھا۔ میں اسے ڈھونڈتا ہوں جو کنارے پر جھکی ہوئی جھاڑیوں پر، شفاف ندی کی چمکیلی لہروں کے عکس کی طرح تھا جس کا آغاز و انجام اس کے سوا کچھ نہ تھا، جس کا عنوان محبت اور صرف محبت تھا، میں اسے کہاں ڈھونڈوں... مجھے بھی بتائیے وہ کہاں چھپ گیا ہے۔"

سائیں کا جسم بار بار کانپ رہا تھا، گرمی شدید تھی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں، میرے جسم میں جیسے بے شمار کانٹے چبھ رہے تھے۔ پسینہ بھی بہہ رہا تھا جیسے ان کانٹوں کے پیدا کردہ زخموں سے خون رس رہا ہو۔ ابھی ڈھوک دور تھی۔ میں نے جلدی ڈھوک پہنچنے کے لیے گھوڑی کو سڑک سے ہٹا کر ایک تنگ ناہموار پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ گھوڑی کے سم بار بار پھسل جاتے تھے۔

Scanned with CamScanner

میرے لیے سائیں موسم کے ساتھ توازن رکھنا مشکل ہو گیا، لیکن جلدی ڈھوک پہنچنے کی خواہش نے مجھے باگوں پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے گھوڑی کو شتری[4] میں ڈال دیا۔ اس تنگ پگڈنڈی پر قدم قدم چلنا بھی مشکل تھا لیکن مجھ پر عجب وحشت سوار ہو چکی تھی۔ میرا جسم یوں ہل رہا تھا جیسے سائیں موسم کا بدن بھنگ پینے کے بعد ہلکورے لیتا تھا۔ مجھ پر غنودگی سی چھا گئی۔ بہر حال میں ڈھوک پہنچ گیا۔ پہلے خود گھوڑی سے کودا، پھر سائیں موسم کو اتارا۔ گھوڑی کو کھونٹے سے باندھ کر میں نے سائیں کو اندر کمرے میں ایک الٹی بچھی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔ ایک گندا سا تولیہ چارپائی کے سیدھے کھڑے پائے پر لٹک رہا تھا۔ اسے اتار کر میں نے پانی میں بھگویا اور سائیں کے ماتھے پر رکھ دیا اور خاموشی سے بیٹھ گیا۔ چند لمحوں بعد سائیں خراٹے لے رہا تھا۔ میں نے جیب سے نوٹ بک اور قلم نکالا اور صبح سے لے کر اس وقت تک تمام گزرے ہوئے واقعات کو ترتیب دے کر لکھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ تین بج گئے۔ چھٹی کا وصل ہونے سے چند لمحے پہلے ڈورو اور سائیں ملک ڈھوک پہنچ گئے۔ سائیں کو ان کے سپرد کر کے میں بوجھل بوجھل قدم اٹھاتے ہوئے بنگلے کی سمت چل دیا۔ تھکا تھکا سا... نشے کی سی حالت میں...

∎

گھر پہنچ کر بھی میری طبیعت نہ سنبھلی۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی سریع الاثر زہر میری رگوں میں داخل ہو کر خون منجمد کر رہا ہے۔ اس ہیجانی کیفیت میں اپنی بہن کے پاس جا بیٹھا۔

"عصمت..." میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا ہے؟... ارے، یہ تمھاری آنکھیں کیوں سرخ ہو رہی ہیں؟" بہن نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کہاں گئے تھے؟"

میں نے تمام دن کی سرگزشت سنا دی۔ ایک طویل گفتگو کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کسی طرح سائیں موسم کے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات کو اس کے شعور میں ابھار دیا جائے تو وہ ایک شدید نفرت سے مجبور ہو کر خود کو اس جہنم سے نکال لے گا۔

---

[4] شتری: مخصوص چال۔

Scanned with CamScanner

اگلے دن میں پھر ڈھوک میں بیٹھا تھا۔ سائیں کی حالت بہتر تھی۔ اس نے چولا اتار رکھا تھا، سینے پر زخموں کے اوپر ہلدی کے رنگ کی کوئی دوا ڈال رکھی تھی۔

"کل مجھے خوب گالیاں دی گئیں،" میں نے کہا۔

"کیا۔۔۔؟" سائیں حیرت سے بولا۔

"کل مجھے اباجی نے خوب گالیاں دیں،" میں قدرے سنبھل کر بولا، "کہنے لگے تم آوارہ ہو گئے ہو۔ سارا سارا دن غائب رہتے ہو۔ ڈھوک میں نہ جانے بھنگ پینے جاتے ہو یا چرس۔۔۔ تمھاری آنکھیں سرخ رہتی ہیں، تم نشے کی سی حالت میں رہتے ہو۔"

"لیکن۔۔۔ صاب جی۔۔۔ آپ نے تو کبھی نہیں پی۔" سائیں نے میرے سامنے صفائی پیش کی۔

"یہی تو بات ہے۔۔۔" میں نے اونچے لہجے میں کہا "یہی تو بات ہے جس پر مجھے غصہ آتا ہے۔ اگر میں یہ سب کام کرتا تو شاید اتنا غصہ نہ آتا۔ یہ کیا۔۔۔ ہر وقت پابندی۔۔۔ ہر وقت دوسروں کی محتاجی۔ اگر میں خود کماتا ہوتا تو کوئی بات نہ سنتا۔ گالیاں وہی سنتا ہے جو کسی کام کا نہ ہو۔" میرے لہجے میں تیزی تھی۔

"صاب جی۔۔۔ یہاں کام کرنے پر بھی گالیاں دی جاتی ہیں۔ یہ دنیا کی ریت ہے۔" سائیں کی تیز چبھتی ہوئی آواز میں یہ جملہ سن کر میں چونک گیا۔ ایک انجانی مسرت کے زیرِ اثر میں مسکراہٹ پر بھی قابو نہ پاسکا۔ میں نے چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

"سچ کہتے ہو۔۔۔" میں نے دبی دبی آواز میں کہا، "سچ کہتے ہو۔ یہاں کی ریت ہی ایسی ہے۔ بس محتاجی۔۔۔ سب سے بڑی لعنت۔۔۔ میں بھی تو محتاج ہوں نا۔" سائیں مجھے عجیب سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے کسی بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا ہو۔ پھر بہت دیر تک ہم اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

گھوڑی کی ٹاپوں سے ہم چونکے۔ جابر شاہ آیا تھا۔ بڑی گرمجوشی سے اس نے میرا ہاتھ دبایا۔

"تمھاری بڑی مہربانی یار۔۔۔ کل اس بے چارے کو یہاں پہنچا کر بڑا احسان کیا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں،" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

"نہیں... بھئی دیکھو نا... بات تو ہے، یعنی..."

میں نے سائیں سوم کو دیکھا۔ وہ جابر شاہ کو تشکر سے بھرپور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میرا دل بیٹھ سا گیا۔

کچھ دنوں بعد میں اور سائیں سوم پھلاہی کے عظیم درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ سائیں نے چند سوکھی روٹیوں کے ٹکڑے اپنے ٹوٹے ہوئے ہاتھ میں تھام رکھے تھے۔ سامنے ریچھو اپنی لمبی دم ہلا ہلا کر پلوں کی طرح چوں چوں کی لالچی آوازیں نکال رہا تھا۔

"یہ بھیک مانگتا ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر اس کے گلے میں کاسہ لٹکا دیا جائے تو یہ بھی بڑا کامیاب بھکاری بن سکتا ہے۔" سائیں نے مجھے دیکھا۔ چہرے پر ایسی کیفیت تھی جیسے مسکرانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ اتنے میں ایک اور مریل سا کتا، اچھلتا، کودتا، دم ہلاتا، عجیب اٹکھیلیاں کرتا ہوا ایک جھاڑی سے چھلاوے کی طرح نکل آیا۔ وہ کچھ دیر ریچھو کے گرد ناچا، پھر جب سائیں نے روٹی کا ٹکڑا پھینکا تو وہ بھی ریچھو کے ساتھ اچھل کر آگے بڑھا۔ ریچھو غرا کر جھپٹا۔ مار کھا کر وہ چیختا چلاتا واپس جھاڑیوں کی سمت دوڑا۔ ریچھو کچھ دور اس کے پیچھے گیا، پھر بھونکتا ہوا واپس آ گیا۔

"جانتے ہو سائیں..." میں نے کہنا شروع کیا۔ "جانتے ہو ریچھو اسے کیا کہہ رہا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم... میں تو۔"

"یہ کہہ رہا ہے... الو کا پٹھا... حرامی... سؤر... کمینہ... باؤلی کا پتر!" میں نے تیزی سے کہا۔

سائیں بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید نفرت کے تاثرات ابھرے۔ "صاب جی..." وہ کانپتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی..."

"او نہیں... بھئی معاف کرنا، منہ سے نکل گیا۔ دراصل جابر شاہ اور ملک یہی کہتے رہتے ہیں نا، میرے منہ سے بھی نکل گیا۔ ورنہ میں... بھئی معاف کرنا... میں تو کبھی بھی..." میں نے اکھڑے سے لہجے میں کہا۔ سائیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔

"سائیں..." میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔ "ناراض ہو گئے ہو؟"

"ہم غریبوں کو کسی پر کیا ناراض ہونا ہے جی... جو مرضی آئے کہہ لو۔" سائیں کی آواز گھٹی

Scanned with CamScanner

گھٹی سی تھی۔

''نہیں... ''میں نے گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا: ''نہیں... ایسا کیوں ہوگا۔ وہ تو... دیکھو نا...'' میں نے سائیں کا بازو چھوڑ دیا۔ ''سائیں... یار، ایک بات تو بتا۔''

''کیا...؟''

''کیا پاؤلی کا پتر ہونا گناہ ہے؟''

''گناہ... شاید... ہاں، ایک دن باواجی...'' سائیں نے روٹی کا آخری ٹکڑا بھی پھینک دیا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے مجھے دیکھا۔ ''ایک دن باواجی کہہ رہے تھے کہ...''

''ہاں... کہو!'' میں نے تیزی سے کہا۔

''کچھ یاد نہیں... ہاں، کچھ یوں کہا تھا کہ جو روحیں پلید ہوتی ہیں انھیں ہی کمی[5] بننا پڑتا ہے۔ نیک اور پاک روحیں، ملک اور رلیہ اور چوہدری اور... کچھ یونہی کہا تھا۔ دراصل یاد نہیں رہا... ہاں، کچھ پتا نہیں...'' سائیں کچھ سوچنے لگا۔

''سائیں مجھے تو یہ بتا...'' میں نے کہا: ''چل رہنے دے... تیرے بس کی بات نہیں۔''

''کیا...؟''

''میرا مطلب ہے، تیرے بس کی بات نہیں۔''

''پھر بھی، بات کیا ہے؟'' سائیں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''وہ... ہاں میں پوچھ رہا تھا کہ روحیں پلید کیسے ہو جاتی ہیں۔''

''باواجی...'' سائیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں چیخ اٹھا۔

''باواجی! باواجی! .. آخر یہ کیا مذاق ہے کہ جو بات باواجی نے کی ہے وہ درست ہی ہوگی؟ باواجی غلط بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''میں نہیں جانتا... باواجی...''

''باواجی کا کیا ہے، وہ تو بس باتیں کرنا جانتے ہیں۔ انھیں اس سے کیا، کوئی جیے یا مرے... انھیں تو بس باتیں کرنا ہے۔''

---

5 کمی: نیچ ذات۔

سائیں کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وار کامیاب تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا اور اسی طرح ہوا۔ میں سائیں کو اس غلامانہ زندگی سے متنفر کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وقت میرا ساتھ دے رہا تھا۔ سائیں کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ مدافعانہ انداز اختیار کر چکا تھا۔ اب جب اسے الزام دیا جاتا تو وہ آسانی سے تسلیم نہ کرتا تھا۔ اس پر اس کو مارا پیٹا جاتا تو اس کے دل پر نفرت کا سایہ اور گہرا ہو جاتا۔

9

رُت بدلی۔ شمالی ہواؤں کے سیٹیاں بجاتے جھکڑ جنوب کی سمت دوڑے۔ شمالی افق پر چھدرے چھدرے بادلوں کی کشتیاں ابھریں اور گہرے نیلے آسمان پر تیرنے لگیں۔ ان کے پیچھے دیوہیکل جہاز اپنے سرمئی بادبان کھولے متانت سے اٹھے۔ اس کے بعد آنے والی ہوا میں خنکی تھی، گیلی زمین کی مہک تھی۔ میرا دل ایک انجانی خواہش سے مجبور ہو کر ترنگ میں آ کر جھومنے لگا۔ جب میری پوشاک اور میرے بال ہوا کے شوخ جھونکوں سے اڑتے تو میرا جی چاہا کہ کوئی میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور میری روح آزاد ہو کر ان امنڈتے بادلوں کے سنگ فضاؤں میں آوارہ گھومتی رہے۔

چند لمحوں بعد آسمان کی نیلاہٹ سرمئی رنگ میں تبدیل ہو گئی، پھوار پڑنی شروع ہو گئی۔ میں ڈھوک کی سمت چل دیا۔

ہلکی ہلکی پھوار کے بعد زمین کسی چیچک زدہ شخص کے چہرے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ ڈھوک پہنچتے پہنچتے ہوا میں غضب کی تیزی آ گئی اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ڈھوک میں سبھی موجود تھے۔ جابر شاہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے والہانہ انداز سے جھوم رہا تھا۔ یہی حال سب کا تھا۔ سب نے بھنگ پی رکھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جابر شاہ نے نعرہ لگایا اور اچھل کر لپٹ گیا۔ لنگڑا اللہ داد سائیں موہم سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ملک بار بار اپنے دانتوں سے تھوک باہر اگل رہا تھا۔ ڈورو چلم کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ دفعتاً اللہ داد نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ سب چونکے۔ اللہ داد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھکا۔

''میں ہوں یک مرغی۔'' اللہ داد نے جھوم کر کہا۔

''واہ......'' سب چیخے۔

''میں نے دیے دو انڈے۔'' اللہ داد اچک کر آگے جھکا۔

''آہا......'' سب بولے۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے ایک تاریک کونے سے میاؤں کی آواز آئی۔

''انڈوں پہ بیٹھی بلی۔'' اللہ داد نے برا سا منہ بنایا۔

''ہائے......'' سب چلائے۔

''انڈوں سے نکلے دو کبوترے۔'' اللہ داد ایک دم سائیں موسم کی طرف گھوم گیا اور اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی سائیں کی ناک سے ٹکرا گئی۔ ''ایک یہ بیٹھا ہے...... دوسرا بے چارہ مر گیا۔'' اللہ داد نے بین کیا اور سب بین میں شامل ہو گئے۔

ہوا میں خنکی تھی۔ موسم کا پیدا کردہ جنسی تاثر ہر چہرے پر نمایاں تھا۔ سب بہک رہے تھے۔ ذورو کمرے کے تاریک کونے سے بلی پکڑ لایا اور پچی سرکار کے نام لیواؤں نے وہ سفلی مظاہرے کیے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں وہاں سے بھاگا۔ سائیں موسم بھی میرے پیچھے نکل آیا۔ بارش تیز تھی۔ ہم بھیگ رہے تھے۔

''سائیں...... دیکھا تو نے؟'' میں نے اپنے ماتھے پر گرے ہوئے بال اٹھائے۔

''ہاں، دیکھا صاب جی......'' سائیں کی آنکھ چمک رہی تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سائیں نشے میں نہ تھا، شاید اس نے کم پی تھی۔

میں نے اسے گھورا۔ ''اب بتا...... کون سچا ہے؟''

''آپ...... آپ جی...... یہ سب حرامی ہیں...... ملک بھی، اللہ داد بھی، ذورو بھی اور...... باوا جی بھی...... سب کے سب......'' سرفراز چیخ پڑا۔

میں نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرے کپڑے بھیگ کر جسم سے چپک گئے تھے۔ ہوا میں عجب کیف انگیز لطافت تھی۔ چند لمحوں بعد میرا ذہن کسی گرد آلود چٹان کی طرح بارش سے دھل چکا تھا۔

پھر بارش ختم ہو گئی۔ میں بنگلے کے بیرونی پھاٹک سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دائیں افق پر بھیگی ہوئی فضا میں نیلاہٹ ایک بار پھر ابھری۔ پہلے مدھم... پھر گہری...

ایک بار پھر گہرے نیلے آسمان پر کچھ بادلوں کے ٹکڑے برفیلی چٹانوں کی طرح ابھرے۔ پھر اس نیلگوں جھیل کے ایک کنارے پر سفید رنگ شروع ہو کر سفیدی مائل سرمئی میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ پھر جب میری نگاہیں گہری سرمئی سطح پر جم گئیں تو میرا جی چاہا آسمان کی سمت بازو واشگاف کروں اور اسی طرح ہوا میں بانہیں اٹھائے اڑتا چلا جاؤں... اس سرمئی سطح سے ٹکرا کر میرا جسم اس میں تحلیل ہو جائے... میرا کوئی وجود نہ رہے... کچھ دیر بعد میں ماحول سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

10

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ صبح جب میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے لان میں بھیگی ہوئی گھاس پر کھڑا تھا تو سامنے سڑک پر جابر شاہ، سائیں ملک، ڈورو اور اللہ داد گھوڑوں پر سوار گزر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی جابر شاہ مخصوص انداز سے چیخا: ”ہے لا... سویرے سویرے ہی چائے!“

”پیو گے؟“ میں نے پوچھا۔

”اونہیں... آج تو بڑا پروگرام ہے۔“ جابر شاہ بڑا خوش نظر آتا تھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے بیرونی پھاٹک پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے کہا۔

”گراں[6]... آج خوب پروگرام ہے... او، آج جھڑی لگی ہے۔“ جابر شاہ نے قہقہہ لگایا۔

”آخر بات کیا ہے... کیا پروگرام؟“ میں نے پوچھا۔

”لینے جا رہے ہیں...“ جابر شاہ دھنی کے مخصوص ترین لہجے میں بولا، ”کوئی بوتلیں... کوئی سوڈا... کوئی سوجی... کوئی کھنڈو[7]۔“ وہ زور سے ہنسا۔

”بوتلیں اڑیں گی... مرغا کٹے گا... پکوڑے بنیں گے... ہاکیا[8] پکے گا... ارے آج عیش ہو گی۔ جلدی جلدی ڈھوک پہنچو۔ ہم ابھی سامان لاتے ہیں۔“ جابر شاہ نے باگیں اٹھائیں اور

---

6 گراں گاؤں۔ 7 کھنڈو، کھانڈ۔ 8 ہاکیا، حلوہ۔

گھوڑا شتری میں دوڑا۔ پیچھے پیچھے دوسرے گھوڑے بھی دوڑے۔ اسی لیے عصمت لان میں آ گئی۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے پوچھا۔

"کہہ رہے تھے..." میں مسکرا دیا۔ "ساون کے استقبال میں مرغا کٹے گا، پکوڑے بنیں گے، ہا گیا پکے گا۔"

"یہ ہا گیا کیا بلا ہے؟" عصمت نے کہا۔

"حلوہ... جو دانتوں سے چپک جائے تو تمہ پیٹ سے بھی نہیں اترتا۔"

"تمہیں بلایا ہوگا؟" عصمت نے کہا۔

"ہاں، بلایا تو ہے۔"

"ایک بات کا خیال رکھنا۔" عصمت مسکرائی۔ "پکوڑے نہ کھانا۔"

"کیوں؟"

"وہ لوگ بھنگ ملا دیں گے... یاد ہے تمہیں، ایک بار بھائی جان کو ڈویل میں دوستوں نے بھنگ والے پکوڑے کھلا دیے تھے۔"

ہم وہ واقعہ یاد کر کے خوب ہنسے۔ پھر مجھے خیال آیا، سائیں موسم ڈھوک میں اکیلا ہوگا۔ میں سلیپنگ سوٹ ہی میں ڈھوک کی سمت چل دیا۔ بارش پھر شروع ہو گئی۔ سائیں کمرے کی دہلیز پر بیٹھا تھا۔ میں بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دور ماڑی کی دھندلی گدلی لکیر ایک گہرے سفید پردے میں چھپ چکی تھی۔ ماڑی میں تیز بوندوں کی بوچھاڑیں برف کے گالوں کی طرح گر رہی تھیں جو رفتہ رفتہ ہماری سمت پھیلے ہوئے صبح کے دھندلکوں کو چھپانے آ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد پہلی بوچھاڑ نے ہمیں بھگو دیا۔ نہ میں اٹھا نہ سائیں موسم... ہم وہیں بیٹھے بھیگتے رہے۔ بجلی چمکتی تو مجھے گرج کا انتظار ہوتا۔ اس ذرا سے وقفے میں میں بری طرح منتظر رہتا۔ زور سے بجلی چمکتی تو گرج بھی زوردار ہوتی۔ ایک بار انتہائی غضب ناک گڑگڑاہٹ کے بعد جب خاموشی چھا گئی تو سائیں خوفناک لہجے میں بولا، "بجلی گری ہے... کہیں صاف بجلی گری ہے۔" میں نے سائیں کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"کہیں قریب گرے تو مزہ آ جائے سائیں۔"

"مولا جی تن پاک رکھے... صاب جی... ایسی باتیں نہ کیجیے... خیر مولا خیر۔"

Scanned with CamScanner

لیکن مجھے شدید انتظار تھا۔ میرا جی چاہتا تھا، میرے چند گز کے فاصلے پر کھڑے پھلاہی کے عظیم درخت پر بجلی گرے اور اسے آگ لگ جائے۔ ظاہر تھا ایسا ہونے پر ہمارے بچنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی لیکن یہ طفلانہ خواہش بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ میرا جی چاہا خود کلہاڑا لے کر مسلسل ضربات سے اس عظیم درخت کو گرا دوں... آگ لگا دوں...

"آج پروگرام کیسا ہے سائیں؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی... جھڑی کی خوشی میں..." سائیں نے بوندوں کی طرف ہاتھ بڑھایا، چند بوندیں ٹوٹتے ہوئے پیالے میں بھی آ گئیں۔ "ڈورو... اللہ داد اور... باوا جی بھی گاؤں سے چیزیں لانے گئے ہیں... مرغا سوجی بیسن... گھی... کھنڈ اور... دو بوتلیں وسکی کی۔"

"وسکی کہاں سے ملے گی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "گاؤں میں تو..."

"وہ جی... بڑے کلب کا بیرا ہے نا... باوا جی کا مرید ہے۔ بوتلوں کا انتظام وہ کرے گا۔"

"پیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم غریبوں کی قسمت میں کہاں جی... ہم تو بوٹی پر ہی گزارا کریں گے..." سائیں کی آواز دھیمی تھی۔ وہ اداس ہو گیا۔

"ہاں بھئی... یہ پروگرام تو جابر شاہ کے منہ چڑھے ملنگوں کے لیے ہے۔ تجھے تو بچا کھچا ہی ملے گا... تو غریب ہے اور معذور ہے... یہ بے انصافی ہے سائیں!" میں نے اداس لہجے میں کہا۔

"انصاف کہاں صاب جی۔"

"دیکھ سائیں... انصاف صرف ایک طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ تو اس سے مانگ... انہیں چھوڑ دے... یہ سمجھتے ہیں انصاف ان کے ہاتھ میں ہے۔"

"چھوڑ دوں تو کہاں جاؤں صاب جی؟" سائیں نے بغور مجھے دیکھا۔ "گھر میں اب کوئی قدم نہ رکھنے دے گا۔"

"سائیں... گھر پھر بھی گھر ہے۔ تو جب ان سے جا کر معافی مانگے گا تو دیکھ لینا، تو اسی گھر کا بادشاہ ہوگا... فرض کیا اگر وہ کچھ دیر نہ بھی مانیں تو پھر بھی تیرا انتظام ہو جائے گا۔ تو میرے پاس آ جا سرونٹ کوارٹرز میں۔ ایک خالی پڑا ہے، وہ تو لے لے"

Scanned with CamScanner

"کہاں جی؟" سائیں چونک کر بولا۔

"بھئی... وہ نوکروں کے کوارٹر ہیں نا۔ ایک خالی پڑا ہے۔ وہ لے لینا۔"

سائیں کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کا بوسیدہ ہوا چولا اس کے کالے ڈھانچے سے چمٹا جاتا تھا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر کسی ناگزیر ارادے سے، ایک عزم مصمم کا سا انداز لیے وہ آگے کو جھکا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ 'منظور ہے صاب جی!" سرفراز کی آنکھ چمک اٹھی "کل صبح میں ڈھوک چھوڑ دوں گا...!"

کچھ دیر بعد جب بارش تھمی تو میں گھر چلا گیا۔ جب دوبارہ میں ڈھوک پہنچا تو سب آئے ہوئے تھے۔ ایک نئی صورت بھی نظر آئی۔ جابر شاہ نے تعارف کرایا۔ ہلسر گاؤں کا میراثی اللہ دتہ تھا۔ ایک بڑا سا ڈھول اٹھائے وہ بڑی گرم جوشی سے ملا۔ کمرے کی دہلیز کے سامنے ڈھلوان زمین پر پانی ٹھہر نہ سکا تھا اور وہ نم آلود بھی تھی اور خشک بھی۔ پھٹے بادل میں سے روشنی کی مدھم کرنیں اس پر بکھری ہوئی تھیں اور وہ یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی رات بھر جاگی ہوئی برہن کا چہرہ صبح کاذب کے دھندلکوں میں کھویا کھویا سا ہو۔ یہیں اینٹوں سے چولھے بنائے گئے، آگ جلائی گئی۔

جابر شاہ نے اعلان کیا کہ وہ کیا کیا پکائے گا۔ مرغا سائیں ملک کے ذمے تھا۔ لنگڑا اللہ داد آٹا بھگو رہا تھا۔ ڈورو لکڑیاں چیر رہا تھا۔ میں، سائیں موسم، میراثی چھوٹے موٹے کام کرنے کے لیے منتخب ہوئے۔ اللہ دتہ نے اپنے لیے یک اہم کام ڈھونڈ نکالا' وہ گود میں ڈھول لے کر بیٹھ گیا۔ کبھی اونچی تان اٹھاتا، کبھی زور زور سے کڑک دھم دھم... کڑک دھم دھم... ڈھول بجانا شروع کر دیتا، جیسے گندم کاٹتے وقت وہ کسانوں کو جوش دلایا کرتا تھا۔ ڈھول کا اثر بہت جلد محسوس ہوا۔ سب ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ ڈورو نے باقاعدہ ڈھول کی تھاپ پر کلھاڑا چلانا شروع کر دیا۔ سب چست ہو چکے تھے۔ بس سائیں موسم نہایت بے دلی سے کام کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ہر شے پر ڈھیلی تھی۔ اس کے پاؤں سست تھے۔ میں اس تغیر پر بے حد خوش تھا۔

اچانک جابر شاہ نے پانی مانگا۔ چھوٹی سی دیگچی اٹھا کر سائیں نے گھڑے سے پانی لیا۔ جابر شاہ کے پاؤں کے قریب پڑی ہوئی ایک لکڑی سے سائیں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرا، پانی اچھل کر جابر شاہ کے دھانی رنگ کے لاچے پر گرا اور پھر چولھے میں دہکتے ہوئے کوئلے سوں سوں

Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے بجھنے لگے۔

''حرامی... ماں... بہن... اندھا ہے؟ آنکھیں نہیں ہیں تیری؟... ماں... '' جابر شاہ چلایا۔

''باواجی... میں... میرا کیا قصور ہے... لکڑی۔'' سائیں موسم بھی تیز لہجے میں بولا۔

''قصور؟'' جابر شاہ تڑپ کر اٹھا۔ ''بتاؤں تجھے قصور؟'' وہ سائیں کی سمت بڑھا۔ میں چھلانگ لگا کر دونوں کے درمیان آ گیا۔

''بس کرو!... ختم کرو!'' میں چلایا۔

''نہیں... '' جابر شاہ غصے سے کانپا۔ ''نہیں... تجھے بتاتا ہوں، قصور... کیا کہا؟... بہن... بتاؤں تجھے؟'' میں نے جابر شاہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سائیں کو پرے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ سائیں نے فوراً تعمیل کی۔ میں نے بڑی مشکل سے جابر شاہ کو ٹھنڈا کیا۔ پھر دیر تک جابر شاہ گالیاں بکتا رہا اور سائیں بڑبڑاتا رہا۔

بارہ بجے کی وسل کے بعد آسمان پر گہرے بادل چھا گئے۔ ہم سب کمرے کے سامنے چٹائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک بالٹی میں سوڈے کی بوتلیں کھول کر ڈال گئیں۔ پھر جابر شاہ نے بوتلیں کھول کر بالٹی میں انڈیلیں۔ سائیں ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور انھیں گیلا کر دیا۔ اللہ داد آنکھ دبا کر آگے کو جھکا۔ پھر اس نے نعرہ لگایا۔ سائیں موسم ایک طرف خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بڑا سا پیالہ بھنگ سے بھر رکھا تھا، اسے وسکی ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس نے دو تین بار جابر شاہ کو عجیب سی نظروں سے دیکھا جن میں درخواست اور نفرت کے عناصر برابر تھے۔ پھر اس کی نگاہیں چٹائیوں پر بکھری ہوئی پیالیوں اور مٹی کی رکابیوں پر جم گئیں۔

پیالے بھرے گئے، ایک پیالہ مجھے بھی دیا گیا۔ میں نے گھبرا کر جابر شاہ کو دیکھا۔ ''بس آج... دیکھو یہ پروگرام ہے... آج انکار... بس نہیں ہوگا۔'' وہ بولا۔

''اچھا دو۔'' میں نے کہا۔

''یہ لا... '' جابر شاہ اچھلا۔

''ہاہا ہو ڈڈ ڈ!'' سب چلائے۔ میں نے پیالہ ہاتھوں میں تھام لیا۔ اب کیا کروں۔ سائیں کو

دینے کے لیے بہانے کی ضرورت تھی۔ مجھے ایک بات سوجھی۔ تو کیا...؟ میں نے خود سے پوچھا۔ ہاں ایک گھونٹ... میں نے بہانہ ڈھونڈ لیا۔ پیالہ اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ سب بت بنے مجھے دیکھ رہے تھے۔ سائیں موسم مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے پیالہ ہٹا لیا۔

"کیوں؟" جابر نے حیرت سے کہا۔

"پہلے تم سب پیو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں... پہلے مہمان پیتے ہیں۔ کیوں ملک؟" جابر شاہ نے ملک کو دیکھا۔

"ہاں جی... پہلے مہمان!" سائیں ملک نے تائید کی اور دور سے ڈورو بھی چلایا، "ہاں جی... پہلے مہمان۔"

میں نے پیالہ ہونٹوں سے لگایا— زندگی میں پہلی بار... میں کچھ ڈر سا گیا۔ پھر حوصلہ کیا اور ایک گھونٹ پی گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک تیز چلتا ہوا خنجر میرا سینہ چیرتا ہوا نکل گیا ہے۔ میرا سر گھوم سا گیا۔ میں نے گھبرا کر پیالہ پیچھے ہٹایا۔ سب زور زور سے ہنس رہے تھے۔ میں نے تیزی سے پیالہ سائیں موسم کو پکڑا دیا اور چیخ اٹھا "یہ مجھ سے نہ ہوگا... اف... بھئی معاف کرنا... یہ مجھ سے نہیں ہوتا۔ میرا تو سینہ جل گیا ہے..."

جابر شاہ نے اچھل کر پیالہ سائیں سے چھیننا چاہا مگر وہ ہونٹوں سے لگا چکا تھا... سب سہم سے گئے۔

"حرامی..." جابر شاہ نے غضب آلود نگاہوں سے سائیں کو دیکھا۔ "شکل تو دیکھ اپنی..." پھر وہ غصے اور بے چارگی کے ملے جلے احساس سے مجبور ہو کر ہنس دیا۔ "جا کیا یاد کرے گا... صاب کو دعائیں دے پاؤلی کے پتر..." اور پھر وہ زور سے ہنسا۔ "کیا ہوا؟... سینہ جل گیا؟" سب نے بھرپور قہقہے لگائے۔ میں نے ان کا ساتھ دیا۔ اب سائیں موسم بھی ہنسی میں شامل تھا۔ پھر بے ہنگم شور مچا۔ پیالے ہونٹوں سے چپک گئے۔ سائیں موسم نے بھی نعرہ لگا کر بھنگ کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا اور سبز پانی کی تلچھٹ تک پی گیا۔ پھر اس شور میں زور زور سے ڈکارنے کی آوازیں آئیں اور کئی الٹے سیدھے فقرے سنائی دیے۔ سائیں ملک اٹھا اور مرغے والی ہانڈی اٹھا لایا۔ ڈورو ماچھی کی پرات لے آیا۔ جابر شاہ نے بڑا سا لوہے کا چمچ ہوا میں لہرایا۔ دتہ میراثی پکوڑے اور روٹیاں اٹھا لایا۔ پکوڑے بھی

سائیں ملک نے بنائے تھے۔ پکوڑوں اور مرغے میں بھی سائیں ملک نے بھنگ کے سبز پتے پھینکے تھے۔ میں نے دونوں چیزیں لینے سے انکار کر دیا اور باجے کی پلیٹ اٹھالی۔ حلوے میں جابر شاہ نے دو تین سیر کھانڈ انڈیلی تھی۔ پہلے لقمے پر ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے منہ میں شیرے کا بڑا چمچ ڈال دیا ہے۔ میں نے ہاتھ ہٹا لیا۔

"کیوں؟" جابر شاہ نے پوچھا۔

"بس... ذرا جی نہیں چاہتا..." میں نے منہ بنایا۔ "میرے حلق میں جلن ہو رہی ہے۔"

جابر شاہ مسکرایا۔ "پانی پی لو... اوئے ڈورو! پانی لا... پانی پی لو... ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ ہنس دیا۔ پھر وہ سب حیوانوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ مرغے کی آخری ہڈی تک چبالی گئی۔ باجے کی پرات سے چپٹا ہوا گھی بھی انگلیوں سے چاٹ لیا گیا۔ میں نے اپنی پلیٹ سائیں موم کو دے دی، کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ پھر سب بہکنے لگے۔ دتے میراثی نے ڈھول اٹھایا اور گود میں رکھ لیا۔

"کڑک دھم دھم..." ڈھول کی آواز پر سب جھومنے لگے۔

پھر جابر شاہ نے ہاتھ اٹھایا۔ "شاہ فرمایا..." پھر جلدی سے گھبرا کر بولا، "نہیں، میرا مطلب ہے کہ..." وہ آگے کو جھکا اور پھر جھومتے ہوئے پوری آواز سے چیخا، "دمادم مست قلندر..." دتے میراثی نے ڈھول پر یہی مصرع دہرایا۔ جابر شاہ پھر چیخا۔ سب نے ساتھ دیا، ایک نہایت پرجوش انداز سے ہاتھ ہلائے گئے، گردنوں کو پیچھے کی طرف جھٹکے دیے گئے۔

"دمادم مست قلندر...
دمادم مست قلندر... حق...
دمادم مست قلندر... حق... دمادم..."

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میدان جنگ میں سپاہی کسی شدید خونی جذبے سے مجبور ہو کر وحشت ناک انداز سے چیخ رہے ہوں۔ ہاتھوں کے ہلانے کا انداز بھی وحشیانہ تھا جیسے کسی پر تلوار چلائی جا رہی ہو۔ جوش بڑھتا رہا، گیت بدلتے رہے۔ پھر سب سے پہلے سائیں موم پیچھے کو لڑھک گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ بھنگ کے سبز پانی کے قطرے اس کے ہونٹوں کے کناروں سے بہہ کر رخساروں کی ہڈیوں کے نیچے گڑھوں میں اتر گئے۔ وہ زمین پر چت لیٹا تھا۔ میں نے سائیں ملک سے کہا کہ اسے

Scanned with CamScanner

اندر چارپائی پر لٹا دینا چاہیے۔ سائیں ملک لڑکھڑا اٹھا۔ اس نے سائیں موسم کو کندھوں سے بری طرح پکڑا۔ میں نے سوکھی سوکھی ٹانگوں کو تھاما۔ سائیں جہاں لیٹا تھا وہاں اب تل چٹے رینگ رہے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے وہیں پڑا تھا، ساون کی اس لکڑی کی طرح جسے اٹھانے پر نیچے کیڑے رینگتے نظر آتے ہیں۔ ہم نے سائیں کو اندر کمرے میں اپنی بچھی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا۔

"کڑک دھم دھم..." دتہ میراثی جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ وہ پوری طاقت سے ڈھول پر ضربات لگا رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ گیتوں کی تانیں مرنے لگیں۔ سب ادھ موئے ہو کر گرنے لگے۔ دتہ میراثی گیت ختم ہونے سے بے خبر ڈھول پیٹتا رہا اور آخر وہ بھی چٹائی پر لڑھک گیا۔ میں خاموشی سے بنگلے کی سمت چل دیا۔ میں نے وقت دیکھا، تین بج رہے تھے۔ فضا میں خاموشی تھی۔ میرے کانوں میں دیر تک "کڑک دھم دھم" گونجتا رہا۔

بنگلے کے قریب پہنچتے پہنچتے میرا ذہن فضا کے زیر اثر بے حد ہلکا ہو گیا۔ خاردار جھاڑیوں میں ہوا کے نرم جھونکوں سے مدھم مدھم سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ فطرت کے فنکار کی لانبی انگلیاں اس اتو کے ستار پر مار کے دھیمے میٹھے سروں میں الاپ بجا رہی تھیں۔ سرمئی تما گدلے بادلوں کے نیچے پتھریلی زمین پر سائے سے محروم چھوٹے چھوٹے پھلاہی کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ اتنے خاموش جیسے سچ مچ کسی نے کچھ کہہ دیا ہو۔ سرمئی تاریکی میں پرندے بھی خاموش ہو گئے۔ بس ایک ٹیٹری تھی جو عجب شوخی سے حادہ زاویہ بنائے فضا میں اچھلتی چلی جا رہی تھی۔ "ٹی آؤں ٹی ایں... ٹی آؤں ٹی ایں... ٹی آؤں ٹی ایں..." جیسے خود سے کہہ رہی ہو۔ "میں جاؤں کہ نہیں... میں جاؤں کہ نہیں... میں جاؤں کہ نہیں..."

11

رات میں کھڑکی کے قریب پلنگ پر تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ باہر زوردار بارش ہو رہی تھی۔ ایک ہیجانی کیفیت کے تحت میری نیند غائب تھی۔ مجھے بار بار سائیں موسم کا خیال آ رہا تھا۔ کھڑکی کے چھجے پر بوندیں ٹپ ٹپ گر رہی تھیں۔

"صبح سائیں ڈھوک چھوڑ دے گا..." مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام ڈھوک کے رہنے

والے سائیں کے اس ارادے سے واقف ہو چکے ہیں۔ انھوں نے سائیں کو رسیوں میں جکڑ رکھا ہے اور اسے بری طرح پیٹ رہے ہیں۔ میں نے ذہن سے یہ پراگندہ خیالات جھٹکنے کی پوری کوشش کی، لیکن وہ سیلاب کی مانند امڈے چلے آتے تھے۔ باہر بارش کا زور بڑھ گیا۔ ہوا پاگلوں کی طرح لان کے جنگلے سے سر ٹکرا رہی تھی۔ ہوا کے زور سے بیرونی پھاٹک کھل گیا تھا اور بار بار جنگلے سے ٹکرا رہا تھا۔ زور سے بجلی چمکتی تو بوندوں کی بوچھاڑیں یوں چمکتیں جیسے آسمان پر کوئی سنگ مرمر کا پہاڑ پھٹ پڑا ہے اور تمام کائنات اس کی لپیٹ میں ہے۔ اچانک میں ایک شدید احساس کے ریلے کی لپیٹ میں آ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے لاتعداد روحیں فضا میں چیخ رہی ہیں۔ صداؤں میں شدت کا کرب ہے۔ مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے کسی کو میری ضرورت ہے، کوئی مجھے مدد کے لیے پکار رہا ہے۔

لیکن میں کیا کر سکتا ہوں... میں کسی کی خاطر کیا کر سکتا ہوں، کوئی سامنے نہیں... کوئی میرے سامنے زرد رو خون سے لتھڑا ہوا، زمین پر گرا، کراہتا نظر نہیں آتا۔ یہ ماتم ہواؤں کا ہے... یہ نوحے روحوں کے ہیں جو میری نگاہوں سے اوجھل ہیں... پھر بھی وہ چیخ چیخ کر مجھے بلا رہی ہیں... کیا میں ہواؤں کے پیچھے دوڑوں؟ کیا کسی چٹان پر خود کو دے ماروں... کیا کروں؟ کیا اپنی پوشاک پھاڑ دوں؟ کیا اپنے بال نوچ لوں؟... میں کیا کروں؟... میں مجبور ہوں... میں کچھ نہیں کر سکتا...

ایک اذیت دہ احساس نے مجھے اداسی کے گہرے پانیوں میں دھکیل دیا۔ کھڑکی کے شیشے پر بوندیں گرتی رہیں۔

رات بہت دیر سے سونے کے باوجود صبح میں بہت جلد اٹھ بیٹھا۔ سائیں موسم بری طرح میرے ذہن پر سوار تھا۔ جسم میں ہلکی ہلکی میٹھی سی تھکن محسوس ہو رہی تھی، جیسے خزاں کی اداس دھوپ میں، ہوا کے لطیف ٹھنڈے جھونکوں میں، لمبی لمبی خشک گھاس کے سرسرانے سے غنودگی طاری ہو جانے کے بعد محسوس ہوا کرتی ہے۔ ناشتے کے بعد میں ڈھوک پہنچا۔ سب سو رہے تھے۔ سائیں موسم غائب تھا۔ میں مسرت اور پریشانی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کہاں گیا ہوگا، اور میں کہاں جاؤں۔ میں ڈھوک سے نکلا۔ میں نے سائیں موسم کو دیکھا۔ وہ پپ جھاڑ کی گھنی جھاڑیوں سے کسی درندے کی طرح نکلا۔ مجھے دیکھ کر رک گیا۔ میں بھی کسی انجانے احساس سے مجبور ہو کر رک گیا۔ پھر ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔

"نہیں ہوگا..." سائیں زور سے چلایا۔ "یہ نہیں ہوگا۔"

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ "کیا نہیں ہوگا؟" میں چلایا۔

"میں ڈھوک نہیں چھوڑوں گا!" سائیں نے اعلان کیا۔

"کیوں... آخر... تم نے کہا تھا کہ..."

"ہاں کہا تھا... بے وقوف تھا۔" سائیں غرّایا۔ "اندھا تھا... رات میری آنکھیں کھل گئیں۔"

میں پاگلوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر آگے بڑھا۔ "صاب جی... آپ مجھے... ہاں مجھ سے یہ گناہ نہ ہوگا... آپ مجھے گناہ کا راستہ دکھا رہے تھے... رات بڑے باواجی نے یہی کہا تھا۔"

"بڑے باواجی۔" میں نے سوچا۔ "وہ تو مر چکے ہیں۔" پھر اچانک میں کچھ بجھ گیا۔

سائیں نے میرا بازو پکڑا۔ "رات خواب میں بڑے باواجی کا دیدار ہوا... وہ کہنے لگے کہ سائیں... سائیں... ہاں..." وہ کچھ سوچنے لگا۔ "ہاں، انھوں نے کہا کہ سائیں تیرے لیے دوزخ کے دروازے کھل چکے ہیں۔ تو پیر سرکار سے منہ موڑ رہا ہے... تجھ پر تو خدا کی لعنت ہو... یہ صاب جی خود بھی دوزخ میں جائے گا اور ساتھ تجھے بھی لے کر جائے گا... یہ تجھے گناہ کا راستہ دکھا رہا ہے... اور صاب جی، مجھے معاف کریں، میں توبہ کر چکا ہوں۔ میں دوزخ نہیں جاؤں گا، میں توبہ کر چکا ہوں۔ میں پیر سرکار... پیر سرکار..." وہ خاموش ہو گیا جیسے کوئی بڑا خیال ذہن میں آیا اور زبان مجبور ہو گئی۔ میں نے اسے کچھ نہ کہا، خاموشی سے ایک سمت چل دیا۔

پپ جھاڑ کی گھنی جھاڑیوں میں آڑے ترچھے چلتے ہوئے میری نگاہیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک جھاڑی کے نیچے نرم نم آلود زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کے نیچے سے بے شمار چھوٹے چھوٹے پروں والے چیونٹے نکل رہے تھے۔ وہ کچھ دیر چلتے، پھر اڑنے کی کوشش میں دو تین بار گرتے، پھر اڑ جاتے...

بارش سے بھیگے ہوئے تنے اور رات بھر ہوا کے جھونکوں اور غضب آلود تھپیڑوں سے ایک طرف جھکی ہوئی جھاڑیاں پتھریلی زمین پر گناہگاروں کی طرح نظر آ رہی تھیں جن کے سر اس زمین پر

Scanned with CamScanner

ہیں اور پاؤں پاتال کی نم آلود زمین پر باندھ دیے گئے ہیں۔ ہوا بند تھی اور زمین سے مخصوص بو بخارات کی طرح اٹھ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں زیرِ زمین کسی اندھے تاریک غار میں محبوس ہوں۔ سب حالات اس قدر سرعت سے پیش آئے کہ مجھے سوچنے کا موقع نہ ملا۔ میں صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکا۔ میں شکست کھا کر بھاگا۔ مجھ میں وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں ہار چکا تھا۔

میں نے سائیں موسم کے لاشعور کی دبی ہوئی خواہشات کو ابھارا، انھیں شعور میں لا کر سائیں کو ان سے آگہی دی۔ لیکن اسی جنگل میں ان گنت صدیوں کا، تجزیے ہوئے انسانی خون پر پلنے والا، عقیدت کا اندھا درندہ چھلاوے کی طرح کودتا رہا۔ احتساب کی چمک نے میرا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ میں نے اس آہنی فصیل پر کمند پھینکی تھی، ان اتھاہ گہرائیوں سے کسی کو اٹھایا تھا، ان تاریک کھنڈروں میں کسی کو تھاما تھا۔ دو چار ہاتھ کنارے کے پیچھے سب کچھ چھوٹ گیا۔ میں بے بس ہوں... انسانی ذہن اس آگ کے سامنے موم ہے۔

اپنی صورت حال کی المناکی پر میرے آنسو نکل آئے۔ احساس اتنا شدید تھا کہ رینگنے والے حشرات الارض نے بھی میری ہنسی اڑائی۔

ہر ناکامی کے بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے فطرت مجھ سے انتقام لے رہی ہے۔ میرا دل مجھے فطرت کے خلاف بغاوت پر اکساتا ہے۔ جب کوئی ایسی ہستی نظر نہیں آتی جسے الزام دیا جا سکے، جس سے الجھا جا سکے، تو میرا جی چاہتا ہے اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر فطرت کی ہر حسین شے سے لپٹ کر اسے جھلس دوں۔ جب ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے تو میری خواہش ہوتی ہے کہ... کوئی نظر آئے اور میں اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دوں۔ ہاتھ جوڑوں اور گڑگڑا کر کہوں: میں مانتا ہوں... میں ہر بات تسلیم کرتا ہوں... لیکن اس اذیت و تشدد سے نجات چاہتا ہوں... مجھے چھوڑ دو... مجھ سے انتقام نہ لو... میں ہاتھ جوڑتا ہوں... مجھے چھوڑ دو...

12

نہ جانے کتنے دن یونہی گزر گئے۔ سوچتے سوچتے میرا ذہن ماؤف ہو گیا۔ میں نے ڈھوک جانا چھوڑ دیا۔ جب شام کے سائے گہرے ہو جاتے تو ان سایوں پر ایک اور سایہ ہاتھ میں ڈنڈا

پکڑے، بغل میں کاسۂ گدائی لٹکائے، کوارٹرز کی طرف جاتا دیکھ کر مجھے بلکسر کی ہر شے سے نفرت چھلکتی ہوئی نظر آتی۔ ہر سمت جہنمی مخلوق اچھلتی کودتی نظر آتی۔ مجھے بلکسر کی ہر شے سے وحشت ہونے لگی۔ میں اپنے بھائی کے پاس کھوڑ چلا گیا۔ کھوڑ کی خشک چٹیل زمین اور خشک چٹانوں اور لمبی لمبی خشک گھاس پر خزاں کی روح رقص کرتی رہی۔ دھیمے دھیمے نشیلے جھونکے مجھے کسی ان دیکھی بستی کی کہانیاں سناتے رہے جہاں ہر انسان دوسرے کے لیے دل میں محبت کا عظیم جذبہ رکھتا ہے؛ جہاں نہ کوئی جماعت ہے نہ کوئی فرقہ... جہاں سب محبت کی مضبوط ڈور میں بندھے ہوئے ہیں؛ جہاں کوئی پیر نہیں، کوئی مرید نہیں؛ جہاں ایک دوسرے پر کیچڑ نہیں پھینکا جاتا، جہاں پگڑیاں نہیں اچھالی جاتیں، جہاں ڈاڑھیاں نہیں نوچی جاتیں؛ جہاں نہ مسجد ہے نہ امام باڑہ؛ جہاں کے خوبصورت کھلے کھیت مسجدیں بھی ہیں، مندر بھی، کعبہ بھی، شوالے بھی، کنشت بھی، کلیسا بھی؛ جہاں سب محبت کی عظیم طاقت کے سامنے سر جھکاتے ہیں؛ جہاں سے نفرت کے مکروہ عفریتوں کو نکال دیا گیا ہے؛ جہاں امن ہے، جہاں سکون ہے؛ جہاں جانے کے لیے میں بچپن سے تڑپ رہا ہوں؛ جو کہیں بھی نہیں اور ہر جگہ موجود ہے؛ جو ازل سے اس دنیا پر ہر جگہ بھرتی اور مٹتی رہی... میں جس کے دوبارہ اس خاک پر نمودار ہونے کا کب سے منتظر ہوں..

خزاں بھی گزر گئی۔ ماگھا اپنے جوبن پر تھا جب یہ خبر ملی کہ اباجی ریٹائر ہو گئے ہیں۔ میں بلکسر پہنچا۔ اتوار کا دن تھا۔ تڑکے ہی دو بڑے بڑے ٹرک بنگلے کے سامنے رکے اور مزدور انھیں سامان سے لادنے لگے۔ میں لان میں کھڑا تھا۔ کل سے یہ کسی اور کمپنی کے ملازم کے پاس ہو گا۔ مجھے وہ جگہ چھوڑتے ہوئے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے ملک بدر کیا جا رہا ہو۔

سردی شدید تھی۔ مری سے آنے والی برفانی ہوا نے صبح کو جما سا دیا تھا۔ میں نے اوورکوٹ کے کالر اٹھا لیے۔ سامنے کھلے کھیت دھند میں چھپے ہوئے تھے۔ دائیں ہاتھ پیچھے ہٹتا ہوا کہرا کا فوری تھا۔ دائیں ہاتھ سڑک پر دھند میں لپٹا ہوا کوئی بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ وہ سائیں موسم تھا۔ موٹا سا کمبل اوڑھے، منہ میں سگرٹ دبائے، وہ مال گاڑی کے انجن کی طرح پھک پھک کرتا آ رہا تھا۔ میرے قریب آ کر وہ رک گیا۔ آنکھ دبا کر وہ بڑبڑایا، پھر مسکرایا۔ "جا رہے ہیں؟" وہ بولا۔

"ہاں سائیں... جا رہا ہوں،" میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

Scanned with CamScanner

"پھر کب آئیں گے؟" سائیں نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا۔ اس کی آنکھ غیر معمولی طور پر چمکیلی نظر آ رہی تھی۔

"اب شاید... کبھی نہیں،" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"کیوں؟"

"ہم پکھیرو جو ٹھہرے!" میں نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

سائیں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ پھر بمشکل ایک سمت جھکا۔ جب وہ سیدھا ہوا تو اس کے ہاتھ میں لمبی ڈنڈی والا نرگس کا پھول تھا۔ وہ اسے ٹوٹی ہوئی انگلیوں سے لہراتا رہا۔ پھر اس نے دو تین بار اسے سونگھا۔ چند لمحے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر مسکرا کر آگے بڑھا۔ مجھے پھول دے کر وہ مڑا اور آہستہ آہستہ دھند کے پردے میں چھپ گیا۔

اس کے بعد آج تک میں نے سائیں کو کہیں سے نکلتے نہیں دیکھا۔

اس واقعے کو چار سال ہو چکے ہیں۔ چند دن ہوئے ایک پرانی فائل اٹھانے پر ایک سوکھا ہوا نرگس کا پھول نکل کر میرے پاؤں کے قریب گرا اور سوکھی لمبی ڈنڈی ٹوٹ گئی۔

❀❀

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں ایک نئے کہانی کار علی اکبر ناطق کی پانچ کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ ان کہانیوں کی خاص بات پنجاب کے دیہی اور قصباتی معاشرے کا گہرا مشاہدہ ہے۔ یہ ایسا موضوع نہیں جسے اس سے پہلے نہ برتا گیا ہو، لیکن اب عرصے سے اردو فکشن نے زمین پر زندگی میں مبتلا حقیقی انسانوں اور ان کی زندگی سے دلچسپی لینے کا شغل کم و بیش ترک کر دیا ہے اور اس کے بجائے اپنی توجہ تجرید کے آسمان اور اسلوب کے ایسے تجربوں پر مرکوز کر دی ہے جن میں نفسِ مضمون کی قلت محسوس ہوتی ہے۔ علی اکبر ناطق 1973 میں اوکاڑہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان 1947 کی ابتلا کا شکار ہو کر مشرقی پنجاب سے نقل مکانی کر کے آ بسا تھا۔ انھوں نے مزدوری کرتے ہوئے تعلیم کا حصول جاری رکھا اور ان کی کہانیوں میں ان کے تجربوں اور مشاہدوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ایک نومشق فکشن نگار کے طور پر انھیں ابھی اپنے مضمون اور ہیئت پر قابو حاصل کرنے کی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں، لیکن پنجاب کے دیہی معاشرے کی ساخت کے بارے میں ان کے مشاہدے کی باریکی ان کے سفر کی سمت کا پتا دیتی ہے۔

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

پگڑی باندھ لی

مجھے فیصلے پر اعتراض نہیں تھا لیکن یہ بات نہ جانے کیوں میری سمجھ میں نہ آئی کہ جہاں بھی جرم ہوتا یہ دونوں موقعے پر سب سے پہلے کیسے پہنچ جاتے۔ گاؤں میں ڈاکو آ گھستا تو یہ پیچھا کرتے۔ چوری ہو جاتی تو کھوجی کے ساتھ سارا سارا دن یہ خوار ہوتے۔ ایسا کئی دفعہ ہوا کہ گاؤں والوں کے برے بھلے میں کام آئے۔ لوگ تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے مگر جانے کیوں میں ان سے حسد کرتا۔ یہ جب بھی کوئی اچھا کام کرتے میں جل اٹھتا۔ شاید اس لیے کہ وہ میری بالکل عزت نہیں کرتے تھے۔ یا پھر میں شکی مزاج تھا کہ ہر بات میں کیڑے نکالتا۔

بہر حال گاؤں کے معززین اور سکول کے اساتذہ نے باہمی اتفاق سے فیصلے پر دستخط کر دیے، کیونکہ یہ گاؤں کی عزت کا معاملہ تھا۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے گاؤں کی لڑکی کے ساتھ دوسرے گاؤں کا کوئی لڑکا عشق لڑائے۔ لہٰذا اب وسیم کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ یہاں پر اپنی تعلیم جاری رکھ سکے، بلکہ وہ شکر کرے کہ اسے صرف مار پیٹ کر فارغ کر دیا گیا۔ گاؤں کے تمام لوگوں نے اس فیصلے کو آفرین کہا اور شیدے کو شاباش دی جس نے اپنے دوست فیکے گجر کے ساتھ مل کر رانو اور لونڈے وسیم کو گنے کے کھیت میں جا دبوچا تھا اور پکڑ کے پنچایت کے آگے کر دیا تھا۔

سکول سے فارغ کرنے کے علاوہ وسیم کے والدین کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ آئندہ اسے اس گاؤں کے حدود میں دیکھا گیا تو ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

باوجود اس کے کہ مجھے وسیم سے کوئی ہمدردی نہ تھی، پہلے کی طرح آج بھی ان کا یہ معرکہ اچھا نہ

Scanned with CamScanner

لگا۔ یہی حالت علوی کی تھی۔ علوی کا گھر بالکل میرے سامنے تھا۔ کوئی تیس کے پیٹے میں ہوگا۔ تعلیم اچھی خاصی تھی۔ عورت کی جنسیت پر بولنے کا اتنا چسکا کہ شاید کسی میں ہو۔ اس معاملے میں اس کی ہمدردیاں وسیم اور رانو کے ساتھ تھیں۔ شیدا اور فیکا مگر قابلِ نفرین تھے جنھوں نے بیچ کھیت کھنڈت ڈال دی۔

بہرحال کچھ دنوں میں یہ قضیہ آیا گیا ہوا اور معاملات معمول پر آ گئے۔

ہائی سکول ہمارے گھر سے سو قدم کی راہ پر تھا اور سکول کی عمارت گاؤں کی آخری نکڑ پر تھی، جس کے آگے کھیت کھلیان شروع ہو جاتے۔ شام ڈھلے گاؤں کے مضافات کی فضا انتہائی رومانوی ہو جاتی۔ پرندے اندھیرا چھا جانے سے پہلے اپنے گھروں کو جانے لگتے۔ جب وہ سکول کے میدان کے اوپر سے قطار اندر قطار اڑتے اور افق میں آہستہ آہستہ گم ہو جاتے تو انھیں دیکھنے میں بہت مزہ آتا۔ میں اور علوی روزانہ یہ نظارہ کرنے کے لیے سکول کے گیٹ کے آگے آ کر کھڑے ہو جاتے اور گھنٹوں کھڑے ادھر ادھر کی مارتے رہتے یہاں تک کہ عشا کی اذانیں بھی وہیں پر سنائی دیتیں اور ہمارا یہ عمل اتنا متواتر ہو گیا کہ اگر کسی دن وہاں کھڑے نہ ہو سکتے تو یوں محسوس ہوتا گویا اہم فرض قضا ہو گیا۔

گاؤں کی اکثر عورتیں جن کے گھروں میں رفعِ حاجت کا انتظام نہ تھا شام کے جھٹ پٹے میں ٹولیوں کی شکل میں کھیتوں کا رخ کرتیں۔ رانو واقعے کے بعد غالباً ایک ماہ کسی کو نظر نہ آئی حتیٰ کہ رفعِ حاجت کے لیے بھی باہر آتی جاتی ہم نے نہ دیکھی۔ پھر رفتہ رفتہ دیگر عورتوں کے ساتھ دیکھی جانے لگی۔ قریباً دو ماہ بعد تو یوں چلنے پھرنے لگی گویا کوئی واقعہ ہی نہ ہوا تھا۔

اس کا گھر ہماری گلی سے دوسری والی گلی میں تھا۔ شیدے اور فیکے کا گھر بھی اسی گلی میں تھا۔ بلکہ فیکا تو عین اس کے سامنے والے گھر میں رہتا تھا۔ اس کی بیٹھک کے آگے نیم کا سایہ دار پیڑ تھا جس کے نیچے چارپائی پڑی رہتی۔ اب شیدے اور فیکے کا اکثر وقت اسی چارپائی پر گزرتا اور خوب قہقہے اڑتے۔ دن گزرنے کے ساتھ قہقہے فقرے بازی میں بدل گئے اور گاؤں کے لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ یہاں تک کہ بات اب پڑوسیوں سے نکل کر دیگر لوگوں میں بھی چل گئی لیکن سامنے آ کر کوئی نہ ٹوکتا کہ دونوں جوان گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

ادھر رانو غضب کی خوبصورت تھی اور گھر میں کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ ایک بوڑھا باپ جو

Scanned with CamScanner

سارا دن بکریاں چراتا، شام تھکا ہارا سو جاتا، اور ماں کو مرے آٹھ سال ہوئے۔ چنانچہ کہاں تک بچتی، چند دنوں میں راہ پر آ گئی اور خفیہ اشارے ہونے لگے۔ پھر اشارے کھل کھیلنے میں تبدیل ہو گئے۔ مگر گاؤں میں ایسا کوئی بھونچال نہ آیا جس سے وہ محتاط رویہ اختیار کرتے۔ بلکہ رانو اب دونوں کے ساتھ بیچ بازار میں گپ مارتی اور کھلکھلا کر ہنستی۔ ایک دفعہ تو میں نے خود اسے شیدے سے بات کرتے دیکھا۔ بہت غصہ آیا اور میرا جی چاہا کہ اس کے خنجر گھونپ دوں۔ سارے گاؤں سے آنکھ لڑاتی مگر ان سے دور رہتی۔ جب میں نے یہ بات علوی کو بتائی تو اس نے بھی بے حیا کو بہت کوسا۔ کہنے لگا: "دیکھ بھائی، عورت حیا میں رہے تو رہے، ورنہ یوں عقل سے جاتی ہے۔" خیر اس کے بعد ہم نے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا۔ شاید ہمارے پاس گفتگو کو اور بہت سے موضوع تھے، یا ویسے ہی وہ ہمارے خیال میں نہ آئی، حتیٰ کہ مہینے گزر گئے۔

ایک دن ہم سکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے اور معمول کے مطابق ہمیں کھڑے کھڑے رات دس بج گئے۔ گاؤں میں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب پچانوے فیصد دیہاتی سوئے ہوتے ہیں۔ اچانک ہمارے پاس سے تین آدمی گزرے جن میں دو کو ہم نے بخوبی پہچان لیا۔ ایک شیدا اور دوسرا فیکا تھا۔ لیکن تیسرا آدمی جس کے سر پر پگڑی بندھی تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی تھی۔ قد دونوں سے چھوٹا تھا۔ باوجودیکہ چاندنی رات تھی لیکن ہماری پہچان میں نہ آیا۔ میں تو نظر انداز کر دیتا لیکن علوی کی متجسس آنکھیں بھانپ گئیں کہ ہو نہ ہو پگڑی والا مشکوک ہے۔ کہنے لگا: "آؤ ان کا پیچھا کریں۔" اس وقت میری طبیعت بھی مہم جوئی پر آمادہ تھی، لہٰذا ہم نے انتہائی احتیاط سے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ انھیں محتاط فاصلے پر رکھتے فصلوں اور درختوں کی اوٹ سے تعاقب کرتے رہے۔ ہمیں ان کی باتیں سنائی نہ دیتی تھیں لیکن مبہم آوازیں ضرور آتیں جنھیں ہم نہ سمجھ سکتے تھے۔

اب ہم گاؤں سے قریب قریب دو کلومیٹر باہر آ گئے تھے اور سخت حیران تھے کہ گاؤں سے اتنا باہر آ جانے کے بعد بھی وہ کوئی عملی کارروائی نہیں کرتے بلکہ آگے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہم اکتا کر مڑنے ہی والے تھے کہ شیدا اور فیکا رک گئے اور تالے کی پگڈنڈی پر بیٹھ گئے جبکہ پگڑی والا کھڑا رہا۔ کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے جنھیں دور ہونے کی بنا پر ہم نہ سن سکے۔ پھر شیدے یا شاید فیکے نے اس کا بازو پکڑ کے کھینچا، جس پر اس نے مزاحمت کی اور اس کی پگڑی کھل گئی۔ ہمارا شک یقین میں بدل گیا۔

لمبے بال اور روشن چہرہ نظر آ رہا تھا۔ جب دونوں نے زبردستی پکڑنے کی کوشش کی تو رانو نے چیخ ماری جس پر گھبرا کر دونوں نے چھوڑ دیا۔ پگڑی دوبارہ باندھ دی گئی اور پھر تینوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ اب ہماری حیرانی دو چند ہو گئی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اگر آمادہ نہیں تو گھر سے ساتھ آئی ہی کیوں؟ مگر زیادہ رہمیں اپنی اشتیاق انگیز نگاہوں کی ناکامی پر افسوس تھا جو ابھی تک کچھ نہ دیکھ سکیں۔ خیر تجسس ہمیں ان کا پیچھا کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دوسرے گاؤں کی حدود میں داخل ہو گئے۔ جب پڑوسی گاؤں قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر رہ گیا تو تینوں پھر رک گئے۔ میں اور علوی ایک جھاڑی کی اوٹ لے کر ان سے کوئی بیس قدم پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد رانو اور شیدا تو وہیں بیٹھ گئے جبکہ فیکا آگے گاؤں کی طرف بڑھ گیا۔

فیکے کے جانے کے بعد شیدے نے دوبارہ رانو کے ساتھ ہاتھا پائی شروع کر دی جس پر رانو نے پھر سخت مزاحمت کی اور شیدے کو نزدیک نہ آنے دیا۔ اب ہمیں رانو پر غصہ آنے لگا کہ یہ کیا چاہتی ہے، اور شیدے پر اس سے زیادہ کہ نکما ہے، زبردستی کیوں نہیں کر لیتا۔ بہر حال ہمارا تجسس اور حیرانی بڑھ گئی تھی۔ شیدا اور رانو سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی آدھ گھنٹہ بعد (جس دوران مجھے اور علوی کو بہت کوفت ہوتی رہی کہ ناحق پیچھا کیا) فیکا واپس آ گیا اور ہم یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے کہ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا، جسے ہم نہ پہچان پائے۔ بہر حال ہم سکون سے دیکھتے رہے کہ رانو (جس نے پگڑی اب اتار دی تھی اور اسے شیدے نے سر پر باندھ لیا تھا) اور وہ نیا آدمی قریب کے خشک نالے میں چلے گئے۔ شیدا اور فیکا باہر ہی بیٹھے رہے۔ کوئی نصف گھنٹہ بعد وہ دونوں باہر آ گئے اور نیا شخص اپنے گاؤں کو مڑ گیا۔ اس کے جانے کے بعد شیدے نے رانو کو پکڑ لیا مگر اب اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اور شیدے کے بعد فیکا؟ میں اور علوی اپنے گھر کی طرف چلے آئے لیکن سارا رستہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے چلے آئے کہ یہ اجنبی آدمی کون تھا۔ بہت غور کیا لیکن ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھ ہم نہیں سکتے تھے کہ وہ دونوں گاؤں کے چودھریوں میں سے تھے۔

❀❀

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

نرینہ اولاد

"بابا کانا نیم چیں، بابا کانا نیم چیں!" کے آوازے کستے ہوئے ہم اس سے دور بھاگ جاتے۔ وہ ہمارے پیچھے گالیاں دیتا ہوا کچھ فاصلے تک بھاگتا، پھر کوئی پتھر اٹھا کر پورے زور سے ہماری طرف پھینک دیتا جو کافی پیچھے رہ جاتا۔ ہم اس کی سخت مزاجی کو جانتے تھے لہٰذا ہمیشہ اس پر اس وقت آوازہ کستے جب ہمیں اطمینان ہوتا کہ پکڑے نہ جا سکیں گے یا اس کے پتھر کی زد سے دور ہیں گے۔

گاؤں کے بچوں کو اس سے کچھ زیادہ ہی چڑ تھی۔ کوئی بچہ ہی ایسا ہوگا جو اس سے مذاق کر کے نہ بھاگتا ہو۔ گاؤں کا یہ واحد نائی تھا جس کی بچوں کے ساتھ یوں کھلے بندوں دشمنی چلی آتی تھی۔ بچے، جن میں میں خود بھی شامل تھا، نہ صرف اس پر آوازے کستے بلکہ شدید نفرت بھی کرتے۔

اس کی ایک آنکھ کانی تھی۔ ایک ٹانگ سے لنگڑا کر چلتا اور ہر قدم کے ساتھ ساٹھ درجے کے زاویے تک دائیں طرف کو جھک جاتا۔ پاؤں میں ٹائر کے بنے ہوئے جوتوں کے سوا میں نے کوئی جوتا نہیں دیکھا۔ شکل انتہائی کریہہ جسے دیکھنے والے کو گھن آتی۔ جہاں سے گزرتا، بدبو اور تعفن پھیلاتا جاتا۔ شاید عید بقرعید نہاتا ہو، لیکن اکثر یہی کہتا سنا گیا کہ جو بندہ نہانے کے لیے سوا کلو پانی سے زیادہ استعمال کرے گا وہ خدا کا عذاب اٹھائے گا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ اس کی ایک لنگی اور ایک ہی کرتا تھا۔ گرمیوں میں جب وہ اپنی چارپائی باہر کھلی فضا میں رکھ کر سوتا تو وہی لنگی کمر سے کھول کر اوپر لے لیتا تاکہ مچھروں سے بچا رہے۔ گاؤں کے اکثر لوگوں نے اسے اس بات پر ٹوکا بھی، مگر وہ اپنی دھن کا پکا تھا۔ نا نیا کپڑا لینے یا پرانے کو اتار کر دھونے کے جھنجھٹ میں وہ کبھی نہیں پڑا۔ کپڑے

Scanned with CamScanner

دھونا تو دور کی بات، اس نے اپنے چائے اور ہانڈی روٹی کے برتن بھی شاید ہی کبھی دھوئے ہوں، جو اس واحد جھونپڑی میں کھلے پڑے رہتے تھے جس کے آگے نہ کوئی صحن تھا، نہ صحن کی دیوار۔ صبح چائے بناتے ہوئے راہ چلتوں کو نہ کبھی اس نے چائے کی دعوت دی اور نہ ہی کسی نے شریک ہونے کی خواہش کی۔ چائے پی کر اپنے اوزاروں کی پوٹلی کھولتا اور نو بجے تک وہیں بیٹھا دیوار کے سائے میں لوگوں کی حجامت بناتا جو اس کے دروازے پر چل کر آتے۔ اگر کوئی چائے پینے کے دوران آ جاتا تو ایسے فقیرانہ استغنا برتتا کہ آدمی رشک سے مر جائے۔ بال کترتے وقت زبان قینچی سے زیادہ چلاتا، اس لیے کہ سالوں بعد اگر کبھی موج میں آتا تو قینچی کا منھ لگوا لیتا۔ اس سے بھی بری حالت ٹنڈ کرنے والی مشین کی تھی جس سے بچے تو بچے بڑوں کے بھی پسینے چھوٹ جاتے۔ بال کاٹنے سے زیادہ کھینچتی تھی۔ اس کے باوجود ہمارا سارا محلہ، جس میں قریب قریب دو سو گھر ہوں گے، سب کے سب اسی سے بال کٹواتے کیونکہ ایک تو اس کا معاوضہ بہت کم تھا اور دوسرا بال کاٹنے یا یوں کہیں ٹنڈیں کرنے عین وقت پر آ جاتا۔ ہر گھر میں ٹنڈیں کرنے کی تاریخ اسے ہمیشہ یاد رہتی۔ بعض گھرانوں کی ٹنڈیں تو وہ بغیر معاوضے کے ہی، یعنی صرف روٹی اور چائے پر ہی کر دیتا۔ یوں اس کا زیادہ تر کام بارٹر سسٹم کے مطابق چلتا۔ بالوں کو بناتے ہوئے معتوب کا مشورہ سننا اپنی شان کے خلاف سمجھتا۔ فوراً دھکا دے کر پرے کر دیتا اور اپنی مشین تھیلی میں ڈال دیتا۔ لہٰذا ادھ خطے کو اپنے مشاورتی الفاظ اسی وقت واپس لینا پڑتے۔

میرے ساتھ اس کی دشمنی اس وقت شروع ہوئی جب میں نے اس سے ٹنڈ کروانے سے انکار کر دیا جو میرے باپ کو بہت برا لگا۔ اس نے چھڑیوں سے مار مار کر مجھے کالا نیم چیں کے آگے کر دیا۔ اس دن ظالم نے میرے بال مشین کے ساتھ اتنے اکھیڑے کہ میرے سر کی جلد سوج گئی۔ میں کئی گھنٹے روتا رہا اور رات سوتے وقت کالے نیم چیں کے حق میں خلوصِ دل سے بددعائیں کیں کہ یااللہ صبح یہ زندہ نہ اٹھے۔ مگر وہ یونہی زندہ رہ کر میرے سینے پر مونگ دلتا رہا۔ مجھے ٹنڈ کرانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر کالے سے ٹنڈ کرانے میں قباحت یہ تھی کہ لوگ اور لڑکے پہچان جاتے کہ کالے نیم چیں کے ہاتھ لگے ہیں۔ یہی بات میرے لیے پریشانی کا باعث تھی۔ اس نے اپنا ایک طبی فلسفہ خاص کر ہر والدین کو ازبر کرا دیا تھا کہ ٹنڈ کرائے رکھنے سے بچہ صحت مند رہتا ہے، خاص کر گردن موٹی رہتی

ہے۔

اس کی ایک خصوصیت بہر حال، باوجود اس کے کہ مجھے اس سے شدید نفرت تھی، میں تسلیم کرتا ہوں۔ وہ بغیر گھڑی کے بالکل صحیح وقت بتاتا۔ صرف سورج کو دو تین بار دیکھتا اور اپنا فیصلہ سنا دیتا کہ کتنے بجے ہیں۔ غالباً پانچ سات منٹ سے زیادہ فرق نہ نکلتا۔ مگر یہی خصوصیت بچوں نے اس کی چھیڑ بنا دی۔ رفتہ رفتہ یہ چھیڑ اتنی زیادہ بن گئی کہ کوئی وقت بھی پوچھ لیتا تو یہ اینٹ اٹھا لیتا اور گالیاں دیتے دیتے گاؤں سے چلے جانے کی دھمکی بھی دے دیتا کہ میرے بعد تمھارے بال کوئی نہیں کاٹے گا، پھر سکھ بن جاؤ گے۔

میرے والد نے اکثر اسے کریدنے کی کوشش کی۔ "میاں شرفو (اصل نام شریف تھا)، آخر تمھارے کہیں بیوی بچے بھی ہوں گے، کوئی اصلی وطن ہوگا۔ کچھ تو خبر کرو۔ کل کلاں خدانہ کرے ایسی ویسی کوئی بات ہوگئی، پھر ہم کس کا منہ دیکھیں گے۔"

"منہ کس کا دیکھنا ہے؟ اگر دفنا نہ سکو تو آگ لگا دینا۔" شرفو نے بگڑ کر جواب دیا۔ لہٰذا مزید پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

مجھے انتہائی خوشی اس بات کی ہوتی کہ شادی غمی میں کانے تیم میں سے کوئی بھی دیگیں نہ پکواتا، نہ کوئی برتن دھلواتا۔ پھر بھی ایسا کمینہ تھا، خود بخود چلا آتا اور نائیوں کو مشورے دینے شروع کر دیتا، نمک یہ ڈالو، مرچ فلاں ڈالو، گھی کم ڈالو، وغیرہ وغیرہ۔ مگر نائی بھی اپنی ہی کرتے، فقط اس سے پیاز کٹوا لیتے۔

چونکہ شرفو کی جھونپڑی ہمارے گھر سے کوئی بیس قدم پر ہوگی، لہٰذا اکثر تاکا کرتا۔ مجھے نہیں پتا کہ جب وہ بیمار ہوتا تو اس کی دیکھ بھال کون کرتا تھا۔ ہم نے یا اس کے پڑوس میں دو ایک گھر جو اور تھے انھوں نے تو کبھی نہیں کی۔ کوئی بال کٹوانے جاتا اور وہ کہہ دیتا کہ میں بخار میں ہوں یا سر درد ہے تو اس کا جواب سن کر واپس لوٹ آتا، یہ سوچے بغیر کہ اب اس کے دوا دارو کا ذمے دار کون ہے۔ خیر، مجھے ان چیزوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری اور دوسرے کئی بچوں کی خوشی تو اسی میں تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے یہ مر جائے تاکہ ہماری ٹنڈوں سے جان چھٹے۔

رفتہ رفتہ ہم بڑے ہوتے گئے۔ وہ بوڑھا ہوتا گیا اب وہ ہماری مرضی کے بغیر ہماری ٹنڈیں

نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اسے نزدیک سے بھی آ کر چھیڑ سکتے تھے۔ آوارہ کہنے کے ساتھ ساتھ پیچھے سے آ کر دھکا بھی دے دیتے اور بھاگ جاتے کیونکہ اب ایک تو وہ بھاگ نہیں سکتا تھا، دوسرا یہ کہ پتھر اٹھا کر ہمارے پیچھے پھینکنا بھی اب اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ بس گالیاں دیتا رہ جاتا جن سے ہم مزید لطف اندوز ہوتے۔

ہمارے گھر سے چالیس قدم مغرب کی طرف ہائی سکول تھا جس میں شیشم، شہتوت اور نیم کے بے تحاشا درخت تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ گرمی سے بچنے کے لیے اپنی چار پائیاں دوپہر کو وہیں لے آتے کیونکہ تین ماہ سکول بند رہتا۔ کانے نیم چیں کا بھی سارا دن اب وہیں گزرتا۔ وہیں حجامتیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ کانے نیم چیں کے آوازے بھی وہیں کسے جاتے، جس پر بہت ہنگامہ آرائی اور شغل رہتا۔ بعض اوقات گالیاں دیتے دیتے اسے کھانسی کا دورہ بھی پڑتا جس میں اسے کافی تکلیف ہوتی اور سانس ٹوٹنے لگ جاتا۔

سکول کھلتے ہی لوگ بکھر گئے۔ کانا نیم چیں اب بیمار رہنے لگا تھا۔ سر مونڈنا بھی کم کر دیے۔ لوگ مذاق کرنا بھی چھوڑ گئے کیونکہ اس نے گالیاں دینا بند کر دیں تھیں، فقط غصے سے دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیتا۔ یہاں تک کہ اب بچوں کے مذاق کو بھی سہہ جاتا۔ لیکن بچے باز آنے والے کب تھے جب دیکھتے کہ ہمارے آوازہ کسنے اور دھکا دینے پر بھی چپ رہا تو دور سے کنکر اٹھا کر مارنے شروع کر دیے۔ ادھر یہ کچھ دن تو گزارا کرتا رہا، آخر تنگ آ کر اپنی جھونپڑی میں ہی بیٹھ رہا، بازار میں آنا جانا چھوڑ دیا۔

اب کوئی اکا دکا اس سے حجامت کروانے جاتا ورنہ اکثر لوگوں نے دوسرے نائیوں کی طرف رجوع کر لیا۔ سردیاں آئیں تو چار پائی پھر جھونپڑی میں چلی گئی۔

صبح کے وقت میں ادھر سے گزرتا۔ اب میں نے کبھی اسے چائے بناتے اور پیتے نہیں دیکھا۔ شاید ناشتہ ترک کر دیا تھا۔ البتہ حجامت کرنے کا سلسلہ ابھی جاری تھا۔ ایک دن میں صبح اپنے سکول جا رہا تھا کہ کچھ لوگ کانے نیم چیں کی جھونپڑی کے گرد کھڑے نظر آئے۔ میں بھی پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر کہا: "یار، دروازہ توڑ کر تو دیکھو۔" دوسرے نے تائید کی۔

دروازہ توڑا گیا تو عین توقع کے مطابق میم چیں مردہ پڑا ہوا تھا۔ انتہائی گندی رضائی جو سینے تک اوڑھی ہوئی تھی اور منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ منہ اور آنکھیں کھلی تھیں۔ چہرہ نہایت خوفناک ہو گیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ آج مجھے اس کے مرنے کی ذرہ برابر خوشی نہ ہوئی، اور شاید کوئی غم بھی نہیں تھا۔ جھونپڑے میں ایک لوہے کا صندوق، اوزاروں کی گٹھلی اور واحد چارپائی جس پر اس کی لاش پڑی تھی، ان کے سوا مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی۔

خیرو مصلّی بلوائے گئے جنھوں نے اسے نہلایا۔ ایک آدمی نے کفن دے دیا اور شام سے پہلے ہی جنازہ کروا کر اسے دفنا دیا۔ زندگی میں شاید یہ واحد جنازہ تھا جس میں میں نے کسی کو روتے یا آنسو بہاتے نہیں دیکھا۔ اتنی خاموشی سے دفن کر دیا گیا جیسے کوئی مرا ہی نہیں۔ چوتھے دن ایک ادھیڑ عمر شخص آیا جس نے اپنے آپ کو شرفو میم چیں کا بیٹا بتایا۔ لوگوں نے فوراً یقین کر لیا کیونکہ اس کی شکل شرفو سے ملتی جلتی تھی۔ انھوں نے اسے شرفو کی قبر بتائی۔

اگلے دن میں میم چیں کی جھونپڑی کے پاس سے گزرا تو وہی شخص وہاں کھڑا تھا جس کے ساتھ ایک گدھی ریڑھی تھی۔ وہ میم چیں کا بستر، چارپائی، اوزاروں کی گٹھلی اور صندوق ریڑھی پر رکھ چکا تھا اور دروازہ اکھیڑ رہا تھا تاکہ یہ سامان اپنے ساتھ لے جائے۔ آخر وہ میم چیں کا بیٹا تھا، لہٰذا ترکے کا وارث اس کے سوا کون ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ اس کی واحد نرینہ اولاد ہے۔

❁ ❁

علی اکبر ناطق

اچھو بازی گر

"اگر میرا باپ بھی بازی گر ہوتا تو پھر دیکھتا کہ اچھو کیسے جیت جاتا۔ اس کو چھلانگ لگانے کے سارے گر اس کے باپ نے بتائے ہیں۔ تمھیں پتا ہے؟ نورو بازی گر دن رات اسے ورزش کرواتا ہے۔" میں نے یہ بات اپنی خفت مٹانے کے لیے اور اپنے جگری یار محانے کو تسلی دینے کے لیے کی جو میری ہی طرح نرم و نازک اور خوبصورت تھا۔ اس کو میری شکست کا واقعی دکھ تھا۔

"چھلانگ میں جیت گیا تو کیا ہوا؟" محانے نے کہا، "کلاس میں نمبر تو ہمارے ہی زیادہ آتے ہیں۔"

"پرسوں دیکھا، ماسٹر اشرف نے کیا کہا تھا؟ اچھو، تُو صرف چھلانگیں ہی لگا سکتا ہے۔ پڑھنا تیرے بس کا روگ نہیں۔" میں نے محانے کی بات کی مزید وضاحت کی۔

اتنا کہہ کر ہم نے دل کا غبار تو نکال لیا، مگر مجھے معلوم تھا کہ میں تو کیا محانا بھی اندر سے مطمئن نہیں تھا۔

پھر ایک دن جب ہیڈ ماسٹر نے اچھو بازی گر کو قلابازیاں لگانے پر پچاس روپے اور تھپکی دی تو ہم اور بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ کیسے اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا۔ اس کے باپ کو سکول میں بلا کر اچھو کی کھیلوں میں بہتر کارکردگی پر مبارکباد دی۔ خدا جانتا ہے کہ وہ دن میرے حسد اور رشک کی انتہا کا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے شکوہ کیا کہ اس نے ہمیں کیوں نہ بازی گر بنایا۔

اُس دن نورو بازی گر نے خوشی سے وہ ڈھول بجایا کہ کان پھٹنے لگے۔ کلاس کے تمام لڑکے،

سوائے میرے اور صمانے کے، اچھو کی ہی تعریفیں کرتے رہے۔

سکول میں وقفۂ تفریح کے دوران اکثر فٹ بال کے میچ کھیلے جاتے۔ اس کے لیے جب کھلاڑیوں کی دو طرفہ تقسیم ہوتی تو ہر فریق اچھو کو اپنی ٹیم میں رکھنے کی خواہش کرتا۔ حتیٰ کہ اس کے لیے ٹاس کی جاتی۔ جبکہ ہم دونوں نے کھیلنا ہی چھوڑ دیا کیونکہ کھیل کے دوران کوئی ہمیں کبھی مارتا اور کوئی ٹانگ اڑا کر گرا دیتا۔ خاص کر اچھو کے تو سامنے آتے ہماری جان جاتی۔ رفتہ رفتہ پوری کلاس میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ ایک طرف میں اور صما تا اور دوسری طرف اچھو اور ساری کلاس۔ اگر شہر ہمارے گاؤں سے زیادہ فاصلے پر نہ ہوتا، یا گاؤں میں کوئی اور سکول ہوتا، تو ہم یقیناً وہ سکول چھوڑ دیتے مگر اب مجبوری تھی۔ ادھر روز بروز اچھو کی بدمعاشیاں بڑھتی گئیں۔ اس کے دو ہی کام رہ گئے تھے، لمبی لمبی چھلانگیں لگاتا اور ہم دونوں کو تنگ کرتا۔ اس پر ستم یہ کہ سے کلاس کا مانیٹر بھی بنا دیا گیا۔ اب ہماری جان اور شکنجے میں آ گئی۔ اساتذہ کو شکایت کرنے کی ہمت بھی نہ رہی کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اور زیادہ تنگ کرتا۔

ایک دن استاد کی غیر موجودگی میں میں اور صما تا کلیلہ و دمنہ کی کہانی پڑھ رہے تھے، دوسرے لڑکے اچھل کود اور دھینگا مشتی میں مصروف تھے، کہ اچانک اچھو اور اس کے چار پانچ چیلے ہم پر ٹوٹ پڑے اور زبردستی ہمارا منہ چومنے لگے۔ میرے ہاتھ میں ایک نوکیلی پنسل تھی۔ میں نے غصے میں آ کر زور سے وہی اچھو کے پیٹ میں چبھو دی۔ صما نے ایک لڑکے کو دانتوں سے کاٹ لیا۔ نتیجتاً انھوں نے ہماری خوب دھلائی کی۔ جب ہم رونے لگے تو ہمیں چھوڑ دیا۔

دوسرے دن میں نے ماسٹر جی سے شکایت کی۔ ماسٹر نے اچھو کو بلایا تو اس نے کہا، ''استاد جی، یہ جھوٹ بولتا ہے، بلکہ اس نے مجھے بازی گر بھی کہا تھا۔ اس پر بھی میں نے اسے کچھ نہیں کہا، چاہے ساری کلاس سے پوچھ لیں۔'' جب کلاس سے پوچھا گیا تو انھوں نے ہمارے خلاف گواہی دے دی۔ لہٰذا ماسٹر نے الٹا ہمیں کو ڈانٹا۔

اس دن سے ہم اور زیادہ سہم گئے اور حیران ہوئے کہ بازی گر کہنے پر یہ آخر کیوں بگڑا! اسے تو فخر کرنا چاہیے تھا۔ پوری کلاس سے ہماری بول چال ختم ہو گئی۔ اچھو کی شہ پر لڑکے ہم پر طرح طرح کے آوازے کستے۔ اس پر غضب یہ کہ استاد نے مجھے بلبل اور صما نے کو مینا کا نام دے رکھا تھا۔ لڑکے

Scanned with CamScanner

بھی تقلید میں ہمیں انہی ناموں سے پکارتے۔ ہمارے لیے سال کے وہی دن خوشی کے ہوتے جو ہمارے امتحان کے دن ہوتے کیونکہ امتحان مارچ میں ہوتا جب بہار زوروں پر ہوتی۔ دیہات میں ہر طرف سرسبز کھلیان، پھول، اڑتے ہوئے بھورا اور چہکتے پرندے دھوم مچاتے۔ سارا سکول گیندے اور گلاب کے پھولوں سے مہک اٹھتا۔ ہرے ہرے درخت کونپلیں نکالتے اور ہلکی ہوا سے اِدھر اُدھر جھومتے تو دل میں ایک ٹھنڈک اتر جاتی۔ اس وقت ہم سوچتے کہ اب بدلہ لینے کے دن ہیں۔ لہٰذا 31 مارچ کا دن ہم دونوں کی کامیابی کا دن ہوتا۔ رزلٹ بولا جاتا تو ہمیشہ ہم فرسٹ سیکنڈ آتے۔ گیندے اور گلاب کے ہار استاد کے گلے میں پہناتے اور کچھ ہدیہ بھی ضرور دیتے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات پر تھوڑی سی تکلیف بھی ہوتی کہ استاد اچھو اور اس کے چیلوں کو بھی پاس کر دیتا جس کی ہم بالکل توقع نہ کرتے۔

میرا گھر سکول کے ساتھ پڑتا، اس لیے ھانا چھٹی کے وقت میرے گھر ہی پناہ لیتا۔ جب تمام لڑکے گزر جاتے تب وہ اپنے گھر جاتا کہ لڑکوں کے شر سے محفوظ رہے۔ اس کا گھر گاؤں کے مرکز میں تھا۔

رفتہ رفتہ اچھو نے پڑھنا بالکل ترک کر دیا لیکن استاد اسے اگلی کلاس میں ترقی دیتے رہے، کیونکہ سالانہ کھیلوں کے ٹورنامنٹ میں وہ سکول کے لیے عزت کا باعث بنتا، اس لیے کہ کبڈی اور فٹ بال میں اس کا دور دور تک ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ کھیل کے میدان میں رہتا اور اساتذہ نے بھی کبھی اسے پڑھنے کو نہیں کہا۔ نہ ہی اس نے خود توجہ دی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ وہ پاس ہو جائے گا۔

آٹھویں کلاس کے بعد اچھو نے اپنے کرتب اور قلابازیوں کا میدان اور وسیع کر لیا۔ اپنے باپ کے ساتھ دوسرے گاؤں میں جا کر میلوں ٹھیلوں میں کرتب دکھانے لگا اور سکول سے اکثر غیر حاضر رہتا، لیکن اساتذہ نے حاضری رجسٹر سے اس کا نام خارج نہ کیا اور نہ ہی غیر حاضری پر کبھی باز پرس کی۔ اساتذہ کی اس پردہ پوشی پر میں اور ھانا ضرور کڑھتے کہ آخر استاد اس کو سزا کیوں نہیں دیتے یا پھر اس کا نام کیوں خارج نہیں کرتے۔

جس دن وہ سکول نہ آتا ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ یوں لگتا جیسے آج ہم نے کھل کر سانس لی ہے۔ نویں کلاس میں پہنچے تو اچھو اور زیادہ اپنے کام میں پروفیشنل ہو گیا۔ اب اس نے ہمیں بھی تنگ

Scanned with CamScanner

کرنا کم کر دیا۔ بلکہ اب تو ہمیں اس کے لہجے میں نرمی محسوس ہونے لگی۔ ہفتے میں ایک آدھ دن سکول آتا۔ رفتہ رفتہ دوسرے لڑکے بھی ہمارے ساتھ دوستانہ رویہ اختیار کرتے گئے۔ نویں کلاس کے آخری دنوں میں تو وہ ہماری عزت بھی کرنے لگا۔ یہ بات اگرچہ ہمارے لیے حیرت کا باعث تھی لیکن ہم نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ البتہ اتنا ہوا کہ ہمارے دل میں اچھو کے خلاف جو کدورت تھی وہ بھی آہستہ آہستہ ڈھل گئی۔ اس سال اس نے سکول کے ٹورنامنٹ میں بہت اچھی کارکردگی دکھائی۔ پہلی دفعہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر میں نے اور مھانے نے بھی اس کی شان میں نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔ اس سال اچھو سکول سے اکثر غائب رہا اور جب دسویں کا بورڈ کی طرف سے امتحان ہوا تو وہ دوسرے کئی لڑکوں کے ساتھ فیل ہو گیا، لیکن ہم دونوں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور کالج میں داخلہ لے لیا۔

اچھو نے تعلیم بالکل چھوڑ دی اور مکمل طور پر اپنے آبائی کام کو اپنا لیا۔ اب وہ ڈھول بھی بڑے عمدہ طریقے سے بجا لیتا تھا اور اس نے نورو بازی گر کی جگہ لے لی۔ نورو کا کام بس ہلا شیری کرنا رہ گیا، باقی سب کچھ اچھو نے سنبھال لیا۔

مھانے کے والدین گاؤں چھوڑ کر شہر جا بسے اور مھانا بھی ان کے ساتھ شہر رہنے لگا۔ البتہ کالج میں ہم روزانہ ملتے۔ حتیٰ کہ مھانے نے بی اے کر لیا اور شہر کے ایک سکول میں ٹیچر ہو گیا۔ اس عرصے میں ہم نے اچھو کے متعلق کبھی بات نہ کی اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اب میٹرک کیے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ میں نے ایم اے کر لیا تھا۔ گاؤں میں آتے جاتے اچھو سے ٹاکرا ہوتا تو وہ ماتھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے سلام بھی کرتا۔ میں سلام کا جواب تو دیتا لیکن اس سے زیادہ کھلتا نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ زمانہ بہت آگے نکل گیا۔ اب بچے بازی گروں کے تماشوں کی بجائے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے لطف لینے لگے۔ لوگوں نے بازی گروں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی کیونکہ وہ ہالی ڈڈ کے بہترین ایکشن دیکھ سکتے تھے۔ اس ماحول میں کوئی اچھو کی قلابازیوں پر کیا دھیان دیتا لہٰذا اب وہ بیاہ شادیوں میں ڈھول بجا کر اپنا وقت بہلانے لگا۔ گاؤں میں سالانہ بازی بھی لگاتا جس سے اس کا سال بھر کا خرچہ نکل آتا۔ یہ بازی تو اب ایک بہانہ رہ گئی تھی۔ روپیہ پیسہ تو لوگ اسے گاؤں کا بازی گر ہونے کی حیثیت سے دیتے تھے۔ ہم نے خود نورو بازی گر کو گندم، کپڑے اور پیسے کئی دفعہ دیے جب وہ

لینے آتا۔

میٹرک کے بعد پندرہ سال گزر گئے لیکن مماثے اور اچھو کا کبھی سامنا نہ ہوا۔ نہ اس نے کبھی پوچھا نہ میں نے بتایا۔

مماثے نے اپنی شادی پر کلاس فیلوز میں صرف مجھے بلایا۔ اس کی شادی بھی ایک سکول ٹیچر سے ہوئی اور شہر میں اس نے اپنا ایک خوبصورت گھر بھی بنا لیا۔

اب گاؤں کے اکثر لوگ میرے پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے عزت کرنے لگے۔ میری منگنی بھی ایک پڑھی لکھی اور آفیسر لڑکی سے ہوگئی اور مجھے ایک اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ یوں گاؤں میں میری عزت اور وقار میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ملازمت کے ایک سال بعد میری شادی ہوئی تو میں نے سید امان اللہ شاہ کو بطور خاص بلایا۔ شام کے وقت ہم دیگر احباب کے ساتھ بیٹھے حجرے سے شادی کی خوشی منا رہے تھے کہ اچھو ڈھول لے کر آ گیا۔ اس نے دھوتی اور کرتا پہنا ہوا تھا اور پاؤں میں ٹائر کا جوتا تھا۔ اچھو نے ڈھول زمین پر رکھ کر پہلے جھومر ڈالی اور پھر اس کے بعد پہلو بدل بدل کر خوب ڈھول بجایا جس سے ہم بہت محظوظ ہوئے۔ ارد گرد کئی بچے بھی جمع ہو گئے۔ میں نے اور سید امان اللہ شاہ نے تو پیس سوٹ پہنے تھے جو ہمیں خوب جچ رہے تھے۔ اچھو کوئی بیس منٹ بعد اپنا کھیل ختم کر کے آگے بڑھا اور ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ میں نے جیب سے ہزار روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے کہا، "دو ہزار سے کم نہیں لوں گا اور ہزار روپے تمھارے بچپن کے دوست شاہ صاحب سے لوں گا۔" خیر ہم نے اسے پیسے دیے تو وہ بہت خوش خوش چلا گیا۔ اسے جاتے دیکھ کر سید امان اللہ شاہ نے حیرانی سے پوچھا، "یار علی، اسے کیسے پتا ہے کہ ہم بچپن کے دوست ہیں؟" میں نے کہا، "یہ اچھو بازی گر ہے اور اس نے تجھے پہچان لیا ہے کہ تو مماثا عرف میتا ہے۔" یہ سن کر امان اللہ حیرت سے اچھو کو جاتے ہوئے تکنے لگا اور پھر اچانک اٹھ کر میرے گلے لگ گیا۔ فرطِ جذبات سے ہمارے آنسو نکل آئے۔ اب مجھے پتا نہیں کہ یہ آنسو ہماری بچپن کی یادوں کے تھے یا اچھو بازی گر کے لیے۔

❀❀

علی اکبر ناطق

کمی بھائی

حاجی عبدالکریم کے مرنے کی خبر سن کر عورتیں گھروں سے یوں نکلیں جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ بازار میں گویا لوگوں کی ایک نہر تھی کہ حاجی صاحب کے گھر کی طرف رواں تھی۔ بعض عورتیں تو بین کرتی جاتیں۔ میں اُس وقت کوئی سات برس کا ہوں گا۔ نہیں کہہ سکتا کہ حاجی صاحب سے میری شناسائی تھی، ہاں مگر صبح سویرے دادی اماں مجھے اٹھاتی کہ چلو مولوی جی سے قرأت پڑھ کر آؤ، تو اس وقت مسجد میں میرا سامنا پہلے حاجی عبدالکریم سے ہی ہوتا۔ وہ عین پیش امام کے پیچھے کھڑے ہوتے۔ کئی دفعہ یہ بھی ہوا کہ حاجی صاحب وقت پر نہیں پہنچے تو پیش امام نے انتظار کھینچا اور جماعت میں تاخیر کی۔ بہر حال، میرا اُن سے یہی تعارف تھا۔ اس کے علاوہ نہ انھوں نے کبھی مجھے پوچھا نہ میں نزدیک ہوا۔

اب اُن کے مرنے پر نہ تو مجھے غم تھا نہ خوشی۔ البتہ قدم غیرارادی طور پر بڑی حویلی کی طرف اُٹھ گئے اور اب حویلی کے سامنے لوگوں کے ٹھٹھ میں کھڑا تھا۔ بَین اُٹھ رہے تھے۔

اردگرد کے گاؤں میں آدمی دوڑا کر اعلان کروا دیے گئے تا کہ سلام دُعا والے کندھا دے سکیں۔ ہمارا گاؤں، یا یوں کہیں کہ حاجی صاحب کا گاؤں، کافی بڑا تھا جس کی آبادی پانچ ہزار ہو گی۔ بازار کھلے کھلے اور اونچے درختوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گاؤں میں چار بڑی برادریاں تھیں، لیکن چودھراہٹ حاجی صاحب کی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی سو گھر کمیوں کا ہوگا۔ حاجی صاحب نے دس حج کیے، نماز روزے کی پابندی ہمیشہ کی۔ بھرواں جسم، لمبا قد اور لمبی سفید داڑھی تھی۔ میں نے ہمیشہ انھیں سفید ململ میں ہی دیکھا۔ ہاتھ میں عصا رکھتے۔ گاؤں میں سب سے زیادہ زمین بھی انھیں کی تھی، لہٰذا

Scanned with CamScanner

پنچایت میں مرکزی حیثیت بھی اُن کی ہوتی اور جو منہ سے نکل جاتا پتھر پر لکیر ہوتا، کسی کی کیا مجال کہ ان کے آگے دم مارے۔

میں لوگوں کا ہجوم چیرتا ہوا اُس چارپائی تک جا پہنچا جہاں عورتوں کے رونے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ رونے والیوں میں اکثر عورتیں کمیوں کی تھیں۔ ایک روشنت حاجی صاحب کا منہ دیکھتا رہا جن کی ٹھوڑی کے نیچے سے سفید کپڑا باندھ دیا گیا تھا۔ چہرے کا رنگ سیاہی مائل زرد ہو چکا تھا۔ جبڑے اندر کو دھنسے ہوئے اور منہ کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں جنھیں دیکھ کر مجھے خوف آنے لگا اور میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ شاید پہلی بار کسی مردے کو دیکھا تھا اس لیے ڈر گیا۔ باہر آ کر کھلی فضا میں کھڑا ہو گیا اور اُس وقت حیران رہ گیا جب عورتیں یہ کہتے ہوئے گزریں "بھیناں حاجی صاحب پر آج کوئی روپ آیا۔ اللہ بخشے کتنے نیک تھے۔" میں جلد ہی اپنے گھر چلا آیا اور شانی کے ساتھ گولیاں کھیلنی شروع کر دیں۔ مغرب سے پہلے جنازہ اٹھ گیا۔ لوگ جنازگاہ کی طرف بھاگے جا رہے تھے لیکن مجھے ذرا دلچسپی نہ تھی۔ رات البتہ سوتے میں ڈرتا ضرور رہا۔

دوسرے دن سویرے مسجد گیا تو مولوی جی نے ہم تمام بچوں سے مخاطب ہو کر کہا: "بیٹا، تمھیں پتا ہے کل حاجی عبدالکریم فوت ہو گئے۔ اللہ بخشے گاؤں کے لیے رحمت تھے۔ آج گاؤں یتیم ہو گیا۔ کیا مجال تھی حاجی صاحب کے ہوتے کوئی گاؤں پر بُری نظر ڈالتا۔ میرے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک تھا۔"

اس کے ساتھ ہی مولوی صاحب کے آنسو نکل آئے۔

تھوڑی دیر رُک کر بولے:

"پُتر، آج اپنے اپنے سپارے لے کر حاجی صاحب کی قبر پر چلو اور تلاوت کر کے اُس کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں شیرینی بھی ہوگی۔"

شیرینی کے لالچ میں ہم سب حاجی صاحب کی قبر پر آ گئے قبرستان گاؤں کے مشرقی کونے پر پانچ ایکڑ رقبے میں پھیلا ہوا تھا اور گاؤں کے ساتھ جُڑا تھا۔ دوسری طرف نہر بہتی تھی لیکن نہر کا کوئی اثر قبرستان پر نہیں تھا۔ چاروں طرف مٹی گارے کی دیواریں تھیں۔ قبرستان کے اندر کچی پکی قبریں تھیں۔ کوئی سایہ دار درخت نہ تھا۔ البتہ جھاڑیاں بکثرت اُگی ہوئی تھیں جن میں سانپ اور کیڑے

Scanned with CamScanner

مکوڑے رینگتے پھرتے۔ جگہ جگہ چوہوں نے کھڈیں بنا رکھی تھیں جس کی وجہ سے اکثر قبریں زمین میں دھنس گئی تھیں۔ آوارہ گدھے اور کتے دن رات پھرتے رہتے۔ بوسیدہ ہڈیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا کہ چڑیلوں کا یہی ٹھکانہ ہے۔

جب ہم قبرستان پہنچے تو حاجی عبدالکریم کا بڑا بیٹا حاجی سیف الرحمٰن اور چند دوسرے لوگ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب بڑے ادب سے قبر کے گرد بیٹھ گئے اور تلاوت شروع کر دی۔ قبر قبرستان کے درمیان میں تھی۔ تلاوت کے بعد مولوی جی نے ختم پڑھا اور شیرینی تقسیم کی گئی۔ ہماری اس مصروفیت کے دوران دینے گورکن نے ایک جامن کا پودا قبر کے پالیں کی طرف لگا کر اُسے پانی دے دیا، جس پر سیف الرحمٰن نے خوش ہو کر دینے کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ نوٹ لے کر دینا سیف الرحمٰن کو دعائیں دینے لگا۔ رخصت کے وقت مولوی جی نے حاجی سیف الرحمٰن کے گلے مل کر اسے دلاسا بھی دیا۔ پھر ہم چل دیے۔ دو چار ہی قدم چل کر مولوی جی اچانک رک گئے اور سیف الرحمٰن کی طرف منہ کر کے کہنے لگے۔

''بیٹا سیف الرحمٰن! ایسا کر حاجی صاحب کی قبر کے گرد چھوٹی سی دیوار بنا دے اور قبر بھی پکی کر دے تاکہ بارش اور کتے بلے نقصان نہ پہنچائیں۔'' سیف الرحمٰن نے مولوی کی بات سن کر سر ہلا دیا۔ دینا گورکن بھی غور سے سن رہا تھا۔ اس کے بعد ہم اپنے گھروں کو چلے آئے اور کھیل دھندوں میں لگ گئے۔ تیسرے دن مسجد میں قُل ہوئے اور ساتویں کو ساتہ، جس میں پھل اور مٹھائیاں خوب تقسیم ہوئیں اور ہماری موجیں ہوئیں۔ میں نے دل میں سوچا، کاش روز کوئی اسی طرح مرتا رہے۔

اس کے بعد ایک ماہ تک مکمل سکوت رہا۔ ایسا لگا جیسے مولوی جی خود بھی حاجی صاحب کو بھول گئے ہوں۔ لیکن ایک دن اچانک صبح مولوی جی نے ہمیں فرمایا، ''بیٹا، آج پھر حاجی صاحب کی قبر پر قرآن خوانی کرنی ہے کیونکہ آج حاجی صاحب کا چالیسواں ہے۔'' پچھلی بار کی شیرینی ہمیں یاد تھی لہٰذا ہم خوشی خوشی چل دیے۔ لیکن اس بار حاجی صاحب کا بیٹا وہاں موجود نہ تھا اور نہ ہمیں وہاں کہیں مٹھائی دکھائی دی۔ ہم سب بددل ہو گئے اور دل ہی دل میں مولوی کو کوسنے لگے۔ فقط دینا گورکن کھڑا تھا۔ اس نے قبر پر تازہ چھڑکاؤ بھی کیا اور گلاب کی پتیاں بکھیر کر اگر بتیاں سلگا رکھی تھیں جن کا خوشبودار دھواں ہمیں اچھا لگ رہا تھا۔ سب سے الگ چیز جو نظر آئی وہ یہ کہ قبر کے گرد کافی کھلا صحن چھوڑ کے

چھوٹی پکی دیوار کھڑی کر دی گئی۔ جامن کا پودا بھی ہرا بھرا لہلہا رہا تھا۔

گورکن نے آگے بڑھ کر مولوی کو سلام کیا جس کا مولوی صاحب نے بے نیازی سے جواب دیا۔ کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد گورکن بڑے فخر سے بولا: ''مولوی صاحب! پچھلی دفعہ آپ نے جو مشورہ دیا اُسے حاجی سیف الرحمٰن نے میرے ذمے لگا دیا تھا، کیونکہ اُن کو تو اور بھی سو کام ہوتے ہیں، اور پھر حاجی صاحب کون سے بیگانے تھے۔ مجھے بھی اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ پکی اینٹیں پڑی تھیں، میں نے سوچا قبر تو پکی میں بنا نہیں سکتا۔ چلو اس کے گرد پکی دیوار ہی کر دوں۔ حاجی صاحب نیک آدمی ہیں، مجھے بھی ثواب ہوگا۔'' پھر آہستہ سے مولوی جی کے نزدیک ہو کر بولا: ''مولوی صاحب، یہ صحن میں نے اس لیے کھلا رکھ دیا ہے کہ حاجی کی بیوی بیچاری بوڑھی ہو گئی ہے۔ اللہ نہ کرے، اونچ نیچ ہو جاتی ہے، اس کی قبر بھی حاجی صاحب کے ساتھ بن جائے گی۔ حاجی حاجن پھر اکٹھے ہو جائیں گے۔''

مولوی نے یہ سن کر گورکن کو تھپکی دی اور حاجی صاحب کی قبر کے متعلق دو تین مشورے مزید دیے۔ اس کے بعد ہمیں قرآن خوانی کا حکم دیا۔ ابھی قرآن خوانی کر ہی رہے تھے کہ حاجی سیف الرحمٰن اپنے نوکر کے ساتھ شیرینی لے کر آ پہنچے جسے دیکھ کر ہمارے چہروں پر ایک رونق سی آ گئی اور ہم نے زور شور سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ جتنی دیر ہم قرآن خوانی کرتے رہے، حاجی سیف الرحمٰن مولوی جی اور گورکن آپس میں باتیں کرتے رہے جو قرآن پڑھنے کے شور کی وجہ سے ہمیں سنائی نہ دیں۔

جب رخصت ہونے لگے تو میں نے دیکھا حاجی سیف الرحمٰن نے مولوی جی اور گورکن کو ایک ایک سو روپیہ دیا۔ پھر ہم سب واپس چلے آئے اور حاجی عبدالکریم، جس سے میری پہلے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، میرے لیے ایک خواب ہو گیا۔ اب گاؤں میں شاید ہی کوئی ہوگا جس نے کبھی حاجی صاحب کا ذکر کیا ہو۔ حتیٰ کہ ایک سال گزر گیا۔ پھر مزید کچھ ماہ بعد میں نے مولوی جی سے قرأت پڑھنا بھی چھوڑ دیا اور مکمل طور پر اپنے کھیل اور سکول کی طرف متوجہ ہو گیا۔

گاؤں کے بوڑھے مرتے رہے لیکن پھر نہ تو میں نے کسی کا جنازہ پڑھا اور نہ قبرستان کی راہ دیکھی۔ البتہ ایک دفعہ عید کی نماز پر جب مولوی صاحب نے گاؤں والوں کو قبرستان کی خستہ حالی پر شرم دلائی تو انھوں نے پکی چار دیواری کرنے کا ارادہ کیا جس میں تمام گاؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور

Scanned with CamScanner

چاردیواری کھڑی کردی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہاں تک کہ میں میٹرک میں جا پہنچا اور عمر کے پندرھویں سال میں۔ پھر ایک دن اچانک چودھری خوشی محمد کے مرنے کا اعلان ہوا۔ میں زیادہ غور نہ کرتا لیکن چونکہ چودھری کا چھوٹا بیٹا امجد میرا کلاس فیلو تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔ کندھا دیا، جنازہ پڑھا حتیٰ کہ دفنانے تک شریک ہوا۔ اور قبرستان میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آٹھ سال بعد نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ حاجی صاحب کی قبر پر ایک بڑے جامن کے درخت کے علاوہ اور بہت سے درخت قبرستان میں اُگے ہوئے ہیں۔ اکثر قبریں پکی ہو چکی ہیں اور بہت سوں کے گرد کھلی چاردیواریاں، جن کے احاطے پانچ پانچ مرلے تک کھلے تھے اور قبروں پر نام نسب کے کتبے الگ۔ حاجی عبدالکریم کی قبر پر تو ایک گنبد بھی بن چکا تھا جس کے نیچے اب حاجی کی بیوی بھی دفن ہو چکی تھی جو دو سال پہلے فوت ہوئی۔ یہ گنبد غالباً اُسی وقت بنایا گیا تھا۔ لیکن قبرستان میں ابھی بہت سی جگہ خالی تھی۔ مجھے یاد ہے چودھری خوشی محمد کی قبر کی تیاری کے وقت بھی میں امجد کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ ہمارے جانے سے پہلے ہی دینے گورکن نے قبر ایک کھلی جگہ پر کھودی اور اردگرد کی قریباً پانچ مرلے جگہ جھاڑ جھنکار سے صاف کردی جسے دیکھ کر ہم داد دیے بغیر نہ رہ سکے، بلکہ امجد نے دینے کو دو سو روپے انعام بھی دیا۔ جس پر دینے نے چودھری خوشی محمد کی کافی تعریف کی اور کہا، "چودھری صاحب، میں نے سوچا ہمارے چودھری خوشی محمد بڑے اچھے آدمی تھے، قبر ذرا کھلی جگہ پر بنا دوں، تاکہ فاتحہ کہنے میں آسانی رہے۔ جگہ میں نے صاف کردی ہے۔ اب چودھری جی بکل پکی اینٹوں کی دیوار کروا دیں تاکہ یہ جگہ گھیرے میں آجائے اور محفوظ ہو جائے۔"

میٹرک کرنے کے بعد میں شہر چلا آیا تاکہ مزید پڑھ لوں۔ گاؤں میں ہمارا ایک ہی گھر تھا جو یوپی سے مہاجر ہو کر آیا تھا اور نہ جانے کن حالات میں اس گاؤں میں آ بیٹھا۔ عزیز و اقارب لاہور اور کراچی جا بسے۔ اس لیے ہماری یہاں کوئی برادری نہیں تھی جبکہ گاؤں کی باقی آبادی مقامی تھی۔ لہٰذا اثر رسوخ نہ ہونے کی بنا پر ہمارا شمار بھی کمیوں میں آتا۔

شہر میں میں نے ایک میڈیکل سٹور پر رات کی نوکری کرلی جو دو بجے تک جاری رہتی۔ اڑھائی بجے سو جاتا۔ صبح نو بجے کالج نکل جاتا۔ اس طرح گاؤں میں میرے چکر ہفتے کی بجائے مہینے پر جا ٹھہرے۔ شہر میں کافی دوست بھی نکل آئے، لہٰذا گاؤں جاتا تو اگلے ہی دن واپس چلا آتا۔ یوں

مدت تک قبرستان کی طرف گزر نہ ہوا اور شہر میں آئے مجھے چھ سال ہو گئے۔ اس عرصے میں محکمۂ ڈاک میں کلرکی کرنے لگا اور ماہ بہ ماہ تنخواہ لے کر گھر چلا جاتا۔ بلکہ اب کبھی کبھی تو ہفتے بعد ہی نکل جاتا کیونکہ دادی اماں کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایک دن دفتر میں ڈاک سیل کر رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ نے آواز دی۔ پاس گیا تو اس نے ریسیور ہاتھ میں دے دیا۔ فون سن کر چکرا گیا۔ والد صاحب نے دادی اماں کی موت کی خبر سنائی۔ دادی اماں سے میری جس قدر محبت تھی اس کا پہلا ردِعمل تو یہ ہوا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ وہ مصیبتوں کی ماری جب سے انڈیا سے آئی، افلاس اور نکبت نے ساتھ نہ چھوڑا۔ دادا میاں آتے ہی چل بسے۔ ترکاریاں بیچیں۔ سوت کاتے۔ خود بھوکوں جئی اور چھ اولادوں کو پالا۔ اب جو یہ موت کا پیغام آیا تو مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ خدا جانتا ہے آج تک اس سے تہجد قضا نہ ہوئی۔ مجلس کی استطاعت نہ تھی مگر گھر میں ائمہ طاہرین کی چھوٹی موٹی نیازیں دلوانا نہ بھولی۔

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے چھٹی لی، کام چھوڑا۔ بھاگم بھاگ اڈے پر آیا۔ بس پکڑی اور شام سے پہلے گاؤں جا پہنچا اور اماں کی لاش سے خوب لپٹ کر رو دیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اماں کو نہلا یا گیا اور کفن دے دیا۔ عشا ہو گئی لیکن میت نہ اٹھی پھر آٹھ بج گئے۔ نو بج گئے۔ جاڑے میں تو بھی آدھی رات جانیئے ہیں ہمارے گھر میں رونے دھونے کے علاوہ چہ میگوئیاں بھی جاری تھیں اور ابا میاں کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پوچھا: "ابا جی، اماں کی میت نہیں اٹھی۔ اب کس کا انتظار ہے؟"

بولے: "انتظار تو کسی کا نہیں، بس قبر کی دیر ہے۔"

میں نے کہا: "شام سے اب تک قبر کیوں نہ بنی؟"

بولے: "قبرستان میں جگہ نہیں۔"

میں نے کہا: "یہ کیا ہوا!! اتنا بڑا قبرستان ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اڑھائی قبریں تھیں۔"

بولے: "لیکن اب جگہ نہیں رہی۔"

اتنا سننا تھا کہ میں بھاگا قبرستان آیا۔ گورکن کے گھر کا دروازہ پیٹا جو قبرستان کے اندر ایک کونے میں تھا اور اب سارے کا سارا پکا ہو چکا تھا۔

گورکن باہر نکلا تو میں نے پوچھا: "چاچا، کیا بات ہے قبر نہیں بناتے؟ اماں باہر پڑی ہے۔"

Scanned with CamScanner

کہنے لگا: ”بھائی، کتنی دفعہ کہہ چکا ہوں، بڑھیا کا کہیں اور بندوبست کرو۔ قبرستان میں جگہ نہیں۔“

میں نے کہا: ”چل دیکھتے ہیں۔ جگہ کیسے نہیں؟“

بولا: ”تیرے باپ کا نوکر ہوں آدھی رات قبریں پھلانگتا پھروں اور سانپ ڈسوا لوں۔“

میں نے کہا: ”چل نہیں تو نہ سہی، میں خود جگہ ڈھونڈ لوں گا۔“

جیسے ہی واپس مڑا اور قبرستان میں داخل ہوا تو اُس نے پیچھے سے پھر آواز دی۔ ”خبردار اگر کسی دوسرے زمیندار کی قبروں کے احاطے میں جگہ بنائی، ورنہ صبح مردہ باہر نکال پھینکیں گے۔ پھر نہ کہنا یہ کیا ہوا۔“

بہرحال جب میں قبرستان کے اندر آیا، جاڑے کی چاندنی رات تھی، گویا دودھ برس رہا تھا۔ پورے قبرستان میں احاطے ہی احاطے تھے اور اندر دو دو تین تین قبریں، باقی جگہ خالی۔ دو تین جگہ مجھے بڑے گنبد بھی نظر آئے۔ حیران کہ اب کیا کروں اور اماں کو کہاں دفن کریں، کہ اتنے میں دور قبرستان کی آخری نکڑ پر لالٹین کی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ قریب گیا۔ دیکھا تو میرے چچا زاد قبر کھود رہے تھے۔ انھوں نے تھوڑی دیر پہلے ہی چاردیواری کے ساتھ ایک لاوارث جگہ ڈھونڈ نکالی تھی اور اب وہ قبر بنا رہے تھے۔

خیر، رات دو بجے اماں کو دفن کیا۔ جنازے میں کوئی پندرہ لوگ تھے۔ مولوی جاڑے کے ڈر سے نہ آ سکے۔ جنازہ بادا جان نے پڑھا۔

اگلے دن صبح نو بجے چوکیدار نے ابا کو آواز دی کہ حاجی سیف الرحمٰن یاد کرتے ہیں۔ بابا نے مجھے ساتھ لیا۔ حویلی پہنچے تو کوئی سو آدمی بیٹھے تھے۔ جس میں تمام برادریوں کے لوگ موجود تھے۔ ویٹا گورکن بھی وہاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی تیوری چڑھائی۔ ہم سلام کر کے بیٹھ گئے۔ ابا میاں حیران کہ خیر ہو، خدا جانے کیا بات ہے۔

جب سب بیٹھ گئے تو سیف الرحمٰن کی گرجدار آواز نے سکوت توڑا۔

”میاں تقی محمد، رات تیرے چھوکرے نے ویٹے سے بدتمیزی کی۔ آدھی رات بڑھیا کی قبر بنوانا پھرتا تھا۔ اور تمھیں پتہ بھی ہے قبرستان میں کمیوں کے لیے مزید جگہ نہیں۔ رات کی بات تو

Scanned with CamScanner

ہم نے پی لی مگر آئندہ کے لیے سارے کمی اپنا بندوبست کرو۔ قبرستان صرف اُن کے لیے ہے جن کی گاؤں میں زمین ہے۔ آج تک کمیوں کی جو قبریں بن گئیں، وہ بھی ہمارا احسان سمجھو۔ اور سنو، دینے گورکن نے تمھارا کمیوں کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا کہ قبریں کھودتا پھرے۔ میرا پنچایت بلانے کا آج صرف یہی مقصد تھا۔"

یہ کہہ کر حاجی سیف الرحمٰن اُٹھ گیا۔ کس کی مجال کہ دم مارے۔ ہم بھی اپنے گھر چلے آئے۔

دوسرے دن شام کمیوں نے خادم تیلی کے گھر اکٹھ کیا اور فیصلہ ہوا کہ کمی برادری دو کنال جگہ قبرستان کے لیے الگ لے۔ ہر گھر کو اڑھائی سو روپیہ لگا دیا۔ پانچ دن میں پچیس ہزار روپیہ اکٹھا ہوا اور گاؤں سے دو کلو میٹر دور راؤ عبدالشکور سے دو کنال جگہ خرید لی گئی۔ اگرچہ شور زدہ تھی لیکن انھوں نے کون سا فصل بونا تھی۔ ہاں البتہ کچھ دور تھی۔

اب جو کمی مرتا اُس کے وارث خود قبر بنا لیتے، لہٰذا گورکن کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور مولوی کی کمی اس لیے محسوس نہ ہوئی کہ ابا میاں جنازہ پڑھ دیتے۔

اُدھر زمینداروں کا گورکن دینا تھا جس نے قبرستان کو جنت نشان بنا دیا۔ پکی قبریں اور جگہ جگہ گنبد، ہر طرف سایہ دار درخت؛ پانی کی کمی درمیان سے گزرنے والا نالہ پوری کرتا۔ اب قبرستان میں زمینداروں کے لیے کافی جگہ تھی جو مدتوں کام آتی اور ختم نہ ہو سکتی تھی کہ قبرستان میں ہر ایک نے اپنا قبضہ کر رکھا تھا۔

میں اب بھی کبھار گاؤں جاتا تو اماں کی قبر پر ضرور جاتا اور ہر طرف سفید مرمریں قبریں دیکھتا۔ یوں دس سال اور بیت گئے۔ کوئی مسئلہ نہ بنا۔ میں نے دیکھا کہ دینا اب بوڑھا ہو چکا تھا مگر قبروں کی دیکھ بھال اُسی محنت سے کرتا۔

اگلی دفعہ چھ ماہ بعد گاؤں گیا تو پتا چلا کہ آج صبح دینا گورکن مر گیا۔ میں نے یہ خبر فقط سن لی تھی، زیادہ دلچسپی نہ لی۔ حتیٰ کہ شام تک ویسے ہی بھول گیا۔ دوسرے دن دس بجے اپنے گھر میں بادا جان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گرمیوں کے دن اور سخت دھوپ چڑھ آئی تھی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں اُٹھ کے باہر آیا تو سامنے چوکیدار تھا۔

کہنے لگا، حاجی صاحب حویلی بلاتے ہیں۔ میں بادا جان کو بتائے بغیر حویلی چلا آیا۔ سامنے

Scanned with CamScanner

دیکھا تو حاجی صاحب بڑے موڑھے پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسرے لوگ اور کئی چار پائیوں پر بیٹھے تھے۔

مجھے دیکھ کر حاجی سیف الرحمٰن نے کہا: ''میاں تقی نہیں آیا؟''

میں نے کہا: ''چودھری صاحب، وہ ذرا بیمار ہیں۔ آپ حکم کریں۔ میں آ گیا ہوں۔''

کچھ دیر حقہ گڑگڑانے کے بعد بولے:

''تمھیں پتا ہے، کل دینا گورکن مر گیا اور لاش ابھی تک پڑی ہے۔ کفن دفن کسی نے نہیں دیا۔ گرمیوں کے دن ہیں اور دینے کی لاش بدبو چھوڑنے لگی ہے۔ تمھارا کئی بھائی تھا لیکن تمھیں ذرا خیال نہیں آیا۔ جاؤ اس کا بندوبست کرو۔'' اچھے کمہار کی طرف دیکھتے ہوئے: ''اچھے، تم قبر کھود دو۔ اور طیفے، ڈویئے کو غسل دے۔ کفن کا بندوبست میں نے کر دیا ہے۔'' اور میری طرف مخاطب ہو کر: ''علی حسین، تو پڑھا لکھا ہے، ذرا جنازہ پڑھ دینا۔ مولوی آج فارغ نہیں۔''

اتنا کہہ کر حاجی صاحب کھڑے ہو گئے اور مڑتے ہوئے پھر رکے۔

''اور ہاں، گاؤں کے قبرستان میں جگہ نہیں، دھر اپنی طرف ہی لے جانا۔''

❀ ❀

علی اکبر ناطق

بے چارگی

نورے نے عرض کیا، "راؤ صاحب، وہ مال تو فیضاں کا ہوا، کیونکر واپس کرے گی۔ بچاری ساری رات گھنگرو باندھ کر ناچی۔ اور پھر کون سا اس نے چھینا ہے۔ راؤ شوکت خاں نے خوشی سے دیا۔"

"بھڑوے! تو مجھے سمجھاوے ہے؟" راؤ عبدالجمیل خاں گرج کے بولا۔ "سہر میں گند پھیلا رکھا ہے، سر پھرے لوگوں کا تم نے راستہ بند کیا ہے۔ ایک تو میرا بیٹا خراب کر دیا، اوپر سے کہوے ہے خوشی سے دیا۔"

"راؤ صاحب،" نورا دوبارہ لڑکھڑاتی زبان سے بولا، "شوکت خاں کو ہم کیسے روک سکتے ہیں۔ وہ تو کئی دن سے ہم خود تکلیف میں ہیں مگر روکیں تو شہر میں رہیں کیسے؟"

"اچھا... آ... آ! تو یوں کہو کہ مرے بیٹے کی وجہ سے تمھیں تکلیف ہووے!" جمیل خاں ایک دم بھڑک اٹھا۔ "فیضاں کو تکلیف ہووے۔ تری ماں جو رنڈی ہے، جس نے کوئی مرد سہر میں نہیں چھوڑا، اسے تکلیف ہووے۔ ابے حرام کے، تو ہمیں سمجھاوے؟ ہمیں تکلیف بتاوے؟ ٹھہر، تجھے میں بتاؤں ہوں۔" یہ کہہ کر ہاتھ میں پکڑی بیت ایک دم نورے کے منھ پہ ماری جس کی وجہ سے اس کے ہونٹوں سے خون کا فوارہ چل نکلا۔

اس کے ساتھ ہی حبیب خاں نے راؤ جمیل کو آگے بڑھ کر پکڑ لیا۔ لیکن جمیل خان غصے سے کانپ رہا تھا۔ "اتنا کہوے، سہر میں رہویں کیسے۔ گویا ہم ظالم ہیں۔ او پورے سہر کی اکیلی اولاد! آج سام سے پہلے میرا دس ہجار میری سیج پہ ہووے جو رات سوکت فیضاں کو دے آیا ہے۔ ورنہ صبح ساری

Scanned with CamScanner

رقم تیری ماں کی . . . سے نکال لوں گا اور تینوں کا قیمہ الگ بناؤں گا۔ سن لیا تے؟ اب جا دفعہ ہو جا یہاں سے۔"

اور اپنی بیت منیر موچی کو دیتے ہوئے بولا: "اسے اچھی طرح کلمہ پڑھ کے دھو لا۔ کس پلید کو جا لگی۔"

اب نورے کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ راؤ جمیل کا ایک ایک لفظ پہاڑ کی طرح اس کے سر پر گرا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے ڈیرے پر بیٹھا ہر شخص چڑیل ہو اور اگر وہ جلدی یہاں سے نہ گیا تو وہ اپنے ناخن اس کے سینے میں داخل کر کے کلیجہ نوچ لیں گے۔

لیکن جیسے ہی جانے کے لیے مڑا، اس کا پاؤں دہلیز سے ٹکرا گیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔

"دیکھ کے چل، اندھے! غیرت کے ساتھ کیا آنکھیں بھی گئیں؟" ڈیرے پر بیٹھا ایک اور بولا۔

نورے نے جلدی سے اپنا صافہ ہونٹ اور ناک پر رکھا جو بری طرح زخمی ہو گئے تھے، اور باہر نکل گیا۔

گھر پہنچنے تک پورا صافہ خون سے بھر گیا۔ وہ دیکھ کر حیران کہ اتنا خون بہہ گیا مگر اسے پتا ہی نہ چلا۔ اس نے سوچا، شاید جو دلے ہوتے ہیں انھیں درد نہیں ہوتا۔ میں تو اوپر سے رنڈی کا بیٹا ہوں، پورے شہر کی اکیلی اولاد۔

بڑبڑاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھا ہی تھا کہ شریفن نے دیکھ لیا۔

"ہائے نورے، تجھے کیا ہوا؟ اللہ نہ کرے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا؟ لاکھ بار کہا یہ رکشہ چلانے کا دھندا چھوڑ۔ اللہ فیضاں کو سلامت رکھے، ہم کون بھوکے مرتے ہیں کہ سارا دن دھواں کھائیں۔ ماں صدقے، سارے چہرے کا ستیاناس کر لیا۔"

"اماں، یہ اسی فیضاں کی وجہ سے ہوا!" نورا غصے سے چیخا۔

"ہائیں!" شریفن ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ "اے ہے، اس بچاری نے کیا کیا؟ ایک تو کما کر کھلاتی ہے، اوپر سے وہی قصوروار۔ خبردار جو اس کو کچھ کہا۔ اس کی ماں نے مرتے وقت مجھ کو سونپا اور میں نے بیٹی کی طرح پالا پوسا۔ تو تو نکھٹو اور آوارہ نکلا۔ نہ طبلے کی جانچ، نہ بیٹی کا فن۔ بس ہوئے رکشے کی

پھٹ پھٹ اور دو دو ٹکے کی سواری۔ میں کہتی ہوں جو اپنا پیشہ چھوڑتا ہے ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے۔"
شریفن کی آواز اتنی اونچی تھی کہ ساری ہیرا منڈی نورے اور شریفن کے گرد سمٹ آئی۔ اسی شور میں فیضاں کی آنکھ بھی کھل گئی جسے رات ایک لمحے کو سکون نہ ملا تھا۔ آنکھیں ملتی ہوئی صحن میں آ گئی اور دیکھ کر حیران ہوئی کہ ماجرا کیا ہے۔

جب ہر طرف سے سوالات کی بارش ہوئی تو نورا پھٹ پڑا۔

"ہاں میں دلا، میں بھڑوا، سارے شہر کی اکیلی اولاد... اور یہ رنڈی، جس نے کوئی مرد شہر میں نہیں چھوڑا..." غصے میں نورے کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ ادھر شریفن سمیت تمام محلے والوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

پھر اچانک نورے کو یاد آیا کہ آج پہلی دفعہ اس نے ماں کو رنڈی کہا۔ کچھ دیر چپ کر کے پھر بولا: "ادھر وہ آتا ہے اور ساری رات اس کو نچاتا ہے۔ یہ کنجری، یہ سب کنجریاں، سارا محلہ ذلوں کا منہ دیکھتا ہے۔" یہ کہہ کر نورا اندر چلا گیا۔ پھر آہستہ سے اس کے پیچھے فیضاں بھی۔

نورے کو گھر سے گئے تیسرا دن تھا۔ شریفن اور فیضان نے کس کس سے نہیں پوچھا۔ ہر معلوم ٹھکانے سے پتا کرایا۔ کہیں سے خبر نہ ملی۔ دونوں سخت پریشان کہ اب کیا کریں۔ ادھر فیضاں ہر گاہک کو باہر ہی سے ٹرخا رہی تھی۔ پریشانی میں اسے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

آج پھر عشاء کی اذان ہو چکی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس عالم میں فیضاں کوٹھے کی چھت پر ٹہلتی جاتی اور نورے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ اچانک کار کے رکنے کی آواز آئی۔ اس نے اوپر سے جھک کر دیکھا تو مزید پریشان ہو گئی۔ راؤ شوکت لڑکھڑاتا ہوا اس کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے، کہ اتنے میں شوکت خاں بغیر دستک دیے اندر گھس آیا۔

فیضاں چھت سے اتری تو دیکھا، شریفن اس سے ٹال مٹول کر رہی ہے۔ مگر فیضاں نے دیکھا کہ اس کی باتوں کا شوکت پر کوئی اثر نہیں ہو رہا، بلکہ نشے کی حالت میں وہ فیضاں کو تکتا چلا جا رہا ہے۔

اس رات فیضاں پھر ایک پل نہ سو سکی۔ بیچاری انکار کرتے بھی ڈرتی تھی کہ اس کے باپ کا

شہر میں طوطی بولتا تھا۔ ذرا چوں چرا کرتی تو ٹھکانہ نہ ملتا۔ رات کے پچھلے پہر جب فیضاں نے شوکت کو راؤ جمیل خاں کی طرف سے کی گئی توہین یاد دلائی تو وہ الٹا بپھر گیا۔

''مسری، تو چاہتی ہے میں ابا کو رگیدوں۔ شکر کر و نورا زندہ ہے۔ ورنہ جیسے ابا کے آگے وہ بولا تھا، میں ہوتا تو ٹکڑے کر کے کتوں کے دھورے پھینک دیتا۔'' یہ کہہ کر ہزار روپیہ فیضاں کے آگے پھینکا اور باہر نکل گیا۔ فیضاں ڈر کے مارے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ روپیہ لیتے جاؤ، ورنہ کل اسے دو ہزار واپس کرنا پڑیں گے۔

ابھی فیضاں کی آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو نورا سامنے کھڑا تھا۔ فیضاں تو پیچھے ہی کھڑی رہی مگر شربتن نورے سے لپٹ گئی اور منہ سر چومنے لگی۔ لیکن وہ پتھر کی طرح کھڑا رہا۔ اس سے پہلے کہ اس سے کچھ پوچھتیں، نورا آگے بڑھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج نورے کو گھر آئے چھٹا دن تھا لیکن اس نے کسی سے کوئی بات نہ کی تھی۔ بالے اور طیفے کے ساتھ فلاش کھیلنا تو ایک طرف، ہیرا منڈی کے چوک میں بھی ایک لمحے کو نہیں بیٹھا۔ سب حیران تھے، آخر نورے کو ہو کیا گیا ہے؟ ایسے واقعات تو ہیرا منڈی میں آئے دن ہوتے تھے۔ ایک دفعہ فیضاں نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر نورے کے تیور ایسے لگتے تھے کہ ابھی کاٹ کھائے گا۔

کہنے لگا: ''میرا تجھ سے کیا رشتہ، سوائے اس کے کہ میں تیرا دلال ہوں۔ لیکن تیرے باپ کا تو پھر بھی پتا ہے۔'' بیچاری چپ سادھ گئی۔ ادھر شربتن کی حالت پاگلوں کی سی ہو گئی۔ اس سے پہلے اس نے بیٹے کی بدلی ہوئی آنکھیں نہیں دیکھی تھی۔ بلکہ اب تو اس کے کمرے میں بھی آتی ہوئی ڈرتی۔ اور دل ہی دل میں دعا کرتی کہ جب تک نورے کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو جاتا، خدا کرے کوئی گاہک نہ آئے۔ اور دروازے کو ایسے کنڈی چڑھائے رکھتی جیسے شریفوں کا گھر ہو۔

ساتویں دن صبح ہی، جب شربتن چولھے پر بیٹھی چائے بنا رہی تھی، نورا پاس آ بیٹھا اور آہستہ سے بولا: ''اماں، ایک بات بتا۔''

شربتن ایک دم خوش ہو کر بولی: ''ماں صدقے، پوچھ بیٹا کیا بات ہے۔''

نورا اور نزدیک ہو کر بولا: ''سچ بتا جس کا نام میرے شناختی کارڈ پر ہے، کیا وہ میرا اصلی باپ

ہے؟ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بتا۔"

شریفن نورے کی بات سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ لیکن پھر سنبھل کر نورے کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "بیٹا، میں لاکھ رنڈی سہی، مگر تیرے ساتھ دھوکا نہیں کیا۔ اور ہے بھی تو نکاح کا۔ تو سو لاکھ انکار کرے لیکن ہے وہ تیرا ہی باپ۔" پھر ایک دم حوصلہ پا کر بات بدلتے ہوئے بولی: "پر نورے، یہ تو بتا تو اتنے دن غائب کدھر رہا؟"

نورے کے لہجے میں خود اعتمادی لوٹ آئی۔ "کہیں مکان کا سودا کرنے گیا تھا۔ مگر اب یہیں رہیں گے۔"

الیکشن کے رزلٹ ایک کے بعد ایک آنے لگا۔ چھوٹے پولنگ سٹیشن پر تو کب کی گنتی ہو چکی تھی لہٰذا اب مغرب کی اذان سننے کا کسے ہوش تھا۔ احاطے کا صحن سینکڑوں آدمیوں سے بھر گیا اور خوشامدیں ہونے لگیں۔

"راؤ صاحب نے پیسہ تو پانی کی طرح بہا دیا،" ایک بولا۔ "کسی نے ایک مانگا تو دس دیے۔ خدا قسم ان کمپین کے بیس دنوں میں تو کسی کمین نے اپنے گھر کا چولہا نہ جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔"

ایک اور شخص نے لقمہ دیا جو راؤ جمیل خاں کے پہلو میں بیٹھا تھا: "بھئی اب بھی ووٹ نہ ملتے تو سالی رعایا کا تیہ نہ بتا دیتے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ پیسے کے علاوہ انسان کی کوئی خاندانی شناخت بھی ہونی چاہیے تاکہ سر اٹھا کر بات بھی کر سکے۔ پتا نہیں پیاز کھانے والے کہاں سے آ گئے راؤ صاحب کے مقابلے میں الیکشن لڑنے۔"

اب راؤ جمیل خاں نے فخر سے سگار کا گہرا کش لیا۔

دوسری طرف شمیم بھی بول اٹھا: "راؤ صاحب، ویسے آپ نے الیکشن میں بڑی گیم ماری ہے۔ چوہدری اعجاز کو دس لاکھ دے کر اپنے چاچا ہی کے مقابلے میں کھڑا کر دیا۔ چوہدریوں کے ووٹ بٹ گئے اور آپ صاف نکل گئے۔ اب آپ تو الیکشن جیتے، وہ الٹا ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ اسے کہتے ہیں سیاست۔"

راؤ جمیل خاں نے اپنی تعریف سن کے پہلو بدلا اور ایک اور گہرا کش لیا۔

Scanned with CamScanner

"میاں، سیاست میں خون جلانا پڑتا ہے تب کہیں جا کے گھر میں روشنی ہووے۔ اور بھائی، حکومت نے بھی راجپوتوں کو ہی۔ باقی ذاتاں تو بس کی کمین ہوویں۔ ان میں عقل تو ہوتی نہیں، حکومت کیا خاک کریں!"

راؤ جمیل خاں کے اس تبصرے پر ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔

رات نو بجے تک قریب قریب رزلٹ سارا آ گیا جس کے مطابق راؤ جمیل خاں ہزاروں سے جیت رہا تھا۔ اب جو چند پولنگ اسٹیشن رہ گئے تھے ایک تو ان کے ووٹوں کی تعداد سینکڑوں میں تھی، دوسرے وہاں بھی راؤ جمیل کی فتح کے واضح اشارے تھے، لہٰذا چوہدری شفیع محمد کی شکست یقینی تھی۔

ہر طرف سے مبارکیں وصول ہونے لگیں۔ راؤ صاحب نے آج جو میدان مارا تھا وہ واقعی پانچ سال کی فتح تھی۔ بلکہ راؤ صاحب نے سوچا کہ اب تو یہ پشت در پشت چلے گی۔

رات کے دس بجے عوام کے ساتھ سرکاری افسران بھی تحفے لے کر آنے لگے۔ تھوڑی دیر میں نوٹوں کے ہار اور مٹھائی کے ڈبوں کا پہاڑ جتنا ڈھیر لگ گیا۔ رات ایک بجے راؤ صاحب کی فتح کا مکمل اعلان ہو گیا۔ شاہ شاہ کی آوازیں آنے لگیں۔ راؤ صاحب کی کوٹھی کے سامنے بہت بڑا مجمع تھا۔ کلاشنکوف اور پستول کے ہوائی فائر ہونے لگے۔ راؤ جمیل نے شوکت خاں کو آواز دی، "سوکت خاں، بھاگیو کچہری روڈ سے فیاض قریسی کی دوکان کھلوا کے دس بیس ہجار کے رودھ فوراً لے آئیو۔ کوئی اور گیا تو وہ سسرا رات کے اس سے دکان نہیں کھولے گا۔"

رات جوں جوں گزرتی گئی تحفوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ راؤ صاحب نے آنے والے مہمانوں کے لیے جلدی سے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا آناً فاناً پڑوسیوں کی سات آٹھ بھینسیں پکڑ کر حلال کر دی گئیں۔ دیگیں چڑھ گئیں۔ گھنٹوں کا کام منٹوں میں نپٹایا جانے لگا۔ الاؤ روشن ہو گئے۔

جو لوگ سردی سے ٹھٹھر رہے تھے وہ اب آگ کے گرد جا کھڑے ہوے۔ دہکتے کوئلوں کی ایک بڑی انگیٹھی راؤ عبدالجمیل خاں اور پاس بیٹھے ہوے شرفا کے درمیان رکھ دی گئی۔ حقے کی نے دائرے میں چلنے لگی۔

رات کے پچھلے پہر سردی کافی بڑھ گئی تھی، لیکن انگیٹھی سے اٹھتی حرارت اور تازہ فتح کی وجہ سے راؤ عبدالجمیل خاں سرور کے عالم میں بیٹھا تھا۔ چاروں طرف سے گپیں ہانکی جا رہی تھیں اور

Scanned with CamScanner

جائے کے دور چل رہے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ دھند اور کہر بھی کافی بڑھ گیا کہ نظر دس فٹ سے آگے نہیں جاتی تھی۔ اتنے میں ایک شخص کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ راؤ جمیل خاں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو نورا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ غالباً اس کے سر پر رکھی ہوئی بوری کافی وزنی تھی۔ پاس آ کر نورے نے بوری اپنے سر سے اتار کر راؤ جمیل خاں کے قدموں میں رکھ دی اور اسے الیکشن میں کامیابی کی مبارکباد دینے لگا۔

''راؤ صاحب، میں نے سوچا میں بھی آپ کو مبارک دے آؤں اور یہ تحفہ (بوری کی طرف اشارہ کر کے) آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ نوٹوں کے ہار اور مٹھائی تو آنی جانی شے ہے۔ جیسی شاندار آپ نے آج کامیابی حاصل کی ہے ویسا ہی تحفہ بھی ہو۔''

یہ کہہ کر اس نے بوری کا منہ کھول دیا جسے دیکھ کر راؤ جمیل اور دوسرے تمام لوگوں پر سکتہ طاری ہو گیا۔ بوری میں راؤ شوکت خاں کی لاش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے جن میں سب سے بڑا ٹکڑا سر کا تھا۔

''راؤ صاحب!'' نورا پھر بولا، ''میں نے سوچا آپ شریف آدمی ہیں۔ یہ شوکت خاں آپ کو ذلیل کرے گا۔ جیسے آج پھر یہ فیضاں کے پاس چلا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں ایک اور نورا یا فیضاں پیدا ہو جاتی۔ ادھر آپ راجپوت ہیں۔''

راؤ جمیل خاں کو ایسا لگا جیسے یہ آواز کسی گہرے کنوئیں سے سن رہا ہو۔

❀❀

Scanned with CamScanner

ادبی تنقید و تحقیق

ضربِ تنقید
ناصر بغدادی
قیمت: 400 روپے

تنقیدی افکار
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 250 روپے

مضامین سلیم احمد
سلیم احمد
انتخاب: جمال پانی پتی
قیمت: 800 روپے

ساحری، شاہی، صاحبقرانی
(داستانِ امیر حمزہ کا مطالعہ)
شمس الرحمٰن فاروقی
تین جلدوں کے سیٹ کی قیمت: 1000 روپے

ادب کی نسائی رد تشکیل
(مضامین کا انتخاب)
ادارت: فہمیدہ ریاض
قیمت: 150 روپے

شعر شور انگیز
(غزلیات میر کا انتخاب اور مفصل مطالعہ)
شمس الرحمٰن فاروقی
چار جلدوں کے سیٹ کی قیمت: 1350 روپے

راجندر سنگھ بیدی
ایک مطالعہ
وارث علوی
قیمت: 640 روپے

حریر دو رنگ
شمس الرحمٰن فاروقی شاعر و افسانہ نگار
محمد منصور عالم
قیمت 300 روپے

Scanned with CamScanner

ارجمند آرا سے آج کے پڑھنے والے ایک مترجم کے طور پر واقف ہیں۔ انھوں نے اردو کے معروف برطانوی استاد اور عالم رالف رسل کی خودنوشت سوانح کی پہلی جلد جوئندہ یابندہ کا ترجمہ کیا اور اب دوسری جلد کچھ کھویا کچھ پایا کا ترجمہ کر رہی ہیں جو آج میں قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ آئندہ صفحات میں جو مضمون پیش کیا جا رہا ہے وہ ارجمند آرا نے بمبئی سے شائع ہونے والے تحقیقی جریدے Economic and Political Weekly کے لیے انگریزی میں تحریر کیا تھا اور اب اسے ہماری درخواست پر خود اردو میں منتقل کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مذہبی تعلیم دینے والی درسگاہوں کا برصغیر کے تاریخی اور معاشرتی تناظر میں جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ 1947 کے بعد کے عرصے میں مدرسوں کے کردار کے سلسلے میں ان کی توجہ مکمل طور پر ہندوستانی معاشرے پر مرکوز رہی ہے لیکن اس سے بعض ایسے نکات سامنے آتے ہیں جن کا اطلاق پاکستانی مدرسوں پر بھی ہوتا ہے۔ بلاشبہ پورے برصغیر میں یہ تاریخی پس منظر مشترک ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جب برصغیر میں سماجی تبدیلی کے عمل کی ابتدا ہوئی تو مسلمانوں میں بھی عوامی تعلیم کا پہلی بار آغاز ہوا۔ برصغیر میں مسلمان معاشرے میں جدید تعلیم اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی ذہنی اور مادی ترقی کو اس عمل کے آغاز ہی سے اشراف کہلائی جانے والی بااثر اقلیت کی ملکیت بنا دیا گیا جب کہ مسلمانوں کی اکثریت کے لیے (جسے پہلے "رعیت" اور "اجلاف و ارذال" جیسے نام دیے جاتے تھے اور پھر "غریب غربا"، "کمی کمین" اور "عوام" کہا جانے لگا) جدید تعلیم حاصل کرنے کے دروازے قریب قریب بند رکھے گئے اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہ رہنے دیا گیا کہ وہ مدرسوں میں دی جانے والی مذہبی تعلیم پر قناعت کریں جو انھیں نہ تو دنیا کا کوئی مبنی بر حقیقت تصور مہیا کرتی ہے اور نہ باعزت روزگار حاصل کرنے کے لیے کوئی کارآمد ہنر سکھاتی ہے۔ اس پالیسی پر پاکستان میں اب بھی پوری طرح عمل کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس عرصے میں زمین پر سماجی تبدیلی کا عمل جاری رہا ہے اور اس کے نتیجے میں تعلیم اور ترقی پانے کے لیے عوام کی مانگ متواتر بڑھتی رہی ہے۔ اس مانگ کو بزور کچلنے کی پالیسی نے بہت سی ایسی خرابیوں کو جنم دیا ہے جن سے پاکستان کا معاشرہ آج بھی الجھ رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

ارجمند آرا

مدرسے اور مسلم تشخص کی تشکیل

انگریزی روزنامے ٹائمز آف انڈیا، نئی دہلی، کی 17 اگست 2003 کی اشاعت میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق میرٹھ (یوپی) سے کوئی بیس کلومیٹر کی دوری پر واقع بسالہ گاؤں میں ایک مدرسے کے طلبا نے یوم جمہوریہ کے موقعے پر اپنے مدرسے پر پاکستانی پرچم لہرایا اور اسامہ بن لادن کے حق میں نعرے لگائے۔ مگر اگلے ہی مہینے ہندی روزنامے نوبھارت ٹائمز میں 30 ستمبر 2003 کو ایک اور خبر شائع ہوئی جس کے مطابق اُس وقت کے فروغ انسانی وسائل کے وزیر مرلی منوہر جوشی نے وشو ہندو پریشد کے صدر اشوک سنگھل اور ایسے دیگر لوگوں کو چیلنج کیا جو مدرسوں کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مرلی منوہر جوشی نے مطالبہ کیا کہ اگر آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے لوگ مدرسوں کو دہشت گردی کے کیمپ سمجھتے ہیں تو پھر ان کی دہشت گردی کا ثبوت پیش کریں۔

مدرسوں کی سرگرمیوں پر لاتعداد رپورٹیں، ان کے حق میں یا پھر مخالفت میں، ہر طرح کے اخبارات وجرائد میں مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ 1998 سے 2004 تک جب مرکز میں بی جے پی برسر اقتدار تھی، اُس وقت ایک طرف جہاں لال کرشن آڈوانی جیسا اقلیت دشمن وزیر داخلہ مدرسوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے حق میں تھا وہیں دوسری جانب اس کا نظریاتی بھائی مرلی منوہر جوشی دینی مدارس کی تعریف میں رطب اللسان تھا کہ مدرسے علم وتعلیم کے مراکز ہیں اور خواندگی اور تعلیم کے فروغ کے قومی مقاصد کے حصول میں مثبت کردار نبھاتے ہیں۔

ہم اگر ان دونوں لیڈروں کے بظاہر متضاد نظریات کا بغور جائزہ لیں تو منطقی طور پر یہ ہمیں

Scanned with CamScanner

ایک ہی دھاگے سے میں پروئے ہوئے نظر آئیں گے۔ ایسے تضادات کا پیدا ہونا دراصل ہمارے موجودہ سیاسی اور معاشی نظام کا خاص وصف ہے۔ ہندستان ایسے جمہوری نظام کو، جہاں نام نہاد عوامی نمائندے حکومت کرتے ہیں، مختلف گروہوں کے بازار سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جن کے مسابقتی رشتوں میں توازن اور ہمواری ہی حکومت کے تسلسل کی ضامن ہوتی ہے۔ عوام کا استحصال کرنے والی ان باہم متضاد قوتوں کا اپنی بقا کے لیے اتنا انتخابیت پسند (eclectic) ہونا ضروری ہے کہ وہ مختلف سماجی گروہوں کے شعلہ بیاں بالائی طبقے کو اپنے نظام کا حصہ بنا کر عوام کو فریب میں مبتلا رکھ سکیں۔ عوام اپنے بالائی طبقے کی فلاح کو اپنی فلاح سمجھنے کے فریب میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ معاشرے کے تمام پسماندہ اور پامال طبقات کسی بھی صورت میں متحد ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف صف آرا نہ ہو سکیں۔ اس طرح کے نظام میں یہ حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے کہ پہلے کچھ مقبول عام مطالبات/ مسائل کو اچھالا جاتا ہے اور پھر ان مسائل کی نمائندگی کرنے کے لیے کچھ لیڈروں اور بالائی طبقے کو سیاسی نظام کا جزو بنا کر عوام کی تشفی کر دی جاتی ہے۔ اس عمل میں الگ الگ مخصوص تشخص رکھنے والے فرقوں کی ایک مخصوص سانچے میں ڈھلی ہوئی (stereotypical) تصویر کی تشہیر کر کے انھیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر متذکرہ بالا بیانات میں آر ایس ایس اور بی جے پی کے لیڈروں کا مقصد مسلمانوں کو ایک خاص شبیہ کے حامل ملک دشمن طبقے کے طور پر پیش کرنا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے ایک علیحدہ اقلیتی طبقے کی شبیہ کو زندہ رکھا جائے، تاکہ اس 'دشمن' کو واضح طور پر پہچانا جا سکے۔ مذکورہ بیانات میں یہ کام مرلی منوہر جوشی نے کیا۔ بی جے پی کے دور اقتدار میں اگر مدرسوں کے دفاع میں بیانات دیے گئے تو اسے مذکورہ بالا حکمت عملی کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے کیونکہ اقلیتوں کو اقلیت بنائے رکھنے سے ہی سنگھ پریوار کے ہندوتوا کی توسیع کے ایجنڈے کو تقویت مل سکتی ہے۔

بی جے پی کی سربراہی میں بننے والی ہندوستان کی این ڈی اے حکومت کے مدرسوں کے بارے میں اس دوغلے موقف پر مزید بحث کی گنجائش نہیں، لیکن اس حکومت کے ایک اور دوغلے رویے کا ضمناً تذکرہ ضروری ہے تاکہ سنگھ پریوار کی مذکورہ حکمت عملی کو سمجھنے میں مزید مدد مل سکے۔ اس حکومت کی کشمیر پالیسی بھی اس کی اقلیتی پالیسی ہی کی طرح دوغلی تھی۔ اس کے مطابق وزیر اعظم اٹل بہاری

Scanned with CamScanner

واجپائی تو اپنے دور حکومت میں کشمیر کے لیے نسبتاً زیادہ خودمختاری کے حق میں اکثر بیان دیتا رہتا تھا لیکن اس کا نائب، یعنی لال کرشن آڈوانی، آئین ہند کے آرٹیکل 370 کو، جس کے تحت جموں وکشمیر کے علاقے کو خصوصی درجہ حاصل ہے، منسوخ کرنے کا راگ الاپتا رہتا تھا جو آر ایس ایس کا آفیشل موقف ہے۔ مدرسوں، اقلیتوں اور کشمیر کے حوالے سے بی جے پی کے موقف پر مزید اظہار رائے کے بغیر میں اس ضمنی موضوع کو یہیں ترک کرتی ہوں اور اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اپنی بات یہاں سے شروع کرنا چاہتی ہوں کہ ہندستان میں چلنے والے مدرسے اپنی خصوصیات اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں، اور مدرسوں کے بارے میں گفتگو شروع کرتے وقت اس حقیقت کو ذہن نشین رکھنا چاہیے۔

نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر گیارہ ستمبر 2001 کے دہشت گردانہ حملوں کے بعد امریکہ نے جیسے ہی 'اسلامی دہشت گردی' کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا، دینی مدرسوں کی جانب دنیا کی نظریں لگ گئیں اور یہ جاننے کی کوشش کی جانے لگی کہ خصوصاً پاکستان اور افغانستان میں واقع مدرسے مذہبی شدت پسندی کی تبلیغ اور عالم گیر دہشت گردی کے کیمپوں کی حمایت میں کس حد تک ملوث ہیں۔ ہندستان کے مدرسے بھی شکوک وشبہات کے گھیرے میں آئے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مدرسوں کے نظام کو سمجھے بغیر اس قسم کے الزامات کی بابت کوئی رائے قائم کرنا گمراہ کن ہوگا۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ہمارے ملک میں پانچ لاکھ کل وقتی مدرسے ملک گیر پیمانے پر چل رہے ہیں جن میں تقریباً پانچ کروڑ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ اس فہرست میں جزوقتی اور شبینہ مدارس شامل نہیں ہیں۔ (ماہنامہ اردو دنیا، جولائی 2003، ص 7)۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ مذکورہ الزامات بڑی تشویش کا باعث ہوسکتے ہیں۔ گو یہ بات درست ہے کہ ہندستان کے دینی مدرسوں کو افغانستان اور پاکستان کے مدرسوں کی مانند دہشت گردی کے اڈے نہیں سمجھا جاتا لیکن ان کے بارے میں بے اطمینانی کا عمومی ماحول پایا جاتا ہے اور بہت سے لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ یا تو ان مدرسوں کے بنیادی ڈھانچے میں اصلاحات کی جائیں، یا ان پر سخت پابندیاں ہوں، یا پھر یہ ادارے بند کیے جائیں۔ اخباروں میں مسلمانوں سے متعلق شائع ہونے والی اکثر خبروں اور مضامین کے ساتھ مدرسوں کے بچوں کی جو تصویریں شائع ہوتی ہیں ان میں وہ بچے بینچوں پر کلام پاک اور سیپارے رکھے اپنا سبق ازبر کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی

Scanned with CamScanner

بیشتر تحریروں میں ان بچوں کو ایسے تنگ نظر مذہبی انتہا پسندوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو اشارہ ملتے ہی گویا انسانی بم میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مدرسے کے اکثر طلبا کی یہ تصویر کشی یقیناً درست نہیں ہے، لیکن یہ خیال عام ہے کہ مدرسے والوں کا ذہنی افق عموماً وسیع نہیں ہوتا اور وہ ہر جدید شے کے مخالف ہوتے ہیں، اور یہ بات زیادہ غلط نہیں ہے۔ تعلیم یافتہ مسلمان اس وقت عجیب بے چینی محسوس کرتے ہیں جب وہ کرتے پاجامے میں ملبوس، ٹوپی لگائے، چھوٹی ڈاڑھیوں والے نوجوان طالبِ علموں کو گروہ کی صورت میں مسجد یا مکتب سے نکلتے ہوئے یا کسی مسلمان بھائی کے گھر دعوت کھانے کے لیے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ بے چینی غالباً مسلمانوں کی عمومی تعلیمی پسماندگی کے سبب ہوتی ہے، لیکن جدید تعلیم یافتہ طبقے کا یہ ردعمل کسی ترقی پسندانہ اقدام کے لیے کوئی رہنمائی نہیں کرتا۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی ترقی کے خواہاں لوگوں کو بدلتے ہوئے عمومی سماجی تناظر میں ایسے بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے ہوں گے جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں مدد کریں۔ اس کو سمجھنے کے لیے جو سوال ہمارے ذہنوں میں سب سے پہلے پیدا ہوں گے وہ کچھ اس قسم کے ہوں گے: وہ کون سے حالات ہیں جن کے سبب اتنی بڑی تعداد میں مدرسے وجود میں آئے؟ ان کی تاریخ کیا ہے اور ان کی بقا کی ساجیات کیا ہے؟ اس کے کیا اسباب ہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ سماج میں بھی عہد وسطیٰ کے ان اداروں کو مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہے؟ عام لوگوں کی بہ نسبت مدرسوں سے وابستہ لوگوں کی مجموعی پسماندگی اور تعلیم یافتہ مسلم معاشرے سے کٹ جانے کے اسباب کیا ہیں؟ اس افسوسناک صورتِ حال کے لیے سماجی، سیاسی اور اقتصادی حالات کس حد تک ذمے دار ہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے سوال ہم میں سے بہت سے لوگوں کو پریشان کرتے ہوں گے، خصوصاً ایسے دور میں جب ملک کے مختلف خطوں میں ہر طرح کے مذہبی جنون کو ہوا دے کر فضا کو مسلسل مسموم کیا جا رہا ہے، ایک ایسے مسلمان کے لیے جو کثیر مشرب (pluralist) معاشرے میں ایک جدید ہندستانی شہری کے طور پر زندہ رہنا چاہتا ہے، یہ صورتِ حال بڑی دشوار گذار ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ تمام سوالوں کو ذہن میں رکھ کر خصوصاً ہندستان میں نظامِ مدارس کو تاریخی تناظر میں سمجھنے اور موجودہ دور میں ان کی افادیت کے تجزیے کی کوشش کی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

ابتدائی دور کے مدارس

عہدِ وسطیٰ میں مسلمانوں کے درمیان کوئی باقاعدہ نظام تعلیم رائج نہ تھا۔ صوفی، علماء، مشائخ، مصلحین، امرا اور روسا اپنی خانقاہوں اور ڈیوڑھیوں ہی کو تعلیم و تربیت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ذاتی نوعیت کے ان مدرسوں میں عموماً کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی (سید مناظر احسن گیلانی، ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی، 1987، ص 35)۔ مدرسوں کے قیام کے تاریخی شواہد فراہم کرتے ہوئے قمر الدین لکھتے ہیں کہ عہدِ سلطنت میں مسلم حکمرانوں اور امرا نے بہت سے مدرسے اور مکتب قائم کیے (ہندستان کی دینی درس گاہیں، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا کل ہند سروے، دہلی، 1996، ص 35)۔ مسجدوں اور خانقاہوں میں مکتب لازماً چلائے جاتے تھے جہاں طالب علموں کو قرآن پڑھنا اور دینی ارکان سکھائے جاتے تھے۔ امرا کے بچوں کی تربیت کا اہتمام ان کے گھروں میں کیا جاتا تھا۔ مدرسے کے لغوی معنی درسگاہ کے ہیں، یعنی وہ جگہ جہاں تعلیم دی جائے۔ اصلاً اس لفظ سے کوئی مذہبی یا غیر مذہبی مفہوم مترشح نہیں ہوتا۔ ابتدا میں چونکہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا کوئی تصور نہیں تھا اس لیے مدارس میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فلسفہ، عروض، قواعد، ریاضی، منطق، تاریخ اور جغرافیہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ اگر کسی طالب علم کو کسی مخصوص علم (مثلاً طب یونانی) میں مہارت حاصل کرنی ہوتی تو پھر وہ اس علم کے ماہرین سے رجوع کرتا تھا۔ رموز سیاست اور سپہ گری جیسے فنون کی تعلیم امرا اور روسا تک محدود تھی۔ یہ طرز تعلیم ہندستان میں مسلم حکمرانوں اور مسلم طرز معاشرت کے استحکام کے ساتھ ساتھ فروغ پاتا رہا۔ اکبر پہلا بادشاہ تھا جس نے تعلیم کا ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا جہاں ہندو اور مسلمان ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے، البتہ ان کو الگ الگ نصاب کے انتخاب کی آزادی تھی۔ (سلامت اللہ، ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1990، ص 31)۔ ہندو اشراف بھی — جن میں اکثریت برہمنوں اور کائستھوں کی تھی — اپنے بچوں کو اسلامی تعلیم کے لیے مدرسوں میں داخل کرانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم پر کبھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس وقت کا سماجی ڈھانچہ ہی اس قسم کا تھا کہ اس میں عوام کی تعلیم پر غور کرنے کی کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ مسلم

Scanned with CamScanner

اشراف کو اپنے ہم پلہ ہندو اشراف کی طرح (بلکہ اگر درست لفظ استعمال کیا جائے تو برہمن کی طرح، جو خود کو علم و دانش کے متولی اور امین سمجھتے تھے) عام لوگوں کی تعلیم و تربیت سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ مثال کے طور پر علی گڑھ تحریک کو پیش کیا جا سکتا ہے جو سرسید کی قیادت میں انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام پر منتج ہوئی۔ یہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا بنیادی تصور مسلم اشراف کو جدید (انگریزی) تعلیم بہم پہنچانا تھا تاکہ وہ اقتدار کے بدلے ہوئے نظام میں شراکت دار ہو سکیں۔ اس تحریک کے 'روشن خیال' دانشوروں کے نزدیک عورتوں اور نچی ذات کے لوگوں کی تعلیم کا سوال کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اپنی کئی تحریروں میں سرسید احمد خاں نے واضح الفاظ میں عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کی ہے۔ ان کے خیال میں عورتوں کو جدید تعلیم دینا "نامبارک" بات تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر سماج میں مردوں کے حالات درست ہو جائیں تو عورتوں کی حالت از خود درست ہو جائے گی، اس لیے ان کا خیال تھا کہ تمام تر کوششیں صرف مردوں کے تعلیمی اور سماجی حالات کو بہتر بنانے میں صرف کی جانی چاہئیں۔ جنوری 1884 میں گورداس پور (پنجاب) کی عورتوں کی ایک اپیل کے جواب میں انھوں نے کہا: "لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمھارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں، در حقیقت وہ لڑکوں لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔" (خطبات سر سید، جلد اول، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1972، ص 6-465)۔ دکن میں 1891 میں منعقد ہونے والی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا "جب مرد لائق ہو جاتے ہیں تو عورتیں بھی لائق ہو جاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں، عورتیں بھی لائق نہیں ہو سکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے، اسی کوشش [لڑکوں کی تعلیم] کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔" (خطبات سر سید، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ص 4-223)۔ انھوں نے کانگریس کے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی کہ معہدہ عہدوں (covenanted posts) پر مقابلے کے امتحانات، جو صرف برطانیہ میں منعقد ہوتے تھے، ہندستان میں بھی منعقد کرائے جائیں۔ سرسید نے اس مطالبے کی مخالفت کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے نچلی ذاتوں اور طبقوں کے لوگ ان اعلیٰ عہدوں پر منتخب ہو سکتے ہیں اور ان کا تقرر "ہندستان کی شریف قوموں" کے لیے ناگوار خاطر ہوگا۔ (مکمل

مجموعة لیکچرز و اسپیچز، لاہور، 1900، ص2-250)۔ ان حوالہ جات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سرسید کا تعلیمی نظریہ عملاً اور اصولاً دونوں ہی سطحوں پر اشرافیہ مسلم طبقات کی تعلیمی فلاح تک محدود تھا۔ تعلیم یافتہ مسلم اشراف جس قسم کے نظام تعلیم کو فروغ دینا چاہتے تھے اس کا مقصد دراصل فیوڈل سماج کا تحفظ کرنا تھا۔

سماج کے کمزور طبقات کے تئیں مسلم اشراف کے اس بے حس، بلکہ معاندانہ رویے نے مسلمانوں میں طبقاتی فرق کو مزید بڑھایا اور علما، قاضیوں، مولویوں اور حکیموں کے الگ الگ طبقات الگ الگ ذاتوں کی مانند مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ یہ لوگ چونکہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ذات پات میں یقین رکھنے والے ہندوؤں کی طرح معاشرتی تفریق ان کے بھی شعور کا حصہ تھی۔ حالانکہ مسلمانوں میں طبقاتی فرق پیشے کی بنیاد پر قائم ہے اور اسلام میں ذات پات اور چھوت چھات کے لیے کوئی گنجائش نہیں، پھر بھی مقامی تہذیبی اثرات سے اور مذکورہ طرز تعلیم اختیار کرنے کے سبب ہندستان میں مسلمانوں میں ذات پات کو خوب فروغ حاصل ہوا اور پورا مسلم سماج دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا — ''شریف'' اور ''رذیل'' (قمرالدین، ہندستان کی دینی درس گاہیں، دہلی 1996، ص35)۔ مسلمانوں میں تقسیم ہندستان تک یہ غیر تحریر شدہ قانون نافذ تھا کہ رذیلوں میں سے کوئی بھی شخص — مثلاً نائی، بڑھئی، لوہار، جلاہا وغیرہ — کسی مسجد کا امام یا شہر کا قاضی نہیں بن سکتا۔ قاضیوں کی حد تک یہ قانون آج بھی مروّج ہے۔ اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو مسلمانوں کا تعلیمی نظام اپنے خلقیے میں ہندوؤں میں مروّج تعلیمی نظام سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا جہاں پاٹھ شالاؤں اور گروکلوں میں صرف برہمن اور دوِج[1] ہی داخل ہونے کے مجاز تھے۔ ہندو

[1] دوِج اعلیٰ ذات کے ہندو جن میں برہمن، چھتریہ اور ویش شامل ہیں، دوِج (dvija) کہلاتے ہیں۔ دوِج سنسکرت کا ایک مرکب لفظ ہے جس کے معنی ہیں، دو بار جنم لینے والا۔ اعلیٰ ذات کے ہندو بچے کی جب باقاعدہ تعلیم شروع ہوتی ہے تو اس موقعے پر اُپ نین کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ برہمن کو پانچ سال کی عمر میں، چھتریہ کو تیرہ اور ویش کو کم از کم سترہ برس کی عمر میں برہما اُپدیش کی تعلیم دے کر یہ رسم ادا کی جاتی ہے، اس موقعے پر برہمن بچے کو جنیو پہنایا جاتا ہے۔ نچلی ذات کے ہندو، جو شودر کہلاتے ہیں (آج کل کی اصطلاح میں دلت طبقہ)، تعلیم کا حق نہیں رکھتے اس لیے وہ دوِج نہیں ہیں۔

اور مسلم دونوں فرقوں کے نظام ہائے تعلیم صرف اعلیٰ طبقات کے لیے ہی دستیاب تھے۔
چونکہ انگریزوں کی حکومت میں مغرب سے آنے والے افکار و تصورات کا اثر معاشرے پر پڑنا ناگزیر تھا اس لیے مسلمانوں کے نظام تعلیم میں بھی تبدیلیاں آئیں، البتہ جدید تعلیم کی تمام برکتیں اعلیٰ طبقات ہی تک محدود رہیں۔ ہر سماجی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ حاشیے پر جینے والے لوگ مقتدر طبقے کی تہذیب کو تحسین کی نظروں سے دیکھتے اور اسے اختیار کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے صاحب اقتدار طبقے کی تہذیبوں کی توسیع اور غلبے کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ ماہرین سماجیات بھی مختلف سماجی گروہوں کے طرز زندگی کے مطالعات و مشاہدات کے ذریعے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ کم ترقی یافتہ طبقے ہمیشہ آگے بڑھنے اور برسر اقتدار طبقے کی تہذیب و ثقافت کو اختیار کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ہندستان میں مسلم حکمرانوں کے زوال سے پہلے تک غیر مسلموں کے اعلیٰ طبقات، بالخصوص کائستھ، مسلمانوں کے طرز معاشرت کو اختیار کرنا مستحسن تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کے طرز تعلیم کو فخر و مباہات سے اختیار کرتے تھے۔ اس زمانے میں غیر مسلم علما کے ماہرین اسلامیات ہونے کی مثالیں بھی عام طور پر اس لیے مل جائیں گی کیونکہ یہ علما اپنے تہذیبی رویوں میں اعلیٰ مسلم طبقے سے قطعی مختلف نہ ہوتے تھے۔

برطانوی حکومت کے اثرات

برطانوی راج قائم ہوا تو ہندستانی معاشرے میں زبردست تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ تعلیمی نظام اس وجہ سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا کہ برطانوی حاکموں نے اپنے مفادات کے پیش نظر عوامی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ لیکن جیسے ہی جدید یا مغربی تعلیم کا نفاذ ہونا شروع ہوا نئی تہذیب اور نئی تعلیم کے خلاف ایک زبردست تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا (گیلانی، ص 18-17، 3-302)۔ جن لوگوں کو بدلتے وقت کے ساتھ بدلنا منظور نہ تھا انھوں نے بہاؤ کے خلاف تیرنے کی کوشش کی۔ روایتی تعلیمی ادارے اور مدرسے بھی اس نئی تہذیب اور نئی تعلیم کے خلاف تھے اور آہستہ آہستہ ان میں سے کئی ادارے ایک طرح سے سامراجی حکومت کے خلاف مدافعت کی علامت بن گئے۔ انگریزوں کے خلاف ان کی یہ مدافعت اور مخالفت بعد میں تحریک آزادی میں مدرسوں کی شمولیت پر منتج ہوئی۔ دیوبند

Scanned with CamScanner

تحریک، وہابی تحریک، اور خلافت تحریک کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جانا چاہیے۔ لیکن دینی مدرسوں کے ذریعے انگریزوں کی مخالفت کا ایک اور نتیجہ یہ بھی سامنے آیا کہ مشرقی تہذیب اور تعلیم کی حمایت کرتے کرتے وہ اپنے مقاصد اور نظریات میں مزید شدت پسند ہو گئے اور انھوں نے ہر قسم کے مغربی علوم کے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے نصابات معاصر معاشرے کی ضرورتوں کے مطابق نہ رہے۔

تبدیل شدہ سیاسی حالات کے سبب مغربی تعلیم کا فروغ لازمی تھا۔ مغربی تعلیم اور طرز زندگی کو خصوصاً ان لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا جو برطانوی راج کے نئے ملازمتی شعبوں میں شامل ہونے کے خواہاں تھے۔ ان نئی تبدیلیوں کے ساتھ وطن پرستی اور وفاداری کے سوال بھی اٹھائے جانے لگے تھے اور یہ بھی سوال تھا کہ نئے حالات میں کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔ ہندستان میں کسی بھی مذہبی فرقے میں اس سوال پر اتفاقِ رائے نہ تھا۔ کچھ لوگ اپنے روایتی نظامِ تعلیم اور عہد وسطیٰ کی اقدار سے وابستہ رہے اور کچھ لوگ نئی تعلیم اور مغرب کے حامی ہو گئے۔ آخرالذکر لوگوں میں بیشتر آسودہ حال اور اعلیٰ طبقے کے لوگ شامل تھے۔ مثلاً سر سید احمد خاں جدید مغربی تعلیم زبردست حامی کے طور پر میدان میں آئے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ سائنسی علوم کا حصول ترقی کا زینہ ہے اور سائنسی علوم تک رسائی صرف انگریزی زبان کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

سماج میں ایک اور بڑی تبدیلی بھی آرہی تھی۔ انصاف و مساوات کے نئے پیمانوں کے طفیل عام لوگوں کے لیے بھی نئی تعلیم کی راہیں کھلنے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ بیداری کی یہ نئی لہر آنے کے سبب عام لوگ بھی بہتر طرز زندگی اختیار کرنے کی توقع کرنے لگے تھے۔ نسبتاً پسماندہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلم عوام نے یہ توقع اپنے بچوں کو دینی مدرسوں میں بھیج کر پوری کی جن کو وہ علم و دانش کے اعلیٰ ترین مراکز خیال کرتے تھے۔ اس صورت حال نے ان عام مسلمانوں کے طرز فکر پر نمایاں اثر ڈالا جن کے حالات بصورت دیگر اپنے ہم پلہ ہندو بھائیوں سے قطعی مختلف نہ تھے۔ اس نئی تعلیمی تبدیلی کے سبب مذہب اور مذہبی تشخص کے لیے بھی ایک بیداری پیدا ہونے لگی۔ بنگال میں نشاۃ ثانیہ اور شمالی ہند میں احیا پرستی کا عروج تہذیبی اور مذہبی شناخت کی اسی بیداری کی لہر کا نتیجہ تھا۔ شناخت کے لیے بیداری کی اس لہر نے اتنا زور پکڑا کہ وہ لوگ بھی جو جدید نقطۂ نظر رکھتے تھے اور سائنس کی تعلیم کے حامی تھے،

Scanned with CamScanner

مذہبی اور سیکولر تعلیم کو یکجا کرنے کی وکالت کرنے لگے تھے (سلامت اللہ، ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم، مکتبۂ جامعہ، نئی دہلی، 1990، ص55)۔

اشرافیہ کی روایت کا یہ اصول عام ہے کہ وہ تمام شعبہ ہائے زندگی پر حاوی رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی کلیے کے مطابق مسلم اشراف نے بھی نظامِ مدارس کے ساتھ ساتھ نئی تعلیم کی درس گاہوں پر بھی اپنی گرفت مضبوط کی۔ روایتی تعلیم کے عالموں اور مبلغوں کی صورت میں جہاں ایک طرف انھوں نے اپنے دینی بھائیوں پر گرفت مضبوط رکھی وہیں دوسری طرف اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجنے کا بھی کوئی موقع انھوں نے نہیں گنوایا۔ مثال کے طور پر اردو کے مشہور شاعر اکبر الٰہ آبادی نے، جنھوں نے مغربی تہذیب کی مخالفت میں اکثر غیر معقول موقف اختیار کیا، اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم کے لیے اسی برطانوی کلچر کے حوالے کر دیا اپنی شاعری میں وہ جس کے شدید مخالف تھے۔

جدید تعلیم کے رجحان کو فروغ ملنے کے بعد عمومی صورت حال کچھ یوں رہی کہ اعلیٰ طبقے کے اکثر مسلمان تو نئی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور نچلے طبقات کے مسلمانوں نے مدرسوں کا رخ کیا۔ ان میں سے بیشتر چونکہ نیم خواندہ یا ناخواندہ گھرانوں سے آتے تھے اس لیے عربی اور فارسی کا نصاب تعلیم ان کے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ ان کی تعلیم کا بیشتر وقت ان زبانوں کو سیکھنے میں صرف ہو جاتا تھا اور اکثر صورتوں میں وہ ان میں درک حاصل نہیں کر پاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے دینی مدارس کا معیارِ تعلیم بتدریج زوال کی سمت بڑھنے لگا۔ یہی وہ دور تھا جب مغل حکومت کا زوال بھی اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور فارسی زبان مقتدر طبقے کی زبان کے طور پر اپنی حیثیت کھو رہی تھی اور اس کی جگہ اردو چلن میں آ چکی تھی۔ لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ جب دینی مدارس کے نصاب کے اردو ترجمے کے بارے میں غور کیا جاتا۔ نئے تعلیم یافتہ طبقے کو اس کا ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ عربی فارسی کے چلن سے باہر ہونے کے سبب تعلیمی معیار کتنی تیزی سے گر رہا ہے، اور اگر انھیں احساس ہو جاتا تو بھی اس کو بچانے کے لیے شاید وہ کچھ بھی نہ کر پاتے۔

نئے سیاسی نظام میں جب سیاست کے روایتی ڈھرے چرمرائے تو مسلم عوام پر سے مسلم اشراف کو اپنے اقتدار کی ڈور پھسلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ صورت حال کو قابو میں رکھنے کے لیے لازم تھا کہ ہر قسم کا حربہ استعمال کیا جائے۔ مذہب ایک ایسا حربہ تھا جس کا استعمال وہ مسلم عوام پر اپنا رسوخ

Scanned with CamScanner

قائم رکھنے اور ساتھ ہی مغربی اثرات کو دور رکھنے کے لیے کر سکتے تھے۔ بہ صورت دیگر اس بات کا قوی امکان تھا کہ آئندہ دنوں میں عام مسلمان تک نئی تعلیم کی رسائی ان کے سماجی نظام کو زیر و زبر کر دے گی۔ وہابی اور دیوبند تحریکوں سے لے کر (جن کا مقصد مسلم حکمرانی کی عظمتِ رفتہ کے احیا کے لیے جدوجہد کرنا تھا) علی گڑھ تحریک اور تحریک خلافت تک، سبھی نے عوام کی سیاسی بے چینی اور اقتصادی بدحالی کا فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے رسوخ کو بڑھانے کی کوششیں کیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی علیحدہ قومی شناخت یا مذہبی تشخص پر سب سے زیادہ زور دیا کیونکہ یہی وہ شعبہ تھا جو ان کے مقاصد کے حصول کی راہ ہموار کرتا تھا۔

مسلم تشخص کی تشکیل اور مذہبی تنظیمیں

اس طرح وقت کے ساتھ مسلمانوں میں جو نظامِ تعلیم مروج ہوا وہ دراصل زمینداری نظام کا ایک ضمنی نتیجہ تھا۔ اصولاً ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد ہندستان میں جمہوریت اور روشن خیالی کی نئی اقدار کے ساتھ یہ تعلیمی نظام آہستہ آہستہ کمزور ہو کر زوال پذیر ہو جاتا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دوسری جانب جماعتِ اسلامی جیسی تنظیموں نے، جن کا ایک مقصد مذہب کے نام پر جاگیرداروں کے حقوق کی نمائندگی اور تحفظ کرنا بھی تھا، مسلم عوام کے سیاسی اور مذہبی معاملات پر حاوی ہونے کی کوششیں شروع کر دیں۔ مذہب کے لبادے میں جماعتِ اسلامی نے آمرانہ طرزِ حکومت کی مکمل حمایت کی۔ جیسے جیسے آزادی، یعنی جمہوریت، کی منزل قریب آ رہی تھی ویسے ویسے مسلمانوں کی مذہبی سیاسی تنظیمیں مذہب کی آڑ میں جاگیردارانہ نظام کی بقا کے لیے سرگرم ہو رہی تھیں۔ پاکستان کی قیام کی راہ ہموار کرنے میں اس قسم کی کوششوں کے عمل دخل کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ یہ مذہبی جماعتیں جاگیرداری نظام کی بقا کے لیے جاگیرداروں کے ساتھ کس قسم کی سازشوں میں مصروف تھیں، اس کا ایک دستاویزی ثبوت جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا مودودی کا درج ذیل بیان ہے جو ان کی کتاب رسائل و مسائل میں موجود ہے:

> بلاشبہ اسلامی قانون انفرادی حق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ قومی ملکیت کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر یہ کہاں درست ہے کہ کوئی پارلیمنٹ ایک حکم کے ذریعے سے اراضی اور

Scanned with CamScanner

دیگر ذرائع پیداوار پر سے افراد کے نجی حقوق کو ساقط کر کے ان پر اجتماعی حقوق قائم کردے؟ زمین کی ملکیت اور جاگیروں کے بارے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زمینی جائیداد اور جاگیر کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ اگر پیداوار کے دیگر ذرائع مثلاً ملوں اور فیکٹریوں کی بات کی جائے، تو ان کے قومیانے کا تصور ہی اسلام کے بنیادی نظریے کے یکسر خلاف ہے۔" (بحوالہ کے ایم اشرف، An Overview of Muslim Politics in India، مانک پبلیکیشنز، نئی دہلی، 2001، ص 143)۔

مذہب کے نام پر اس قسم کے پروپیگنڈے نے ناخواندہ عوام کو خاموش کر دیا، یہی سبب ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان میں، جسے مذہبی تنظیموں کی حمایت حاصل تھی، جمہوریت اپنے قدم بھی نہ جما سکی اور سارا سیاسی نظام جاگیرداروں اور فوج کے ہاتھ میں چلا گیا، بلکہ فوج پر بھی جاگیرداروں ہی کا تسلط قائم ہے۔ یہ تاریخی حقیقت بھی جاگیرداروں اور جماعت اسلامی جیسی تنظیموں کے باہمی تعلق کی عکاس ہے۔

اس دوران رفتہ رفتہ مدرسوں کا تعلیمی نظام پھیلتا رہا، ساتھ ہی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کی پیش عملی نے بھی مسلم تشخص کی تشکیل میں فعال کردار ادا کیا۔ آزادی کے بعد کے اس اہم دور میں جب تمام معاشرہ نظامِ کہنہ کو خیرباد کہہ کر نئی اقدار کی تعمیر کے عمل سے گزر رہا تھا، مسلمانوں کی امیج ایک روایتی، بنیاد پرست اور اپنے ہی خول میں بند رہنے والے فرقے کے طور پر بن رہی تھی۔ ایسے ماحول میں مذہبی تعلیم مفاد پرست مذہبی رہنماؤں کا ہتھیار بن گئی اور انھوں نے اسلام کی صرف ایسی تعلیمات کی تبلیغ کو فروغ دیا جو انھیں اپنے مفاد میں سب سے بہتر نظر آئیں ـــ مثلاً یہ کہ عام لوگ ائمہ اور علما کی اتھارٹی کے بارے میں کسی قسم کے سوال نہ اٹھائیں اور مذہبی معاملوں میں عقلیت پسندی کو راہ نہ دی جائے۔ علما نے حقوق عباد کے مقابلے میں دینی ارکان کی پابندی پر مصلحتاً زیادہ زور دیا اور ہر مذہبی فریضے کی ادائیگی کے بدلے میں عالم بالا میں بے شمار ثواب ملنے کے خواب دکھائے تاکہ دنیا اور اس کے معاملات پس منظر میں چلے جائیں، اور ان مسائل اور ان کے اسباب پر غور کرنے کا عام لوگوں کو موقع نہ ملے۔ نیم تعلیم یافتہ عوام کے لیے ایسی بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں ان کتابوں میں درج طریقوں کے مطابق مذہب پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کی گئی ہے۔ تبلیغی جماعت نے از خود یہ ذمے

Scanned with CamScanner

داری لے لی کہ وہ تبلیغی نصاب کی مدد سے ناخواندہ اور بے علم مسلمانوں کے درمیان مذہب کے اس تصور کا پیغام عام کرے گی جس پر تبلیغی جماعت کے عمائدین نے اصرار کیا ہے۔ جماعت کے تبلیغی نصاب میں نماز، روزہ، حج جیسے فرائض کے فضائل بیان کرنے کے علاوہ تبلیغ کے فوائد بھی بیان کیے گئے ہیں جن میں بہت سے جھوٹے سچے اور من گھڑت قصوں کی مدد سے ایک مبینہ سچے مذہب پر چلنے کی راہ دکھائی گئی ہے۔ قرآن کا حوالہ دے کر تبلیغی جماعت کے لوگ یہ تبلیغ کرتے ہیں کہ جو لوگ ایمان والے ہیں اور جنھوں نے عمل صالح کیے، اُن کو اللہ زمین پر اقتدار بخشے گا، ان کو حیات طیبہ دے گا (مولانا وحیدالدین خاں، تبلیغی تحریک، نئی دہلی، 1994، ص 21) لیکن اس مبینہ اقتدار کی نوعیت کیا ہوگی اس پر وہ خاموش ہیں۔ تبلیغی جماعت کے مبلغین کا تقاضا اپنے پیروکاروں سے یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی لوح تقدیر پر مکمل یقین رکھیں، یعنی اپنے آپ کو پوری طرح سے تقدیر کے حوالے کر دیں، اور بدحالی اور غریبی میں بھی صبر و قناعت سے کام لیں کیونکہ صبر کرنے والوں کو مرنے کے بعد بہتر زندگی ملے گی— بالواسطہ اس پیغام کا یہ مطلب ہوا کہ چونکہ تقدیر پہلے ہی لکھی جا چکی ہے یوں حالات کو بدلنے یا بہتر بنانے کی ساری تدبیریں بیکار ہی ہوں گی، اس لیے تقدیر کو چپ چاپ تسلیم کر لینا چاہیے۔ دنیا سے بے رخی، عالم بالا کی بہتر زندگی اور صبر و قناعت کی تلقین و تعلیم میں غریبوں کے لیے بڑی کشش ہوتی ہے کیونکہ یہ خیال ان کے لیے باعثِ تسکین ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی سہی، کبھی تو ان کے دن پھریں گے۔ انھیں یقین ہوتا ہے کہ صبر و قناعت کی وجہ سے خدا انھیں زیادہ عزیز رکھتا ہے اس لیے معاشی بدحالی کے تدارک کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں اسلام کا الگ رنگ ہے تو اس سے مراد تقدیر پرست مسلمانوں کے اسلام سے ہوتی ہے (کیونکہ عرب دنیا کے صاحبِ ثروت لوگوں کا اسلام تو یکسر مختلف ہے جس میں ہر طرف امارت اور وسائل کی فراوانی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے)۔ اس طرح تقدیر پرستی کا یہ طرزِ فکر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق نئے راستے دکھانے کے بجائے عام لوگوں کو حاشیے پر دھکیلتا رہتا ہے۔ ہندستان میں مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پسماندگی اسلام کے اسی ہندستانی برانڈ کا ایک براہِ راست نتیجہ بھی کہی جا سکتی ہے۔

انگریزوں کے لائے ہوئے نئے تعلیمی نظام اور مسلم تعلیمی نظام میں بظاہر جو کشاکش نظر آتی

ہے اس کا سارا فائدہ زمینداری نظام کے پروردہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقے کو پہنچا ہے۔ اس طبقے نے ایک طرف تو مسلمانوں پر [illegible] داری قائم رکھی اور دوسری طرف نئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال کر نئی نظر کا نمائندہ بنا اور شریک اقتدار ہونے میں بھی کامیاب ہوا۔

دینی مدارس اور ترقی

جاگیردار اشراف نے روایتی تعلیم کی آبیاری غریبوں کے لیے ضروری کی لیکن اس طرح کہ اس پر ان کی گرفت بھی مضبوط رہے۔ غالباً اس کا ایک سبب یہ تھا کہ جاگیرداروں کے اقتدار کی بقا دراصل ایک ایسے نظام کی بقا میں مضمر تھی جس میں جاگیردارانہ اقتدار قائم و دائم رہ سکیں۔ پسماندہ مسلمانوں کو جاگیردارانہ اقتدار کے پروردہ مسلم رہنماؤں نے بار بار یہ یقین دلایا کہ ان کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ، یعنی اسلام، خطرے میں ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کا ایک نکاتی ایجنڈا یہ رہا کہ وہ روایتی تعلیمی نظام (یعنی مدارس) کی ہر طرح سے حفاظت کریں اور اسے ختم نہ ہونے دیں کیونکہ ان کے خیال میں مدرسوں کی بقا میں ہی دراصل اسلام کی حفاظت مضمر تھی۔ آج بھی یہ تصور مسلمانوں کے درمیان عام طور پر رائج ہے کہ مدرسے ہی دراصل وہ ادارے ہیں جنھوں نے اسلام کو بچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ بیچارا مسلمان جو مدرسوں کو اسلام کا محافظ سمجھتا ہے اس کا ذہن اس سامنے کی حقیقت کو نہ دیکھ سکا کہ وہ اکثر حضرات جنھوں نے انھیں مدرسوں کے نظام تعلیم کی طرف راغب کیا، خود اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم کے پرائیویٹ اسکولوں، یعنی پبلک اسکولوں اور کانونٹوں میں بھیج رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے یوروپ اور امریکہ تک بھیجتے ہیں۔ مسلم عوام کی عمومی سیاسی کم فہمی اور تعلیمی پسماندگی کے سبب یہ روایتی تعلیمی نظام آج بھی اسی طرح سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے جس طرح یہ آزادی سے پہلے تھا۔ تبدیلی صرف اتنی واقع ہوئی ہے کہ اب ہندوستان میں مذہبی اداروں کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان میں ایسے بھی لوگ مل جائیں گے جنھوں سینٹ اسٹیفنز کالج اور دہلی پبلک اسکول جیسے قابل رشک اداروں میں تعلیم پائی لیکن اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے غریبوں کے اسلام سے وابستگی کو اپنا مقصد بنایا۔ (چند برس پہلے میری ملاقات جمعیۃ العلمائے ہند کے صدر دفتر، دہلی، میں سینٹ اسٹیفنز کالج کے سابق طالب علم سے ہوئی

Scanned with CamScanner

جواب وہاں ایک اہم عہدے پر فائز ہیں۔ یقیناً اس کیریئر کے سبب انھیں جلد یا۔ دیر کوئی نہ کوئی قائدانہ رول بھی مل جائے گا اور کم از کم سماج میں ایک منفرد معزز مقام تو مل ہی گیا۔) علما اور مولویوں کے خاندانوں میں مذہب سے باہر شادی کرنے کی بھی مثالیں مل جائیں گی۔ ہر قسم کے سیاسی مفاد کے لیے مسجد کے اماموں کی سیاست کرنے والے مولانا جمیل الیاسی کے بیٹے صہیب الیاسی کی مثال بالکل سامنے کی ہے۔ وہ معروف ٹی وی اینکر ہے، جدید تعلیم یافتہ ہے، اور اس نے ایک غیر مسلم خاتون سے شادی بھی کی جس کی موت کے بعد وہ آج تک اس شک کے دائرے سے باہر نہیں کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کیا۔ جو لوگ اس معاملے سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انجو الیاسی کی آخری رسوم ہندو مذہب کے مطابق ادا کی گئی تھیں۔ یہ طرز زندگی روایتی مسلم گھرانوں کو بھی قبول نہیں ہوتا، چہ جائیکہ مذہبی رہنماؤں کے گھرانے۔ سوال یہ ہے کہ یہ طرز زندگی ہندوستان کے بڑے شہروں میں رہنے والے اعلیٰ متوسط طبقے کے اکثر ہندو یا مسلمان لوگوں سے کس طرح مختلف ہے؟

مذہبی اداروں سے متعلق لوگوں کی ذاتی زندگی کے حوالے سے اپنی بات یہیں ختم کرتی ہوں، اور اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہوئے اس بات پر زور دینا چاہتی ہوں کہ مدرسوں کا ارتقا ایسے اداروں کی صورت میں ہوا ہے جہاں عموماً وہ غریب مسلمان پڑھتے ہیں جن کے لیے کسی اور ذریعے سے تعلیم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ مدرسوں کے تمام اخراجات، طلبا کے کھانے پینے اور رہائش کے انتظامات مسلمانوں کے دیے ہوئے عطیات اور زکوٰۃ سے کیے جاتے ہیں لیکن نظام کچھ ایسا بن گیا ہے کہ طلبا کی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے سوا کسی اور قسم کی سہولت انھیں فراہم نہیں کی جاتی اور اس طرح مدارس کی آمدنی کا زیادہ حصہ مہتممین کے مفادات کی نذر ہو جاتا ہے۔ علم کے حصول کے لیے دوسری سہولتوں سے محروم ان طالب علموں کو تین سو برس سے بھی زیادہ قدیم درس نظامی پڑھایا جاتا ہے جس کے سبب طالب علم عصر حاضر کے علوم سے نابلد رہتے ہیں اور نتیجتاً آج کی ضرورتوں اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہو پاتے۔ نہایت دقیق اور از کار رفتہ عربی اور فارسی نصاب کی کتابیں طالب علموں میں شاید ہی کوئی دلچسپی خود سے کچھ اور پڑھنے کی خواہش پیدا کر پاتی ہوں۔

تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ طبقات سے آنے والے بہت سے طالب علموں کے لیے

Scanned with CamScanner

مدرسے کی تعلیم مذہبی مدرّس کے طور پر روزگار کی ضمانت بن جاتی ہے۔ قصبوں اور دیہاتوں کی مسجدوں میں موذن، امام اور مدرّس کے طور پر انھیں کام مل جاتا ہے۔ یہ نظام سیکڑوں برس سے اسی طرح جاری وساری ہے۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے آج بھی جگہ جگہ کھل رہے ہیں اور ان میں مدرسوں کے فارغین کو روزگار بھی مل جاتا ہے۔ اس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اپنے آپ میں مطمئن پسماندہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے سرکار سے کوئی مطالبہ نہیں کرتے اور ان کا ایک بڑا حصہ حکومت کی اس توجہ سے محروم ہے جو دوسرے پسماندہ طبقات کو حاصل ہے۔ اسلام جو اپنے ماننے والوں سے جدوجہد اور حرکت کا مطالبہ کرتا ہے، مسلم معاشرے میں ہر طرح کی بے عملی کا استعارہ بن کر رہ گیا ہے تو اس کی وجہ وہی تعلیم ہے جو صبر وقناعت اور استغنا کے نام پر مسلمان کو دی جاتی رہی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندستان کی سرزمین پر جمہوری نظام حکومت کے استحکام کے ساتھ مدارس کے اس روایتی نظام کی اہمیت آہستہ آہستہ کم ہو جاتی اور نئی تعلیم کے دروازے سب طبقات کے لیے کھل جاتے لیکن کئی اسباب سے ایسا نہ ہو سکا۔ نام نہاد جمہوری حکومتوں نے مسلمانوں کی فلاح کے معاملات میں بے حسی کی پالیسی اختیار کی اور اس طرح اکثر مسلمان تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندگی میں جیتے رہے۔ جاگیرداروں کے شدید احتجاج کے باوجود آزاد ہندستان میں جس سیاسی عزم کے ساتھ زمینداری کا خاتمہ کیا گیا تھا اگر اُسی عزم کے ساتھ مسلمانوں کے درمیان نئی تعلیم کو متعارف کرانے کا کوئی منصوبہ بنایا جاتا تو شاید حالات مختلف ہوتے۔ حکومت کی بے حسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداری کے خاتمے کے باوجود مسلمانوں کے سماجی ڈھانچے میں اور اس طرزِ معاشرت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی جس پر مذہب اور مذہبی اداروں کی اجارہ داری تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ نیا جمہوری سیاسی نظام ایک ایسی موثر متبادل تعلیمی پالیسی تیار کرتا جس میں مسلمانوں میں نئی تعلیم بھی مروج ہوتی اور عام مسلمان یہ بھی محسوس نہ کرتے کہ ان کی مذہبی شناخت معدوم ہو رہی ہے۔ یہ کام ان کی تہذیبی شناخت کی حفاظت کے اقدام کر کے کیا جا سکتا تھا۔

تاریخی حالات کچھ اس طرح کے رہے ہیں کہ ہندستان کے تقریباً سب مسلمان اردو زبان کو اپنی تہذیبی اور مذہبی شناخت کی ایک اہم علامت مانتے ہیں۔ اردو مسلمانوں تک کن حالات میں محدود ہو گئی اور صرف انھی کی شناخت کیسے بن گئی، یہ ایک علیحدہ اور پیچیدہ بحث ہے جس میں پڑنے کی

Scanned with CamScanner

گنجائش اس مضمون میں نہیں ہے۔ لیکن یہ بتانا ضروری ہے کہ آزادی ملنے کے ساتھ ہی تمام سرکاری اسکولوں سے اردو زبان کی تعلیم کا نظام یک جنبشِ قلم ختم کر دیا گیا تھا۔ اردو کے خلاف یہ تعصب اس لیے برتا گیا تھا کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان بنائی گئی تھی، اور مسلمان اور اردو تقسیم کے ذمے دار ٹھہرائے گئے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف ماحول اس طرح سے بنا کہ جمہوری نظام نافذ ہونے کے باوجود مسلمان عملی طور پر دوسرے درجے کے شہری بن گئے اور ان کو اکثریتی تعصب کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس حقیقت کو بھلا کر کہ اردو مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ تہذیبی وراثت ہے اور جدوجہدِ آزادی میں اس زبان کے ادب، صحافت اور بولنے والوں کا نمایاں کردار رہا ہے، اردو کو، اور اس کو اپنی زبان کہنے والے مسلمانوں کو، ہندوستان کی نئی جمہوری حکومت نے یہ سزا دی کہ اس زبان کے تعلیمی نظم کا یکسر خاتمہ کر دیا۔ آئندہ برسوں میں مسلمان اسی خوف میں جیتے رہے کہ آہستہ آہستہ ان کی تہذیبی اور مذہبی شناخت بھی ختم کر دی جائے گی۔ اسکولوں میں جو نظامِ تعلیم رائج ہوا، ایک تو وہ کافی حد تک فرقہ وارانہ خطوط پر مرتب کیا گیا تھا، دوسرے اس میں سے اردو کو جس طرح خارج کیا گیا اس کے سبب مسلمانوں کے یہ خدشات بے جا نہ تھے کہ اس تعلیمی نظام میں ان کے بچے اپنی شناخت کھو بیٹھیں گے۔ سیکولر جمہوری حکومت کی ذمے داری تھی کہ مذہبی اور تہذیبی شناخت ختم ہونے کے اس خوف کو دور کرنے کے لیے پرائمری سطح پر اردو زبان والوں کے لیے اردو کو ذریعۂ تعلیم رکھا جاتا۔ مگر اس مطالبے اور اس کے نفاذ کے لیے جس سیاسی بصیرت کی ضرورت تھی وہ یا تو ہندوستان کے مسلم سیاسی رہنماؤں میں موجود نہ تھی یا پھر وہ حالات سے مجبور تھے۔ اس بے یقینی کے ماحول میں، اور سرکار کے معاندانہ رویے کے ردِ عمل میں دینی مدارس کے نظام کو نئی قوت اور توانائی ملی۔

اس پس منظر کو سمجھے بغیر مدرسوں کو تنگ نظر اور کٹر ادارے کہہ دینا مسئلے کا بڑا سہل پسندانہ تجزیہ ہوگا۔ مدرسوں کی صحیح صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں ان کے ساختیاتی ڈھانچے کو سمجھنے سے بھی مدد ملے گی۔ مثال کے طور پر مکتب کو لیجیے جہاں بچے کو قرآن پڑھانے کے ساتھ مذہبی ارکان کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ مکتب تقریباً ہر محلے کی مسجدوں میں کل وقتی یا جز وقتی طور پر چلائے جاتے ہیں اور ان میں پڑھنے والے طالب علم بھی ہر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ عموماً اسکول میں کلاسیں کرنے کے بعد ہی طلبا جز وقتی مکتبوں یا شبینہ مکتبوں میں مذہب کی تعلیم حاصل کرنے جاتے ہیں۔ اصلاحی دینی مدرسوں کا نمبر

Scanned with CamScanner

اس کے بعد آتا ہے، جہاں کل وقتی مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ اصلاحی دینی مدارس کا ایک علیحدہ اور مستقل بالذات نظام تعلیم ہے۔ گاؤں، قصبوں اور شہروں سبھی جگہ مدرسے قائم ہیں جو رہائشی اور غیر رہائشی دونوں طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کے اخراجات زیادہ تر زکوٰۃ اور عطیات پر منحصر ہوتے ہیں۔ رہائشی مدرسوں میں عموماً بے حد غریب طبقات کے بچے آتے ہیں اور اس طرح یہ مدرسے غریب بچوں کی پرورش کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ بہت سے یتیم خانے بھی اپنے یہاں اسی طرح کی مذہبی تعلیم کا اہتمام کرتے ہیں۔

مذہبی تعلیم کے اعلیٰ ترین ادارے وہ ہیں جن کو ہم مذہبی دانش گاہوں سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ تمام مسالک کے لوگوں نے ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً اپنے یہ ادارے قائم کیے اور اب یہی دارالعلوم مذہبی اور نظریاتی دانشوری کے اعلیٰ ترین مراکز ہیں۔ ان بڑے مراکز سے مذہب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو چھوٹے مدرسوں میں، اور چھوٹے مدرسوں کے فارغین کو مکتبوں اور مسجدوں میں تدریس اور مذہبی ارکان ادا کرنے کی ذمے داریاں مل جاتی ہیں اور ان کے روزگار کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ اس طرح مدرسوں کا یہ نظام امداد باہمی کے اصول پر چلتا ہے اور خاصا مضبوط ہے۔ انحصار باہمی کے سبب یہ نظام مسلسل وسعت پذیر ہو رہا ہے، یہ اپنے آپ میں ایک ایسا معاشی نظام بھی ہے جس کے اردگرد بہت سے لوگوں کے معاشی مفادات طواف کرتے ہیں۔

مدرسوں کی تعداد میں اضافے کا ایک لازمی نتیجہ مذہبی شدت پسندی میں اضافے کی صورت میں بھی سامنے آتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ مذہبی شدت پسندی کے دوسرے اسباب بھی ہیں جن کا تجزیہ ایک علیحدہ مضمون میں کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس جانب توجہ دلانا مطلوب ہے کہ اگر علما اور مسلم رہنما غور کرتے اور اپنے سماج میں تبدیلی لانا اور اسے ترقی یافتہ بنانا انھیں مقصود ہوتا تو وہ زکوٰۃ اور وقف کے پیسے سے مذہب کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنے/کرانے کی طرف بھی توجہ دیتے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتے کیونکہ اس سے وہ نظام درہم برہم ہوجائے گا جس پر ان کی اپنی بقا کا انحصار ہے۔ ایک جدید ریاست میں اس طرح کے ادارے عوام کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں لیکن حکومت کی طرف سے ان پر کسی قسم کی پابندی بھی نہیں لگائی جاسکتی۔ ویسے بھی مفاد پرست عناصر انھیں ہوا دیتے ہیں، اور ان عناصر کی اپنی طاقت ہوتی ہے جس کو سیاسی جماعتیں نظرانداز نہیں کرسکتیں۔

Scanned with CamScanner

ایک مسئلہ اور بھی ہے۔ مدرسوں میں پڑھنے والے طالب علم اب عموماً ناخواندہ یا معمولی تعلیم یافتہ گھرانوں سے آتے ہیں، اور معاشی طور پر مسلمانوں کے سب سے زیادہ پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت اس نہج پر نہیں ہوتی کہ یہ اپنے نظام تعلیم کا ازخود تنقیدی جائزہ لے سکیں۔ ان مدارس میں نئے مضامین اور نئے نظریات کی تدریس بھی نہیں ہوتی، تعلیم کا طریق کار بھی فرسودہ ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کئی صدیوں سے نصاب نہیں بدلا گیا ہے، اس لیے یہاں طالب علموں کی ذہنی تربیت صرف ہدایات سننے اور ان پر مشینی طریقے سے عمل کرنے تک محدود ہو جاتی ہے۔ سخت نظم و ضبط میں جکڑے ان طالب علموں کو مخصوص موضوعات سے ہٹ کر کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی اور نصاب کے طور پر وہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اسلام کے اس زاویے کو پیش کرتی ہیں جو صرف ملائیت کی توسیع میں معاون ہو سکے۔ ادب کے مطالعے، کھیل کود اور ٹیلی وژن جیسی چیزوں پر پابندی کے سبب دینی مدارس کے فارغین زندگی کے متنوع پہلوؤں سے واقف ہی نہیں ہو پاتے۔ ایک شہری کے طور پر مخصوص حالات میں کس طرح اپنا ردِ عمل ظاہر کریں، اور ان حالات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کریں جو ہندستان جیسے تکثیریتی معاشرے کے پروردہ ہیں، یہ اور اسی قسم کے سوالات سے نبرد آزما ہونا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کے کسی بھی کونے میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف تو وہ اپنا جذباتی ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں لیکن غیر مسلم پامال طبقے پر ہونے والے مظالم پر وہ خاموش رہتے ہیں، جبکہ مہذب معاشرے میں اتنی تو توقع کی ہی جاتی ہے کہ آپ انسانیت کو مقدم سمجھیں اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے میں مذہبی بنیادوں پر تفریق نہ کریں۔

اس نہج پر دی جانے والی تربیت کا طالب علموں پر جس طرح کا اثر پڑتا ہے اس کے سبب کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ سیاست کے داؤ پیچوں سے لاعلم یہ سادہ ذہن طالب علم ان مفاد پرست سیاسی عناصر کے شکار ہو جاتے ہیں جن کا تعلق عموماً اعلیٰ طبقے سے ہوتا ہے۔ مذہب کے نام پر ان کو گروہ بند کر لینا آسان ہوتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس سیاق و سباق میں اسامہ بن لادن، محمد عطا اور عمر شیخ جیسے لوگوں کی مثال دی جا سکتی ہے جنھوں نے مذہب کو ہتھیار بنا کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور مدرسے کے طالب علموں کو رضاکاروں اور فدائین کے طور پر بھرتی کرنے کی پالیسی

Scanned with CamScanner

اختیار کی۔ القاعدہ جیسی تنظیموں کے اکثر معروف لیڈر مغربی ممالک کے سیکولر تعلیم کے اداروں کے فارغین ہیں جو ابتدا میں امریکی مفادات کی خدمت بھی انجام دے چکے ہیں۔

ہندستان میں بھی، مذہب کے استحصال کی کئی بڑی نمایاں مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مخصوص مسلم آئیڈیالوجی سیاست کے افق پر انیسویں صدی کے نصف آخر سے سامنے آنا شروع ہوئی۔ پھر بیسویں صدی کی ابتدا میں دیوبند تحریک کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ کچھ عرصے بعد جماعت اسلامی جیسی تنگ نظر اور احیا پرست جماعتیں مذہب کے مرکزی حوالے سے اپنے پرچم تلے مسلمانوں کو جمع کرنے کی کوششوں میں کامیاب ہونا شروع ہوئیں۔ کے ایم اشرف نے اپنی کتاب An Overview of Muslim Polity in India میں اس امر کی جانب اشارہ کیا ہے کہ 1912 اور 1924 کے درمیان احیا پرست قوتوں کی قیادت میں شروع ہونے والی تحریکیں (مثلاً احرار لیگ اور بعد میں علی برادران کی خلافت تحریک) اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام ہوتی رہیں۔ اپنے موقف کو مزید واضح کرتے ہوئے اشرف لکھتے ہیں ''اس قسم کی ناکامیوں کا مسلسل منود یکھتے دیکھتے مسلمان عموماً بددل اور مایوس ہو چکے ہیں اور بزرگ عمائدین پر مزید بھروسا کرنے کو تیار نہیں۔۔۔۔ مایوسی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی پراگندگی ہر سو نظر آتی ہے۔''
مایوسی اور ذہنی پراگندگی کی اسی کیفیت کا شکار مسلم نوجوان طبقہ آج بھی ہے کیونکہ معاشرے کے عمومی حالات آج بھی اس کے لیے اتنے ہی غیر یقینی اور مایوس کن ہیں۔ مسلم نوجوانوں کی عمومی پسماندگی اور مایوسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مفاد پرست قوتیں ان کو مذہب کے احیا، مسلم قوم پرستی اور برادرانہ اتحاد کے نام پر نام نہاد جہاد کی غلط راہ پر ڈال سکتی ہیں۔ عموماً غریب گھرانوں سے تعلق رکھنے والے یا بے روزگار نوجوان اس قسم کے نظریات کا شکار دو وجوہ سے بہ آسانی ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ ان کی اپنی مذہبی شدت پسندی کو تسکین ملے گی، اور دوسرے یہ کہ روزی روٹی کا وسیلہ بھی فراہم ہوگا۔ دیکھا جائے تو ان کا یہ رویہ ان نیم خواندہ، غریب بے روزگار ہندوؤں سے قطعی مختلف نہیں ہوگا جو کچھ پیسوں کی خاطر یا پھر مذہب کے نام پر بڑی آسانی سے ہندو فرقہ پرست تنظیموں کے چنگل میں آتے رہے ہیں، جس کی قریبی مثالیں بابری مسجد کو توڑنے والے کارسیوکوں اور 2002 کے گجرات کے فسادات میں شریک ہونے والے آدی واسیوں سے دی جا سکتی ہیں جن کو ہندو قوم پرستی کی تحریک میں شامل کرنے

Scanned with CamScanner

کی منظم کوششیں سنگھ پریوار عرصے سے کر رہا ہے۔

اس قسم کی صورت حال کو روکنے کا سب سے بہتر طریقہ تو یہی ہوگا کہ ان حالات کو تبدیل کر دیا جائے جن کے سبب نوجوانوں کے جہادی تنظیموں میں شامل ہونے کے امکانات رہتے ہیں، اور حالات کو اس طرح سازگار بنانے کی کوششیں کی جائیں کہ وہ نئے حالات پر اعتماد کرتے ہوئے مثبت طرزِ فکر اختیار کریں۔

ہندستان میں مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان کے حقیقی مسائل کی طرف کوئی بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ یہ مسائل دراصل ان کے تعلیمی اور اقتصادی مسائل ہیں۔ اس سلسلے میں بے حسی کا جو عام ماحول پایا جاتا ہے اس کی ایک بڑی وجہ مسلمانوں کا یہ مزاج بھی ہے کہ مساوی حقوق کے حامل شہری کے طور پر وہ اپنے حقوق کا مطالبہ نہیں کرتے اور اس کے بجائے اس مایوسانہ ردِعمل میں کہ حکومت ان کے لیے کوئی سہولت کبھی فراہم نہیں کرے گی، وہ مدارس کے فروغ اور تحفظ کی بات کرتے ہیں۔ قومی سطح پر سیاسی جماعتیں بھی مسلمانوں کی فکر میں تبدیلی لانے کی کوئی مثبت کوشش نہیں کرتیں۔ وہ صرف سیاسی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ حمایت اور مخالفت کے تمام رشتے ووٹ بینک کی سیاست کے مطابق بنتے اور بگڑتے ہیں، اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ ووٹ بینک کی سیاست نے آج جو راستہ اختیار کیا ہے اس میں ہمارا موجودہ سماجی و سیاسی ڈھانچہ مسلمانوں کو مزید پسماندگی کی طرف دھکیل رہا ہے۔ ورنہ ایسا کیوں ہوتا کہ کانگریس جیسی سیاسی جماعتیں جو خود کو اقلیتوں کے حقوق کی محافظ سمجھتی ہیں اور سنگھ پریوار کی فرقہ پرست سیاست کی مذمت کرتی ہیں، عملی طور پر اقلیتوں کے مفاد میں کوئی ایسا بامعنی قدم نہیں اٹھاتیں جس سے اقلیتوں کا واقعی بھلا ہو؟ تقریباً پچاس سال تک ہندستان پر حکومت کرنے کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر توجہ دینے کی زحمت کیوں نہیں کی؟ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کی ترقی کی رفتار کا گراف دوسرے فرقوں سے نیچا کیوں ہے؟ وقتاً فوقتاً سامنے آنے والی سروے رپورٹیں آخر یہ کیوں بتاتی ہیں کہ ملازمتوں کے شعبوں میں مسلمانوں کی تعداد لگاتار گھٹ رہی ہے۔ مسلم علاقوں میں سرکاری اسکولوں کی تعداد ناکافی کیوں ہے؟ کیا یہ صورت حال مسلمانوں کی اسی ناز برداری کا نتیجہ ہے جو کانگریس (سنگھ پریوار کے مطابق) مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے کرتی رہی ہے؟ اسے آپ محض بے اعتنائی کہیں گے یا پھر سوچا سمجھا تعصب؟ یہ بات

Scanned with CamScanner

سب مانتے ہیں کہ پسماندہ طبقات کی فلاح کے لیے مثبت امتیازی اقدامات کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی دور کرنے کے لیے کتنی اور کون سی بامعنی اسکیمیں جاری کی گئیں؟

حقیقت یہ ہے کہ کانگریس میں کسی دور میں کالی بھیڑوں کی کمی نہیں رہی۔ ہٹلر کے ان مداحوں اور فرقہ پرستوں کو اپنے تعصب کا زہر پھیلانے کا موقع اس وجہ سے حاصل رہا کہ کانگریس کی لیڈر شپ نے ہمیشہ ایک مجرمانہ خاموشی اختیار کر کے ان کو شہ دی۔ اکثر تعصب پرست لیڈر مسلمانوں کے خلاف متعصبانہ رویے کا یہ جواز دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے دو قومی نظریے کو فروغ دیا اور وہ ملک کی تقسیم کے ذمے دار ہیں۔ اس الزام کو اس لیے قبول نہیں کیا جا سکتا کہ ایک تو تقسیم کا معاملہ اتنا سیدھا نہیں کہ ایک ایسے فرقے پر اس کی ساری ذمے داری ڈال دی جائے جس نے ملک کی تقسیم کا خاکہ ہرگز تیار نہیں کیا تھا۔ دوسرے ان سیاسی لیڈروں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندستان بہرحال ایک سیکولر جمہوریت ہے، مذہبی ریاست نہیں۔ ملک کو سچ مچ سیکولر اور جدید ریاست بنانے کی کوششیں اگر کی جاتیں اور آئین کی ہدایات کے مطابق کمزور طبقوں کو مضبوط بنایا جاتا تو آج حالات اتنے ابتر نہ ہوتے جتنے وہ ہو چکے ہیں۔ لیکن ووٹ بینک کی سیاست نے معاشرے میں اپنی جڑیں اس طرح مضبوط کر لی ہیں کہ اس کے سبب بہت سے طبقات کی ترقی کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ آج کا سیاسی ڈھانچہ جس میں مسلمان مسلسل پسماندگی کی طرف جا رہا ہے، وہ دراصل کانگریسی حکمرانوں کی پالیسیوں ہی کا نتیجہ ہے۔

مثال کے طور پر مدرسوں کی جدید کاری کی معروف اسکیم کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کی بنیاد راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے دوران پڑی تھی اور جس کا سیاسی فائدہ مرلی منوہر جوشی نے این ڈی اے کے دور حکومت میں فروغ انسانی وسائل کے وزیر کی حیثیت سے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ مدرسوں میں جدید کاری کی یہ اسکیم کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی کیونکہ مدارس کا بنیادی مقصد جدید طرز تعلیم کی فراہمی ہرگز نہیں ہے۔ ان کا رول مذہبی معاملات کے دائرے سے باہر نہیں ہے، اور اسی لیے مدارس جدید تعلیم کے اسکولوں کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ مدرسوں کے لیے معمولی رقم مختص کر کے حکومت مسلمانوں کے ایک بڑے مسئلے کے تئیں اپنی ذمے داریوں سے دامن بچا رہی ہے۔ مدارس کی جدید کاری کا جو

Scanned with CamScanner

وحشت ور اور پیشی ہے وہ نہ تو حکومت کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ مسلمان ہی اس سے خوش ہیں کیونکہ اس قسم کی سرکاری اسکیموں کو وہ اپنے مذہبی معاملات میں مداخلت سے تعبیر کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان رقوم کا بھی وہی حشر ہوتا ہے جو دوسری فلاحی اسکیموں کا۔ یعنی اسکیم چلانے والے سرکاری افسر اور رضا کار تنظیموں کے ذمے داران کر انھیں ڈکار جاتے ہیں اور معمولی رقم ہی متعلقہ مقاصد پر خرچ کی جاتی ہے۔

ان حالات میں ایک مذہبی فرقے کے طور پر مسلمانوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ آج کے دور میں ان کی ضرورت صرف روایتی دینی مدرسے نہیں ہیں بلکہ انھیں اس جدید تعلیم کی بھی ضرورت ہے جسے اختیار کر کے دوسری قومیں ترقی کی راہوں پر آگے بڑھ رہی ہیں۔ پیچھے کی طرف دیکھتے رہنے یا جدید تعلیمی نظام کے چند نقائص کی نشان دہی کر کے اسے چھوڑ دینے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے اور بالخصوص روشن خیال نوجوان طبقے کو اس ضمن میں فعال کردار نبھانا ہوگا۔ سیاسی شعور کا ثبوت دیتے ہوئے انھیں کمیونٹی اسکولوں کے قیام کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے اور اس کے لیے تمام وسائل کی خبر رکھتے ہوئے سرکاری انتظامیہ کو متوجہ کرنا اور اس پر دباؤ ڈالنا چاہیے کہ وہ لوگوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرے۔

اس ضمن میں ایک حکمت عملی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمان سیاسی اکائی کے طور پر سیاسی جماعتوں کو اپنی قوت کا احساس کرائیں اور حکومت سے تعلیمی سہولتوں کا مطالبہ کریں۔ اس طرح کو آہستہ ہی سہی، لیکن یہ سہولتیں مہیا ہو جائیں گی۔ حالات سے بھرپور استفادے کے لیے مسلمانوں کو عہد وسطیٰ کے گرد طواف کرنے والے اپنے طرز فکر سے بھی نجات حاصل کرنی ہوگی۔

کتابیات

(1) سید مناظر احسن گیلانی، ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی، 1987۔

(2) قمر الدین، ہندستان کی دینی درس گاہیں، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا کل ہند سروے، دہلی، 1996۔

(3) سلامت اللہ، ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1990۔

(4) خطبات سرسید، جلد اوّل و دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1972۔

(5) کے ایم اشرف، *An Overview of Muslim Politics in India*، مانک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2001۔

(6) مولانا وحید الدین خاں، تبلیغی تحریک، نئی دہلی، 1994۔

❀❀

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت: 80 روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت: 200 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

ادبستان
(مضامین)
قیمت: 120 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 150 روپے

طاؤس چمن کی مینا
(کہانیاں)
(دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
(زیر طبع)

شفاء الدولہ کی سرگزشت
(تنقید و تحقیق)
(زیر طبع)

Scanned with CamScanner

ساجد رشید

ایک مردہ سر کی حکایت

پانچ چالیس کی ویرار فاسٹ لوکل ٹرین

اس نے سر اٹھا کر چرچ گیٹ اسٹیشن کا انڈی کیٹر دیکھا اور بائیں کندھے پر لٹکے ریگزین کے بھاری سرخ بیگ کو دائیں کندھے پر منتقل کیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ اس کا رخ پلیٹ فارم نمبر 3 کی طرف تھا۔ شام 5 بج کر 40 منٹ کی فاسٹ لوکل ٹرین میں سوار ہونے کے لیے لوگ پلیٹ فارم کی طرف دوڑ رہے تھے۔ دفتروں میں کام کرنے والی عورتیں اپنے کندھوں پر ٹنگے پرس اور بیگ کے بوجھ کو سنبھالے، دھکے کھاتی اور دھکے دیتی، لیڈیز کمپارٹمنٹ کی طرف بھاگ رہی تھیں گویا یہ آخری ٹرین ہو۔ وہ صبح ہی سے مصروف تھا اور اس وقت کافی تھک گیا تھا۔ بس اپنی مطلوبہ ٹرین کی کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ کر سارے دن کی ہی نہیں زندگی بھر کی تھکن اتارنا چاہتا تھا۔

فرسٹ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک خالی سیٹ پر پڑی۔ وہ بیگ کو سنبھالتا ہوا سیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کانوں میں ہیڈ فون لگائے ایم پی تھری سننے میں مگن نوجوان نے لپک کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر کتنی دیر بیٹھے گا اس سیٹ پر!'' اب تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنے بیگ کو اچک کر سامان رکھنے والے ریک پر رکھ دیا اور راہداری میں آ کر سر پر جھولتے ہینڈل کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹرین ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ چل پڑی۔ ٹرین کی رفتار کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن نے بھی رفتار پکڑ لی... دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ.. چرنی روڈ... گرانٹ روڈ... دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ... ممبئی سینٹرل... مہالکشمی...

دادر... دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ... لوکل دوڑ رہی تھی، لوگ اتر رہے تھے، چڑھ رہے تھے اور ڈبے میں بھری مرغیوں کی طرح بھرتے جا رہے تھے۔ اس کے باوجود ان کے درمیان تاش کی بازی، گفتگو کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ روزانہ کے مسافر تھے جو عرصے سے ایک مخصوص لوکل ٹرین میں ایک ہی ڈبے میں ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کی بوریت کو کم کرنے کے لیے تاش کھیلتے یا ہنسی مذاق کرتے۔ باندرہ اسٹیشن گذر چکا تھا۔ بھیڑ نے اسے دھکیل کر دو سیٹوں کے درمیان کی جگہ میں لا کھڑا کیا تھا۔ اب وہ اس ریک کے کافی قریب کھڑا تھا جس پر دوسرے سامانوں کے ساتھ اس کا سرخ بیگ بھی رکھا ہوا تھا۔ دفعتاً سیل فون بج اٹھا۔ اس نے فون کو کان سے لگایا اور ٹرین اور مسافروں کے شور میں چیخ چیخ کر کچھ کہا اور گھڑی میں وقت دیکھ کر کال کو منقطع کر دیا۔ اس نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ اس کی نظریں کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھے تھل تھل جسم والے آدمی پر ٹھہر گئیں جو گٹکا چباتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ... سانتا کروز گذر رہا تھا، اگلا اسٹیشن اندھیری تھا۔ اس نے جلدی سے گھڑی دیکھی اور سیل فون پر نمبر ملا ہی رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بہت زوردار دھماکہ ہوا...

ڈبے میں بیٹھے اور کھڑے لوگ کسی فوٹو فریم کی طرح دو تین بار گھوم گئے... اس کا جسم پوری قوت سے اچھل کر فرش پر گرنے تک گوشت کے چھوٹے بڑے لوتھڑوں کی شکل میں بکھر گیا تھا اور جسم سے جدا سر کسی گیند کی طرح چھت سے ٹکرا کر لہو کے چھینٹے اڑاتا ہوا لوہے کے فرش پر گر کر اچھلا تھا اور لڑھکتا ہوا ایک سیٹ کے ڈھانچے کے پائے سے ٹکرا کر ہلکے سے ارتعاش کے بعد تھم گیا تھا... پیٹ کسی غبارے کی طرح ایک دم سے پھول کر پھٹ پڑا تھا اور پھر ایک بہت لمبی سیٹی بجی تھی جیسے پریشر کُکر سے بھاپ خارج ہو رہی ہو... شوووووو...و...و...وا!

منٹ کے ہزارویں سیکنڈ میں اس کی آنکھوں نے دماغ تک اس منظر کو منتقل کیا۔

لوہے کی مضبوط چادر کی چھت ایسے ادھڑ گئی تھی جیسے اس پر کوئی عظیم الجثہ فولادی گھونسا پوری قوت سے پڑا ہو۔ چھت پر لگے پنکھے ٹیڑھے ہو کر دائروں سے لٹک گئے تھے۔ کھڑکی کی جگہ بہت بڑا دروازہ سا بن گیا تھا... قریب ہی ایک خون میں سنا ہوا جوتا پڑا تھا۔ ایک جیبی پرس کھلا پڑا تھا جس میں سے کچھ نوٹ اور پونی ٹیل والی ایک مسکراتی بچی جھانک رہی تھی جس کی پیشانی اور ہونٹوں پر خون کے چھینٹے جم گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک مٹھی کھلی پڑی تھی جس میں گٹکے کا پھٹا ہوا پاؤچ دبا ہوا تھا... ایم

Scanned with CamScanner

پلی تھری سننے والے نوجوان کے کانوں سے خون بہہ کر جبڑوں تک آ گیا تھا اور وہ پھیلی ہوئی آنکھوں سے خلا میں گھور رہا تھا... پیٹ کے نیچے خون میں لت پت آنتوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا... دہشت، صدمے اور وحشت بھری چیخیں دائرہ بناتی گونج کی طرح پھیلتی جا رہی تھیں۔ چپلوں، سینڈلوں اور بھاری بوٹوں والے پیر، خون کے تھکوں کو روندتے ہوئے کٹے پھٹے جسموں کو لانگھتے ہوئے لوہے کے گندے فرش پر چل رہے تھے، بے شمار بازو بڑی پھرتی سے چیتھڑا چیتھڑا جسموں، کٹے پھٹے اعضا اور لاشوں کو اسٹریچر پر اور انسانی گوشت کے لوتھڑوں کو چادروں میں سمیٹ رہے تھے... پھٹی پھٹی منجمد آنکھوں نے یہ سارا منظر دیکھا اور سکنڈ کے ہزارویں لمحے میں اس کے مردہ ہونٹوں پر ایک ایسی اطمینان بخش سرد مسکراہٹ کھنچ گئی جو کسی غیر حتمی کام کو انجام دینے کے بعد از خود چہرے پر آ جاتی ہے۔

لاوارث سر کا معما

سڑتے انسانی گوشت اور خون کی بدبو تھی جو اس بے حد دبیز تاریکی میں دم گھونٹ دینے والی گیس کی طرح بھری ہوئی تھی۔ خون تک کو منجمد کر دینے والے اس سرد اندھیرے کے بھیتر وقت بھی جیسے منجمد ہو گیا تھا۔ یہ اندھیرا قبر کی تاریکی کی طرح خوفناک تھا... اس نے وقت کا میزان لگانا چاہا۔ شاید وہ سینکڑوں ہزاروں برسوں سے قبر کی اس تاریکی میں یوم حساب کا انتظار کر رہا تھا...

گھرگھراہٹ کے ساتھ گھپ اندھیرے میں مستطیل دودھیا روشنی ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ احتساب کا وقت آ پہنچا ہے۔ کچھ خاکی وردی پوش سامنے کھڑے دکھائی دیے، ان کے ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھے ہوئے تھے اور منھ پر رومال بندھے تھے۔ وردی اور کیپ سے افسر معلوم ہونے والے پختہ عمر کے آدمی نے ریم لیس عینک پہن رکھی تھی۔

"ویری اسٹرینج، تین ہفتے سے زیادہ ہو گیا ہے انسپکٹر چوہان، کسی نے اب تک کلیم نہیں کیا!"

عینک والے افسر نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلیوں کی گرفت لوہے کے شکنجے کی طرح مضبوط تھی۔ وہ غور سے اس مردہ سر کو دیکھ رہا تھا جو تین ہفتوں سے 4 ڈگری سیلسیس درجۂ حرارت پر محفوظ رکھنے کے کیمیاوی عمل کی وجہ سے سوج کر عام سروں سے کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے پرخچے اس طرح اڑے تھے کہ سر کے علاوہ بدن کا کوئی عضو سلامت نہیں بچا تھا۔ جسم سے علیحدہ

ہوتے ہی بھیجے میں سے سارا خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس کی دونوں ساکت آنکھیں کھلی ہوئی تھیں جو بالکل سپید تھیں۔ جبڑا ٹوٹ کر ٹیڑھا ہو گیا تھا، پھولی ہوئی خفیف سی ترچھی ناک، موٹے ہونٹ اور کشادہ پیشانی والے اس مردہ چہرے کے اوپری ہونٹ کے گوشے میں کسی پرانے زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔

''کتنی ڈیڈ باڈیز ہوں گی؟'' عینک والے افسر نے پوچھا۔

''اب اس کٹے ہوئے سر کے علاوہ صرف ایک ان کلیمڈ ڈیڈ باڈی رہ گئی ہے۔ باقی سب کے وارث آ کر لے گئے۔'' انسپکٹر چوہان نے جواب دیا۔

''ہوں... مرنے والوں کے وارث کو گورنمنٹ نے پانچ لاکھ روپے معاوضہ دینے کا اعلان کیا ہے۔'' عینک والے افسر نے اس پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد تو کسی نہ کسی کو کلیم کرنا ہی چاہیے تھا۔''

''سر ایک عورت اپنے لنگڑے بچے کو تلاش کر رہی ہے، وہ روز صبح اپنے بیٹے کو گود میں لے کر پہنچ جاتی ہے۔''

''اس کھوپڑی کو دکھایا تھا اس کو؟''

''ہاں، وہ بتا رہی تھی کہ اس کا بچہ کالا تھا، یہ تو گورا رہا ہوگا۔ میں نے اس کو وہ اکلوتی ان کلیمڈ باڈی کو بھی دکھایا تھا لیکن اس کا پورا شریر اتنی بری طرح جل گیا ہے کہ شناخت پوسیبل نہیں ہے۔''

''جب تک اس سر کی شناخت نہیں ہوتی ہمیں اس کو سُرکھشت رکھنا ہوگا۔''

''سر، میں نے ایک عجیب بات نوٹ کی ہے۔'' انسپکٹر چوہان نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا۔

''کہو۔'' پولیس افسر نے عینک کے پیچھے سے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''سر اسے غور سے دیکھیے۔'' اس نے مردہ سر کے زرد چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے یہ... یہ آخری شنوں (لمحوں) میں مسکرا رہا تھا۔''

افسر نے پہلے تو اپنے نوجوان ماتحت انسپکٹر کو دیکھا جسے وہ سر اب بھی مسکراتا ہوا لگ رہا تھا۔ پولیس افسر نے غور سے مردہ سر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے، دانت بھینچے ہوئے تھے جن پر خون جم کر سیاہ ہو رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹ اپنی فطری ساخت سے کچھ زیادہ کھنچے ہوئے

Scanned with CamScanner

ہیں جسے انسپکٹر چوہان مسکراہٹ سمجھ رہا ہے۔

''ویہاٹ رَبش!'' عینک والے افسر نے سر جھٹک کر کہا۔ ''مرنے والا آخری لمحوں میں بھی مسکرا سکتا ہے! میں یہ پہلی بار سن رہا ہوں!''

ہر لمحہ زندگی ہر سانس میں موت

وہ کانپور کے دیہات کا باشندہ تھا۔ بچپن میں ہی والدین گذر گئے تھے۔ پانچ بھائی بہنوں میں وہ سب سے چھوٹا تھا۔ بڑے بھائی صاحب عمر میں چودہ پندرہ سال بڑے تھے اور ایک شوگر مل میں اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے پچھلے سال ریٹائر ہوئے تھے۔ گھر کی کفالت انھوں نے ہی کی تھی۔ خاندان میں ان کا درجہ والد کی طرح اس لیے بھی تھا کہ انھوں نے اپنی ذمے داریوں کو دیکھتے ہوئے شادی کافی تاخیر سے کی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، وہ اپنے بھائی بہنوں ہی کو اپنی اولاد مانتے تھے۔ اور بھابی کی محبت بھی کچھ کم نہ تھی۔ وہ بچپن ہی سے ذہین تھا لہٰذا اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے بھائی صاحب نے اسے کانپور آئی آئی ٹی میں داخلہ دلا دیا تھا، جہاں سے اس نے کمپیوٹر سائنس اینڈ انجینئرنگ میں ٹاپ کیا تھا اور ممبئی کی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب حاصل کرنے میں اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کی اس ترقی سے بھائی صاحب بے حد خوش تھے اور جب بھی ان سے فون پر باتیں ہوتیں وہ اسے ایمانداری اور محنت سے کام کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے وہ اپنی مثال ضرور دیتے کہ کس طرح انھوں نے ان تھک محنت اور ایمانداری سے فیکٹری میں مینجمنٹ کا اعتماد حاصل کیا ہے۔ بھابی سے جب بات ہوتی تو وہ اسے شہر کی فضولیات سے دور رہنے کی تلقین کرتیں اور اس سے یہ پوچھنا نہیں بھولتی تھیں کہ اس نے اب تک کوئی لڑکی پسند کی یا نہیں۔

جاب پر کنفرم ہونے کے بعد اسے لگا تھا کہ بھائی صاحب نے اسے اپنی ضرورتوں کی قربانی دے کر جن امیدوں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم دلائی ہے وہ ان پر کھرا اترنے کی کوشش کرے گا۔ وہ بھائی صاحب کی نصیحت کے مطابق محنت اور ایمانداری سے کام کر رہا تھا کہ ایک دن اس کی زندگی میں ایک شخص کسی حادثے کی طرح داخل ہوا تھا اور زندگی کی معنویت ہی بدل گئی تھی۔ خوابناک آنکھوں اور گوری رنگت والے اس آدمی پر بھوری جھبری داڑھی خوب پھبتی تھی۔ اس کے دراز قد پر گھٹنوں سے لمبا

Scanned with CamScanner

قمیض نما کرتا اور ٹخنوں سے اونچی شلوار اس کی شخصیت کو کچھ تیکھا بناتی تھی۔ اس نے مقصدِ حیات اور موت کی قدر و قیمت پر اتنے سارے سوالات کھڑے کر دیے تھے کہ اسے اپنے وجود میں وہی تبدیلی محسوس ہوئی تھی جو زلزلے کے جھٹکے کے بعد متاثرہ زمین ہی نہیں پوری آبادی میں آجاتی ہے۔ دوستوں کی ایک محفل میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دیر تک دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ بے حد درشت اور تلخ بات بھی پرسکون انداز میں کہتا تھا۔ بحث کے دوران اس کی آواز کبھی بلند نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی غصہ ظاہر ہوتا۔

''کسی عظیم مقصد کے حصول سے عاری زندگی اور کسی عظیم مقصد کی تکمیل سے لاتعلق موت صرف جانوروں کا مقدر ہے۔ ایسے جانور انسانوں کے جون میں بھی رہتے ہیں۔ انسان کے جون میں انسان بن کر رہنے کی سب سے پہلی شرط ہے کہ اپنی قوم کو ایک کنبہ سمجھو اور انھیں تحفظ اور انصاف دینے کے لیے جان دینے اور جان لینے سے بھی گریز مت کرو۔''

''کیا آپ پر کبھی ایسا وقت آیا ہے؟'' کسی نے اس سے پوچھا تھا۔

اس نے پہلے تو غور سے سوال کرنے والے کو دیکھا اور پھر اور اس نے اپنے دائیں پیر کو لمبا کر کے اپنے پائجامے کے پائینچے کو گھٹنوں تک کھینچ دیا اور سب حیرت سے اس کے پیر کو دیکھتے رہ گئے۔ گھٹنے سے نیچے اسٹیل اور فائبر کا بنا ہوا ایک بے جان پیر تھا۔ سبھی کو حیرت ہوئی تھی کہ اس کی چال سے کبھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کا نصف پیر کٹا ہوا ہے۔ اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور روتھ مین کے امریکی دھویں کی مہک کمرے میں بھر گئی تھی۔ ''میں ہر ایک لمحے کے بعد دوسرے لمحے کو نئی زندگی مانتا ہوں، یعنی میں اپنی ہر سانس میں موت کو محسوس کرتا ہوں۔ اس یے موت کو گلے لگانے کے لیے ہر لمحہ تیار رہتا ہوں۔ یاد رکھو، موت سے صرف بزدل ڈرتے ہیں۔''

وہ مبہوت سا اس خوبصورت چہرے اور بلند حوصلے والے آدمی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔

''کیا شے ہے جو تمھارے لیے زندگی کو بہت قیمتی بناتی ہے؟'' اس نے بے حد میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ سب کے چہروں کو باری باری دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، پھر کچھ توقف سے خود ہی بولا تھا ''مالی آسودگی، جنسی تلذذ اور خونی رشتے۔ ہے نا؟ کیا یہ تمام چیزیں ایک ساتھ کسی بھی آدمی کو حاصل ہو جاتی

ہیں؟ اور اگر ہوبھی جائیں تو ان کا وقفہ کتنا ہوتا ہے؟ پانچ، پچیس یا پچاس سال اس سے زیادہ تو نہیں؟ دنیاوی رشتے فریب ہیں۔ رشتے دار زندگی میں محبت کا دم بھرتے ہیں اور موت کے بعد فراموش کر دیتے ہیں۔ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے نہ کسی کے لیے مرتا ہے۔ لیکن ذرا تصور کریں اس زندگی کا جو کبھی ختم نہ ہو، جس میں وقت کا کوئی تصور ہی نہ ہو اور جس میں مال و جنس کی ایسی فراوانی ہو کہ پر جوش جوانی جسم میں ٹھہر جائے اور تلذذ کا ایک لمحہ صدیوں پر محیط ہو جائے۔ عمر کا ایک سکنڈ سینکڑوں سال پر پھیل جائے اور زندگی کبھی ختم ہی نہ ہو۔ تو بتائیں، یہ چند برسوں کی زندگی اہم ہے یا وہ زندگی جس کی عمر لامحدود ہے؟'' وہ کہہ رہا تھا اور سبھوں کی آنکھوں میں وہ چمک تھی جو زندگی سے ماورا زندگی کے تصور نے پیدا کر دی تھی۔

''کیا ظلم کو برداشت کرنا ظالم کو قوت دینا نہیں ہے؟ کیا یہ بدترین بزدلی نہیں ہے؟ کیا ہمیں نہیں کہا گیا ہے کہ جیو تو غازی کی طرح اور مرو تو شہید کی طرح؟'' اس نے ٹھہر کر ایک ایک کے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد کہا تھا۔ ''بر در قوت مظلوم کا دواج ظالم کی فنا ہے۔ یہ انتقام نہیں حصول انصاف ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں روانی کے ساتھ بول رہا تھا لیکن اس کا چہرہ گرم تانبے کی طرح تمتما اٹھا تھا۔

اس کے ہر لفظ میں بے شمار نیزے تھے جو اس کے دماغ کے ایک ایک خلیے میں پیوست ہو گئے تھے۔ اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا کہ وہ بے شمار انسانوں کی طرح ایک بے مقصد زندگی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے جس کے مرکز میں صرف اس کا اپنا خاندان ہے، جبکہ دنیا کے گوشے گوشے میں موجود اس کی قوم کا ہر فرد اس کے وسیع ترین کنبے کا حصہ ہے۔ اب وہ اخبار یا نیوز چینل کھولتا تو روتے سسکتے بچے، ماتم کناں عورتیں اور زخموں سے چور خوفزدہ مرد اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ رات میں جب وہ کمپیوٹر پر نیٹ سرفنگ کرتا تو دنیا کے پتا نہیں کن کن گوشوں سے دریدہ جسموں اور مجروح روحوں والے ہیولے کمپیوٹر کے اسکرین سے نکل کر اس کے اطراف میں دائرہ بنا کر کھڑے ہو جاتے، بس خاموش اور سوالی نظروں سے اس کی طرف بے چارگی سے تکتے رہتے۔ ان کی آنکھوں میں اتنی بے بسی ہوتی کہ وہ گھبرا کر آنکھیں بند کر لیتا۔ تب وہ رونے لگتے، دبی دبی ہچکیوں کی دردناک آوازوں سے اس طرح روتے کہ اس کا رواں رواں تھرا اٹھتا...

اس نے اپنے فیملی ڈاکٹر سے رجوع کیا، جس نے سارا ماجرا سننے کے بعد اسے سمجھایا کہ وہ

جن ہیولوں کو دیکھتا ہے ان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ اس کے تخیل کا عکس ہیں جسے ہیلوسی نیشن کہتے ہیں۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ کسی بھی غمناک واقعے یا سانحے پر زیادہ غور و فکر نہ کرے، اور دماغ کو پرسکون رکھنے کے لیے چند ٹرینکولائزر تجویز کیں۔ وہ جب تک ٹرینکولائزر لیتا رہتا اسے کسی بھی قسم کا ہیلوسی نیشن نہ ہوتا لیکن جس روز دوا لینے میں غفلت ہو جاتی وہی لہولہان ہیولے پھر اس کے کمپیوٹر سے نکل کر اس کے سامنے آ کر سوالی نظروں سے اسے گھورتے رہتے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ ''تم نے ہمارے لیے کیا کیا؟'' پھر وہ دبی دبی آواز میں رونے لگتے۔ رفتہ رفتہ ان کی آہ و بکا سے کمرے کے درو دیوار، احساسِ جرم کے مارے کسی شخص کی طرح لرزنے لگتے۔

بچے کی مٹھی میں روپیہ

سو سال پرانی پولیس کمشنریٹ کی کالے پتھروں سے بنی عمارت کی پہلی منزل پر واقع اے ٹی ایس (اینٹی ٹیررزم اسکواڈ) کے دفتر میں ایک دبلی سانولی عورت اپنی گود میں ایک سُر میں رو رہے نے والے بچے کو چپ کراتی کھڑی تھی۔ عورت کے بشرے سے لگتا تھا جیسے اس نے کئی دنوں سے بالوں میں تیل کنگھا نہیں کیا ہے، البتہ اس کے ماتھے کی گول بندی اور مانگ کا سیندور ضرور تازہ دکھائی دیتا تھا۔ دفتر کے سپاہی نے تین گھنٹے کے درمیان شاید بیسیوں بار اس سے کہا تھا کہ وہ چلی جائے، صاب باہر جانچ میں گئے ہیں، آنے میں بہت دیر ہو جائے گی۔ عورت چپ چاپ سن لیتی، نہ کوئی جواب دیتی اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلتی۔ کچھ ہی دیر بعد انسپکٹر چوہان کالا چشمہ پہنے تیز قدموں سے راہداری عبور کر کے اپنے دفتر کے سامنے پہنچا تو اس عورت کو دیکھ کر ٹھٹک گیا اور پھر اپنے کیبن میں چلا گیا۔ انسپکٹر کے پیچھے پیچھے ایک کالا کلوٹا ادھیڑ عمر کا آدمی بھی اسی کیبن میں داخل ہو گیا۔ اس کا جبڑا پان اور سپاری کو چبانے کی مشقت میں متواتر ہل رہا تھا۔

عورت پُر امید نظروں سے ان کے پیچھے بلتے خودکار دروازے کو دیکھتی رہی۔

''باہر کی ہوا کیا بولتی ہے کالا بابو؟'' انسپکٹر چوہان نے سگریٹ سلگا کر پیکٹ اس آدمی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دم سناٹا ہے صاب۔'' کالا بابو نے بھی سگریٹ سلگا لی۔

"آنکھ اور کان کھلے رکھو۔ تین ہفتے ہو رہے ہیں۔ اوپر سے بہت پریشر آ رہا ہے۔" کہہ کر انسپکٹر نے گھنٹی بجا کر سپاہی کو طلب کر کے باہر کھڑی عورت کو اندر بھیجنے کے لیے کہا۔

بچے کو کمر پر لیے عورت کیبن میں داخل ہوئی۔ بچہ اب بھی ری ری کیے جا رہا تھا۔

"کچھ پتا چلا تمھارے پتی کا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ی تو آپ بتائیں گے حجور۔" عورت نے لجاجت سے کہا۔

"دیکھو ایک ہی جلا ہوا مُردہ رہ گیا ہے جو تم کو دکھایا تھا۔ تم بولتی ہو کہ تمھارا پتی لنگڑا تھا اور کالا بھی تھا۔ وہ لاوارث سر بھی تمھارے پتی کا نہیں ہے؟" انسپکٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا، "مجھے لگتا ہے تمھارا پتی بلاسٹ میں اُڑ—"

"نہیں نہیں ایسا مت بولو ساب۔" وہ نفی میں سر ہلا کر رو پڑی۔

"ناشتہ کیا؟" انسپکٹر نے عورت سے پوچھا۔ وہ چپ انسپکٹر کے چہرے کو تکتی رہی۔ "چائے بسکٹ لوگی؟"

"نہیں ساب، ہم نہیں۔ میرا پتی..." وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ انسپکٹر نے کالا چشمہ نکال کر میز پر رکھا اور ایک فائل کھول کر پڑھنے لگا۔ کالا بابو غور سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ "چپ ہو جا، چپ ہو جا۔" کہہ کر اس نے عورت سے اپنی تفتیش شروع کر دی۔ اس کا شوہر اندھیری اسٹیشن پر چین کی بنی ہوئی سستی اشیا فروخت کرتا تھا۔ دھماکے کے بعد سے وہ گھر نہیں لوٹا۔ اس کی بوڑھی بہری ماں روز اپنے بیٹے کو یاد کر کے روتی رہتی ہے۔ اسے سمجھانا اور چپ کرانا محال ہو جاتا ہے کہ وہ بالکل بھی سن نہیں سکتی۔

"راشن کارڈ ہے تمھارے پاس؟" کالا بابو نے اس کی رو رو کر سرخ ہو جانے والی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہے نا بھیا۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"سرکار نے کل ملا کر پانچ لاکھ روپیہ معاوضے میں دینے کا اعلان کیا ہے، ہے نا؟ اگر تمھارے آدمی کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے تو تم کو بھی یہ پیسہ ل..."

"نہیں بھیا نہیں، ہم کو ہمارا آدمی چاہیے۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ماں کو روتا دیکھ کر بچہ

Scanned with CamScanner

بھی زور زور سے رونے لگا۔

انسپکٹر نے فائل پر سے نظریں ہٹا کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فائل میں جھانکنے لگا۔ بابو بہت دیر تک عورت کو حقیقت سے سامنا کرنے کے لیے تیار کرتا رہا۔ وہ ہچک ہچک کر بس روتی رہی۔

"دو روز کے بعد میں آنا۔" انسپکٹر نے فائل پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

عورت آنکھوں میں آنسو لیے کچھ دیر کھڑی رہی پھر نستے کہہ کر تقریباً گھسٹتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کالا بابو نے انسپکٹر کی طرف جھک کر دھیرے سے کہا: "میں ابھی آیا ساب۔" اور عورت کے پیچھے وہ بھی باہر آ گیا۔ عورت چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی لمبی سی راہداری میں چلی جا رہی تھی۔ اس کی گود میں اس کا بچہ اب بھی روئے جا رہا تھا، شاید وہ بھوکا تھا... کالا بابو تیز قدموں سے عورت کے قریب جا پہنچا۔ اس کی طرف ہمدردی برساتی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے جیب میں سے ۲ روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ عورت نے لینے سے انکار کیا تو اسے نرمی سے سمجھایا کہ بچے کے لیے دودھ لے لینا، اور نوٹ کو اس نے بچے کی مٹھی میں تھما دیا۔ وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"دیکھو بائی، ایک مہینہ ہونے کو آ گیا ہے، ہے نا؟ تمھارے آدمی کا کچھ بھی پتا نہیں ہے، ہے نا؟ مطلب، وہ بلاسٹ میں ختم ہو گیا ہوگا، ہے نا؟ تمھارا بچہ چھوٹا ہے اس کی پرورش کرنے کے لیے پیسہ لگے گا، ہے نا؟ ماتم کرنے سے کام تو چلنے والا نہیں ہے، ہے نا؟" وہ کسی نرسری ٹیچر کی طرح ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔ "معاملہ گرما گرم ہے، سرکار ابھی دیالو بن گئی ہے، ہے نا؟ ابھی جو ملتا ہے لے لو، ٹائم نکل جانے کے بعد سرکار بھی بھول جائے گی کہ اس نے کوئی وعدہ کیا تھا، ہے نا؟ پھر چپل گھس جائے گی تمھاری، پھر کچھ نہیں ملے گا، کبھی نا؟ دو دن کے بعد پتا ارادہ بتانا، ہے نا؟ میں ساب کو بول کے تمھارا سب کام آسان کرا دوں گا، ہے نا؟" کالا بابو کی "ہے نا" کی تکرار عورت کے دماغ اور دل کے درمیان رفو کا کام کر رہی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کالے کلوٹے آدمی کا چہرہ تکتی رہی جو اس لمحے میں اسے کوئی فرشتہ نظر آ رہا تھا۔ بچے نے سو روپے کا نوٹ اپنی مٹھی میں بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

''خدا قسم میرے کو کچھ نہیں چاہیے۔'' کالا بابو نے اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر جلدی سے کہا۔ ''کام کرانے کے لیے تھوڑا بہت تو خرچا کرنا پڑے گا نا، وہ میں دے دوں گا۔ تم کو جب معاوضہ ملے گا تو بس میرا خیال رکھنا، ہے نا؟'' اس نے بچے کے گال کو تھپ تھپایا جس نے اپنی مٹھی میں سو روپے کا نوٹ بہت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پھر وہ گم سم کھڑی عورت کو دیکھ کر مسکرایا، اس کے گندے کتھئی دانت نمایاں ہو گئے۔ عورت مستقبل کے اندیشوں میں گھری وہیں کھڑی رہی جیسے اس کے پیروں میں کیلیں ٹھک گئی ہوں۔ کالا بابو اسے سوالوں اور وسوسوں کے بھنور میں دھکیل کر لمبے ڈگ بھرتا انسپکٹر کے کیبن کی جانب بڑھ گیا۔

عبیر گلال اور زعفرانی پرچم

وہ ایک بے قابو جم غفیر تھا، جو چیخ چیخ کر نعرے لگا رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں سینکڑوں سال پرانے زعفرانی پرچم اور ماتھے پر ہزاروں سال پرانا عبیر گلال پتا ہوا تھا۔ وہ ایک مٹ میلی، کائی زدہ، بلند و بالا گنبدوں والی عمارت کے اطراف میں ایسے حلقہ بنا رہے تھے جیسے سرکش پانی کا ریلا کسی چٹان کے گرد پھیلتا ہے اور اسے دھیرے دھیرے اپنے اندر سمو لیتا ہے... جنون کی قوت نے خاکی وردیوں کا گھیرا کسی مزاحمت کا مقابلہ کیے بغیر توڑ دیا تھا... اور یکبارگی چاروں طرف سے کف اڑاتی زعفرانی موجیں اٹھی تھیں اور چٹان کی طرح قدیم عمارت ریت کے بھربھرے ٹیلے کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ اب وہاں نہ کوئی تاریخ باقی بچی تھی نہ جغرافیائی حد بندی تھی نہ ہی قانون کی بالا دستی تھی، صرف ایک بے قابو وحشی بھیڑ تھی جو قانون اور قدرت کی تمام پابندیوں کو توڑ چکی تھی... بے صرف گرد و غبار تھا جو نعروں کی طرح پھیل رہا تھا...

سورج کی لال خون آلود گیلے کپڑے کی طرح گہرے زعفرانی اندھیرے میں گھل رہی تھی... اندھیرے میں ترشول، تلواریں، برچھے اور چھرے چمکتے اور خون کے چھینٹے اڑاتے انسانی جسم گھٹی گھٹی چیخوں کے ساتھ گرتے... عورتیں بچے پناہ کی تلاش میں بھاگتے، کوئی تلواروں اور برچھیوں پر رکھ لیا جاتا تو کسی کے کپڑے تار تار کیے جاتے... بھوکے کتے گلیوں اور سڑکوں پر لاشوں کو اور وحشی مرد عورتوں کے ننگے بدنوں کو بھنبھوڑ رہے تھے... دور دور تک کوئی جائے پناہ تھی اور نہ ہی کوئی محافظ تھا...

ٹی وی سیٹ پر دکھائی گئی سی ڈی ختم ہو گئی تھی، لیکن اس کا ایک ایک منظر ان کی آنکھوں میں کسی خوفناک خواب کی طرح مسلسل چل رہا تھا۔ کمرے پر ایک ماتمی سکوت طاری تھا۔ یہ خاموشی کسی صدمے کی وجہ سے تھی یا فلم کے بعد ذہن میں اٹھنے والے سوالات کی وجہ سے، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس روز کسی نے کوئی بحث نہیں کی تھی۔ جبری داڑھی والے کے ہونٹوں میں سگریٹ دبے ہوئے شعلے کی طرح سلگ رہی تھی۔ اس نے ان کے تمتمائے چہروں کو اپنی نوکیلی نظروں سے کھرچتے ہوئے ان کے دماغ تک اپنا پیغام منتقل کر دیا تھا

"انسان کے جون میں انسان بن کر رہنے کی سب سے پہلی شرط ہے کہ اپنی قوم کو ایک کنبہ سمجھو اور انھیں تحفظ اور انصاف دلانے کے لیے جان دینے اور لینے سے بھی گریز مت کرو۔"

اُس رات وہ کافی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ بہت دیر تک کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد ہی اسے نیند آئی تھی۔ نیند میں اس نے محسوس کیا تھا کہ بستر میں اس کا جسم کسی سے مس ہو رہا ہے۔ اس نے اندھیرے میں ٹٹولا، اس کا ہاتھ کسی گیلی اور لجلجی شے سے ٹکرایا۔ وہ گھبرا اٹھ بیٹھا اور لپک کر سرہانے رکھے سائیڈ لیمپ کو روشن کر دیا۔ اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ اس نے جو چادر اوڑھ رکھی تھی وہ کسی ہیولے کی شکل میں ابھری ہوئی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور چادر کو ایک جھٹکے سے الٹ دیا۔ بے ساختہ اس کے منھ سے چیخ نکل گئی۔ خون میں لت پت کوئی شخص اپنی دونوں ہتھیلیوں کو گھٹنوں میں دبائے کروٹ پڑا سسک رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے اس اجنبی کے کندھے کو پکڑ کر سیدھا کیا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا۔ شدید زخمی حالت میں اس نے خود کو سامنے بستر پر پڑا ہوا دیکھا۔ ہو بہو اسی کی شکل و صورت، اسی جیسا قد و قامت! اس کے جسم پر زخموں کے گہرے نشان تھے جیسے کسی تیز دھار والے ہتھیار سے اس پر وار کیے گئے ہوں۔ وہ سسکتے ہوئے پھس پھسا رہا تھا:

"بچا لو مجھے بچا لو... وہ مجھے مار ڈالیں گے..."

وہ خود کو اس حال میں دیکھ کر خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے دیکھا کہ اچانک فرش لرز رہا ہے، چھت گر رہی ہے، دیواریں ڈھے رہی ہیں اور دشمن للکار رہا ہے...

صبح اس نے خود کو فرش پر پڑا پایا۔ سر میں درد ہو رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ [illegible]

رات کا واقعہ یاد آ گیا اور وہ ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں بیڈ پر گڑ گئیں اور آنکھیں حیرت اور انجانے خوف سے ابل پڑیں۔ بستر پر چادر بے ترتیب تھی لیکن اُس کا کوئی پتا نہیں تھا جو رات میں زخمی حالت میں بستر پر پڑا سسک رہا تھا... اور بستر کی سفید چادر ایکدم بے داغ تھی!

جھبری داڑھی والے نے اس کی کیفیت کو بہت توجہ سے سنا تھا اور پرسکون مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا:

''یہ نہ تو کوئی دماغی خلجان ہے اور نہ ہی آسیب۔ یہ تمھاری آگہی ہے۔ اور جو ماتم گسار تمھیں دکھائی دیتے ہیں وہ تمھارا ضمیر ہے۔ تمھارے بستر پر جو زخمی پڑا تھا وہ تمھاری روح ہے۔''

''وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ آخر میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

''تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ تم ایک عظیم مقصد کے لیے اپنی زندگی قربان کر کے ایک ناتمام زندگی کی آفاقی مسرت حاصل کر سکتے ہو، جس کی ابتدا قبر ہی سے ہو جاتی ہے، جو شہیدوں کے لیے گلزار ہو جاتی ہے۔'' جھبری داڑھی والے نے شفیق مسکراہٹ سے کہا تھا۔

وہ جب عقیدت اور احترام سے جھبری داڑھی والے سے مصافحہ کر کے سڑک پر آیا تھا تو اس نے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ وہ اپنے اندر زبردست قسم کی خود اعتمادی محسوس کر رہا تھا۔ اسے لگا تھا کہ پیر زمین سے کچھ اوپر پڑ رہے ہیں۔ سڑک پر دوڑتی بسیں، موٹریں کسی نمائش گاہ میں رکھے خودکار کھلونوں کی طرح معلوم ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر چلنے والے لوگ کمپیوٹر گرافکس کے بے جان کردار جیسے لگ رہے تھے۔ اونچے اسکائی اسکریپرز سگریٹ کی خالی ڈبیوں کے ڈھیر معلوم ہو رہے تھے... اس نے خود کو زندگی کے اس عظیم مقصد کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا جو موت کے بعد ایک آفاقی مسرت اور ناتمام زندگی عطا کرتا ہے...

بھائی صاحب اور نکارام کی ماں

اے ٹی ایس کے دفتر میں، پرانی وضع کی پتلون قمیص میں ملبوس خشخشی داڑھی والے ادھیڑ آدمی کو انسپکٹر اور اس کی بغل میں بیٹھے دو سب انسپکٹر گہری نظروں سے گھور رہے تھے، جو بار بار مردہ سر کی تصویر سے اس تصویر کا موازنہ کر رہا تھا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں انجانے خوف اور

خدشے کی وجہ سے رعشہ اور آنکھوں میں تجسس تھا۔ یہ شخص کل بھی اے ٹی ایس کے دفتر آیا تھا۔

وہ کل جب زینوں کی طرف جا رہا تھا تب اس نے دیکھا کہ سامنے کی دیوار پر ایک نوٹس بورڈ کے سامنے کچھ لوگ کھڑے کسی نوٹس کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ بورڈ کے قریب کولھاپوری ساڑی میں ایک لاغری بوڑھی عورت، چھ سات سال کی ایک بچی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور رہ رہ کر نوٹس بورڈ پڑھ رہے کسی نہ کسی شخص سے مراٹھی میں کسی بات کے لیے عاجزی کرتی لیکن اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس بڑھیا کی بے چارگی کو دیکھ کر خشخشی داڑھی والا معمر آدمی ٹھٹک گیا تھا۔ اچانک بڑھیا کی نظر اس پر پڑی اور وہ لنگڑاتی ہوئی اس کے قریب آئی اور اس نے مراٹھی آمیز ہندی میں جو کچھ کہا اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے بیٹے گنپت تکارام گائیکواڑ کا نام اس فہرست میں تلاش کر رہی ہے۔ خشخشی داڑھی والا سر ہلاتا ہوا اس کے ساتھ بورڈ تک گیا۔ اسے یہ دیکھ کر عجیب طرح کے خوف کا احساس ہوا کہ وہ بم دھماکوں کے مہلوکین اور زخمیوں کی لمبی فہرست تھی۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب میں سے عینک نکال کر پہنی اور فہرست کو پڑھنے لگا۔

1۔ شیورام شانتا رام سورے، 40 سال 2۔ رام بچن یادو، 53 سال 3۔ خاتون بی انصاری، 67 سال 4۔ دلیپ الہاس جوشی، 45 سال 5۔ ریٹا ڈی سوزا، 18 سال 6۔ محمد علی حیدر علی پٹھان، 36 سال 7۔ وسنت جادھو پوار، 28 سال 8۔ تجسم ایوب شیخ، 27 سال 9۔ بے بی شبانہ محمد عثمان، 8 سال...

وہ دھندلاتی آنکھوں سے پڑھتا گیا۔ مہلوکین کی فہرست میں 112 نمبر پر تھا گنپت تکارام گائیکواڑ، 42 سال، کا نام... اس نے جیسے ہی بوڑھی عورت کو نام پڑھ کر سنایا، وہ زور زور سے بین کرتی ہوئی فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنا ماتھا پیٹ رہی تھی اور اس کے ساتھ والی بچی روتی ہوئی اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ بڑھیا کو ولاپ کرتا ہوا دیکھ کر اس کا دل بھاری ہو گیا تھا۔ اسے ایک انجانے وہم نے جکڑ لیا تھا۔ وہ وہاں سے واپس مسافر خانے میں لوٹ آیا تھا۔ آج اس نے انسپکٹر چوہان سے کل نہ آنے کی وجہ صاف صاف بتائی تو اس نے کہا تھا:

"ہم روز ایسا ماتم دیکھتے ہیں، کیا کریں، آپ کی طرح واپس تو نہیں جا سکتے۔ دل کو کڑا کر کے اپنی ڈیوٹی دیتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

اے ٹی ایس کی ٹیم پہلے ہی دونوں تصویروں کو اپنی تفتیشی نظروں سے دیکھ چکی تھی۔ ان کے سامنے ایک زندہ نوجوان کی مسکراتی تصویر تھی جو شاید کسی شناختی کارڈ کے لیے کھنچوائی گئی تھی اور دوسری جانب تن سے جدا ایک ورم زدہ سر کی تصویر تھی جس کے خدوخال بری طرح سے مجروح تھے۔

''ہاں داروغہ صاحب، تصویر بالکل میرے بھائی جیسی تو نہیں ہے، لیکن ناک نقشہ کچھ کچھ ملتا جلتا ضرور ہے۔ چہرہ اتنا بگڑ گیا ہے کہ پہچاننا مشکل ہے۔ میری تو دعا ہے کہ وہ میرا بھائی نہ ہو،'' کہتے ہوئے اس کی آواز کپکپا گئی۔

''ہماری بھی دعا ہے کہ وہ آپ کا بھائی نہ ہو تو اچھا ہے، کیونکہ ہماری جانچ ٹیم کو شک ہے کہ یہی وہ ٹیررسٹ تھا جس نے ٹرین میں بم رکھا تھا۔ لیکن یہ صرف شک ہے اس کی اچھی طرح سے چھان بین ہوگی۔''

انسپکٹر کی یہ بات سن کر اس کے جسم میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑ گئی تھی اور پیشانی پر پسینے کے ننھے قطرے ابھر آئے... چھوٹو دہشت پسند ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اس میں تو کسی کے بگڑنے اور بھٹکنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا ہے۔ ویسے بھی چھوٹو جھگڑالو اور غصیلا نہیں تھا کہ کسی کے بہکانے میں آ جائے۔ جس بیٹے نے کبھی غلیل سے کسی چڑیا تک کو نہ مارا ہو وہ دہشت پسند کیسے بن سکتا ہے؟ یہ پولیس ہے، ان کا کام ہی شک کرنا ہے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے نا کہ وقت پڑنے پر یہ اپنے باپ تک پر شک کرتے ہیں...

''آپ کی اپنے بھائی سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟'' ایک سب انسپکٹر کے سوال نے اسے چونکا دیا۔

''چھوٹو سے ملاقات تو ایک سال سے نہیں ہوئی تھی لیکن فون پر بات ضرور ہوتی تھی۔ جس روز حادثہ ہوا تھا، شاید دس پندرہ منٹ پہلے اس سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ اس کے لیے ہم نے ایک بہت خوبصورت لڑکی دیکھی ہے۔ اسی کے بارے میں میں نے اسے فون کیا تھا۔''

''اس نے کیا کہا تھا فون پر؟''

''اس نے کہا تھا کہ ابھی اسے کچھ بہت ضروری کام کرنے ہیں، فی الحال شادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔'' کہتے ہوئے بڑے بھائی کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔ ''داروغہ صاحب، کیا میں اس

سر کو دیکھ سکتا ہوں؟" وہ خود کو یہ اطمینان دلانے کے لیے لاوارث سر کو دیکھنا چاہتا تھا کہ اپنے چھوٹے بھائی پر اس کا اعتماد غلط نہیں ہے۔

"وہائی ناٹ!" انسپکٹر نے کہا اور ایک سب انسپکٹر سے حراست میں لیے گئے کسی مشتبہ آدمی کو دوسری جیپ میں پولیس گارڈز کے ساتھ جے جے اسپتال کے مردہ گھر لانے کی ہدایت دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ معمر آدمی انسپکٹر کے پیچھے پیچھے کیبن سے باہر نکل آیا اور وہ آنسو جو اس نے انسپکٹر سے چھپا لیے تھے رومال سے پونچھتے ہوئے لکڑی کے زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ جب وہ اپنے کانپتے پیروں کو جماتا ہوا سیڑھیاں اتر رہا تھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہوا... زینے کے قریب کی دیوار پر لگے نوٹس بورڈ کے سامنے کچھ لوگ کھڑے کسی نوٹس کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں۔ وہی کل والی کولھاپوری بڑھیا چھ سات سال کی ایک بچی کے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے اور وہ رہ رہ کر نوٹس بورڈ پڑھ رہے ہر کسی نہ کسی شخص سے مراٹھی میں کسی بات کے لیے عاجزی کر رہی ہے، لیکن آج بھی اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے۔ اسے لگا کہ وہ بڑھیا ابھی اسے دیکھ لے گی اور اس سے کہے گی کہ اس کے بیٹے گپت تکارام گائیکواڑ کا نام اس فہرست میں تلاش کر دے... اس نے گھبرا کر اپنا چہرہ پھیر لیا اور تیزی سے عمارت کے باہر نکل آیا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ بڑھیا اپنی پوتی کے سہارے لنگڑاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہے۔

اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی تھی اور دیر تک بجتی رہی تھی، لیکن وہ اے ٹی ایس کی ٹیم کے ساتھ جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا چھوٹو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا معصوم چہرہ کسی تصویر کی طرح نظروں میں ٹنگا ہوا تھا۔ بچپن میں ماں باپ کی محبتوں سے محرومی نے ویسے تو تمام بھائی بہنوں کو متاثر کیا تھا لیکن سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے یہ محرومی چھوٹو کے حصے میں کچھ زیادہ ہی آئی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے کبھی بچپن والی شرارتیں نہیں کیں۔ اسے پہلی بار شدید احساس ہو رہا تھا کہ اس کی آمدنی اتنی کم تھی کہ وہ اپنے بھائی بہنوں کو اچھے لباس اور کھلونے نہیں دلا سکا تھا، خاص طور پر چھوٹو کو جو ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ یہ احساس اسے اب اس لیے بھی ہو رہا تھا کہ اب چھوٹو بہت اچھی تنخواہ پا رہا تھا اور پورے گھر کی ضرورتوں کے لیے فکرمند رہتا تھا۔ وہ اپنی دو بیاہتا بہنوں اور ان کے بچوں کے لیے تہوار کے موقعوں پر کپڑے، کھلونے اور جوتے برابر بھجواتا تھا... وہ جیسے ہی پولیس جیپ میں بیٹھا

Scanned with CamScanner

سیل فون پھر بج اٹھا۔ اس نے چونک کر پتلون کی جیب میں سے سیل فون نکال کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب بیوی تھی:

''ٹی وی والے بول رہے ہیں کہ وہ لاوارث سر آتنک وادی کا ہو سکتا ہے۔۔۔''

بیوی کی آواز میں بے صبری اور خوف کی کپکپاہٹ تھی۔ اس نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا

''تصویر میں تو بہت فرق ہے، لاش کا سر دیکھنے پر پتا ہو جائے گا کہ وہ ہمارا چھوٹو نہیں ہے۔ اچھا اب رکھتا ہوں۔'' اس نے دانستہ بلند آواز میں کہا تھا اور فون منقطع کر دیا تھا۔ اسے خود پر حیرت ہوئی کہ وہ اتنے اعتماد کے ساتھ جھوٹ کیسے بول گیا! وہ نہیں چاہتا تھا کہ بیوی کو یہ بتا کر صدمہ پہنچائے کہ اس لاوارث سر کی تصویر اس کے بھائی سے بالکل مشابہ تو نہیں ہے، لیکن اس کی خفیف سی ٹیڑھی ناک اور اوپری ہونٹ والا زخم کا وہ نشان بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ چھوٹو کا ہے۔

''دنیاوی رشتے فریب ہیں''

جے جے اسپتال کا مردہ گھر اتنا ہی پرانا تھا جتنا کہ یہ اسپتال۔ خشخشی داڑھی والے کو ساتھ لے کر اے ٹی ایس کی ٹیم کالے چشمے والے انسپکٹر کے ساتھ مردہ گھر کی وحشت میں مبتلا کرنے والی عمارت میں داخل ہوئے ان کے پیچھے اسپتال کے دو مہتر بھی تھے جو ایک خالی اسٹریچر کو دھکیل رہے تھے۔ تعفن اس قدر تھا کہ سب نے ناک اور منھ پر رومال رکھ لیا تھا۔ ایک کشادہ ہال میں سے، جہاں تین چار لاشیں پتھر کی میزوں پر الف ننگی پڑی ہوئی تھیں، گذر کر وہ محبوس ہوا سے بوجھل برف خانے میں پہنچے۔ سیلن زدہ دیواروں والے اس بڑے سے سرد کمرے میں ڈیپ فریزر کے کیبنیٹ بنے ہوئے تھے، جن کی مختلف درازوں میں نقطۂ انجماد پر مُردوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔ مہتر نے انسپکٹر کے اشارے پر ایک کیبنیٹ کی دراز کو گھرر کی آواز کے ساتھ کھینچ لیا۔۔۔ خشخشی داڑھی والے کے سامنے وہی تصویر والا سر تھا جس کی منجمد آنکھیں اسی پر مرکوز تھیں ۔۔ اس کا دل سینے میں بہت زور سے دھڑکا۔ خشخشی داڑھی والا لاکھوں میں اپنے بھائی کو سات پردوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ اس کے سامنے، نیک طینت اور سعادت مند چھوٹے بھائی کا سر تھا، جسے دیکھتے ہی وہ صدمے سے کانپ اٹھا۔ اس کے سامنے ایسے شخص کا سر تھا جس نے معصوم لوگوں کی جانیں لینے کے لیے اپنی جان ضائع کر دی تھی۔

Scanned with CamScanner

''اوہ میں ابھی تک آلائشوں سے بھری اس فانی دنیا میں پڑا ہوا ہوں!'' دماغ نے سوچا۔
''لوگ کہتے ہیں کہ موت ایک ابدی نیند ہے۔ حیرت ہے، کسی نے اس تجربے سے گذرے بغیر ہی کہہ دیا! جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ موت کے بعد نیند ہی ختم ہو جاتی ہے۔ بس ایک انتظار رہتا ہے... طویل انتظار... اپنی نجات کا!''

اس کی منجمد آنکھوں میں منظر پگھل کر کچھ واضح ہو گیا۔ اگر اس کے سر میں دل ہوتا تو شاید بہت زور سے دھڑکتا۔ اس کے سامنے بھائی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ کسی بجھے ہوئے کوئلے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ان کا لرزتا ہوا ہاتھ آگے بڑھا تھا، پھر انھوں نے اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔ وہ سر ہلا رہے تھے... صدمے میں، غصے میں، پشیمانی میں یا انکار میں...

''غور سے دیکھو۔'' یہ وہی آواز تھی جو وہ کئی بار سن چکا تھا۔

''نہیں داروغہ صاحب، یہ میرا بھائی نہیں ہے۔'' ان کی آواز جیسے حلق میں پھنس کر نکلی تھی۔

''آر یو شیور؟'' انسپکٹر کی آواز تھی۔

''جی ی ی!'' بہت قطعیت کے ساتھ بھائی صاحب نے کہا تھا اور ایک دم سے گھوم کر دروازے کی طرف چل پڑے تھے۔ ان کی گردن اور کندھے جھکے ہوئے تھے جیسے ہل کا جوا رکھنے پر بیل کی گردن بوجھ سے جھک جاتی ہے۔

وہ پھر بدبو بھرے اندھیرے میں تھا۔ اس نے زندگی کے کسی لمحے میں یہ تصور نہیں کیا تھا کہ باپ کی طرح محبت کرنے والے بھائی صاحب اسے اس طرح پہچاننے سے انکار کر دیں گے۔ اس اندھیرے میں ایک جملہ گونج اٹھا تھا:

''دنیاوی رشتے فریب ہیں۔ عزیز و اقارب زندگی میں محبت کا دم بھرتے ہیں اور موت کے بعد فراموش کر دیتے ہیں۔ کوئی کسی کے لیے جیتا ہے، نہ کسی کے لیے مرتا ہے۔''

اسے لگا تھا کہ وہ اب تک جھوٹے رشتوں کے فریب میں مبتلا تھا۔ شکر ہے کہ اب وہ اس فریب سے نہ صرف نکل آیا ہے بلکہ اسے ختم ہوتا ہوا بھی دیکھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کاش بہت پہلے وہ اس فریب سے نکل آتا اور اپنے عظیم مقصد کے لیے زندگی کو وقف کر دیتا۔ کاش...

Scanned with CamScanner

زندگی کا عرفان عطا کرنے والا

پتا نہیں چند منٹوں، چند گھنٹوں یا چند سالوں بعد اندھیرے میں پھراجالے کی کھڑکی کھل گئی تھی۔ اس بار گندی دیواروں میں سے ابھر کر کئی لوگ سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کی نظر پہلے وردی پوشوں پر پڑی۔ ان میں وہی کالے چشمے والا پولیس افسر آگے کھڑا تھا۔ دوسرے تمام وردی پوش ادب سے پیچھے کھڑے تھے... پھر ان کے درمیان سے سرتاپا سفید لباس میں ملبوس ایک ہیولا سامنے آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ روشنی سے مانوس ہو جانے پر آنکھوں نے جو دیکھا وہ بے حد چونکانے والا تھا۔ سامنے اس کا مثالی مرد کامل کھڑا تھا۔ جھبری داڑھی الجھی ہوئی سی تھی اور ان کے چہرے پر خوف اور ہراسانی تھی۔ مسلسل جاگتے رہنے کی گہری تھکن خوابناک آنکھوں سے مترشح ہو رہی تھی۔

"دیکھو اور پہچانو اس کو۔" عینک والے افسر نے سخت تحکمانہ لہجے میں اس سے کہا۔

کیوں نہیں پہچانیں گے وہ مجھے! وہ دنیاداروں کی طرح موت سے نہیں ڈرتے، وہ تو غازی ہیں جو اپنی قوم کے لیے جان دینے اور جان لینے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ میرا ان کا خون کا وہ رشتہ نہیں ہے جو کسی مادی ضرورت اور لالچ میں توڑ دیا جائے، جیسا کہ بھائی صاحب نے کیا ہمارا رشتہ تو پختہ عقیدے، بے لچک نظریے اور عظیم مقصد کے ساتھ منسلک ہے۔

وہ اس کے بہت قریب آ کر کمر سے جھک گئے، ان کی جھبری داڑھی اسے اپنی آنکھوں میں گھستی محسوس ہوئی۔ اسے لگا کہ وہ اس کی پیشانی کو چومنے جا رہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ کاش، میں زندگی کا عرفان عطا کرنے والے اس شخص سے کہہ سکتا کہ آپ کی عنایت سے میں نے اپنی زندگی کا عظیم مقصد حاصل کر لیا ہے۔

انھوں نے سیدھے ہوتے ہوئے اپنے بازو کو اٹھا کر پیشانی کا پسینہ پونچھا اور مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں، میں نہیں جانتا اس کو۔"

ان کی آواز میں ہلکا سا لرزہ تھا۔

شاید انھوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ ہاں، میرا چہرہ جو بگڑ گیا ہے... وہ مجھے پہچانتے تو ضرور فخر سے کہتے کہ ہاں، یہی ہے وہ نوجوان جس نے ذلت کی زندگی پر شہادت کو ترجیح دی۔ یہ وہ ہے جس

Scanned with CamScanner

نے اپنی پوری قوم کو اپنا کنبہ تصور کیا اور عظیم مقصد کے لیے قربان ہو گیا۔۔۔ ان کا جملہ اب بھی اس کے دماغ میں گونج رہا تھا:

"جیو تو غازی کی طرح اور مرو تو شہید کی طرح۔"

"جھوٹ مت بولو تم جانتے ہو نا اس کو؟" انسپکٹر چوہان کا لہجہ کافی درشت تھا۔ "یہ سوئی سائیڈ بومبر تمھاری آرگنائزیشن کا ممبر نہیں تھا؟"

"نہیں یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ ہمارے یہاں معصوموں کا قتل گناہِ عظیم ہے اور خودکشی حرام ہے!" انھوں نے اس کی مردہ آنکھوں کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے دماغ میں بہت زور کا دھماکہ ہوا اور اس کے بھیجے کے چیتھڑے اڑ گئے اور کانوں میں گونجنے والی سیٹیاں بجنے لگیں اور آنکھوں میں اندھیرا کسی سیاہ پردے کی طرح گر پڑا اور سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

آخری دیدار کے بعد

نیم اندھیرے برف خانے میں، وہ سبھی ڈیپ فریزر کی دراز کے سامنے اپنے منھ پر رومال رکھے کھڑے تھے۔ انسپکٹر چوہان نے ہمیشہ کی طرح کالا چشمہ پہن رکھا تھا۔ کالے کلوٹے بابو کا جبڑا آج کچھ بے چینی کے ساتھ پان اور سپاری کو کچل رہا تھا۔ مردہ گھر کا اٹینڈنٹ اور کلرک ہاتھوں میں فائل اور کچھ فارم لیے کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے میلی ساڑی میں ڈری سہمی ہوئی عورت منھ پر پلو رکھے کھڑی تھی، انجانے خوف سے اس کا جسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس نے شاید کئی دنوں سے بالوں میں تیل کنگھا نہیں کیا تھا لیکن اس کے ماتھے کی گول بندی بالکل تازہ لگ رہی تھی، البتہ آج اس کی مانگ سُونی تھی۔۔۔ باہر سے کسی بچے کے رونے کی آواز متواتر آ رہی تھی۔ مہتر نے پوری قوت سے فریزر کی دراز کو کھینچ لیا، سامنے وہی لاوارث سر بے نور آنکھوں سے انھیں گھور رہا تھا۔ کالا بابو نے اپنی جیب میں سے پلاسٹک کی ایک بڑی سی پڑیا نکال کر عورت کی طرف بڑھا کر آنکھوں سے اشارہ کیا۔ عورت نے پڑیا میں سے عبیر گلال کو کانپتی مٹھی میں لے کر مردہ سر کے ماتھے پر پوت دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر اسے پرنام کیا، پھر وہ پتا نہیں کس احساس کے تحت پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

Scanned with CamScanner

کالا بابو نے اپنی بغل میں دبا ہوا ایک کورا سفید کپڑا اسپتال کے مہتر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنے دستانے والے ہاتھ کو بڑھا کر سر کو اٹھایا اور ایک پولی تھین میں رکھ کر اسے سفید کپڑے میں خوب اچھی طرح سے لپیٹ دیا۔ مہتر نے سفید کپڑے کے اس گولے کو اتنے ہی احترام سے رکھا جیسے کہ کسی لاش کو اس کے متعلقین کے سامنے رکھا جاتا ہے اور وہ اسٹریچر کو دھکیلتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔ سفید کپڑے میں لپٹا سر کسی گیند کی طرح ہل رہا تھا۔ مردہ گھر کے برف خانے سے باہر آتے ہی عورت نے جلدی سے اپنے روتے ہوئے بچے کو کانسٹبل کی گود میں سے لے کر سینے سے لگا لیا۔ کالا بابو نے اپنی جیب میں سے سو اور پچاس کے نوٹ نکال نکال کر وہاں موجود اسپتال اور مردہ گھر کے ملازمین کو بخشش دی۔ مردہ گھر کی عمارت سے باہر نکل کر وہ سب اس ٹیکسی کی طرف بڑھے جسے کالا بابو نے پہلے ہی سے ویٹنگ میں انگیج کر رکھا تھا۔ عورت اور کالا بابو ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ سفید کپڑے میں لپٹا سر عورت نے اپنی گود میں ایسے لے رکھا تھا جیسے وہ ایک بے جان سر نہ ہو کوئی زندہ بم ہو۔

''کریا کرم میں بالکل بھی دیر مت کرنا۔'' سفید موٹے کپڑے اور پولی تھین میں ہونے کے باوجود اس نے سنا کہ انسپکٹر کسی کو تنبیہ کر رہا تھا۔ ''کالا بابو، دھیان رہے، یہ اب تیزی سے سڑنے لگے گا۔''

''خدا قسم صاحب اتنی بدبو ہے کہ برداشت سے باہر ہے، ہم ادھر سے سیدھے دادر کے الیکٹرک شمسان جائیں گے۔''

''شمسان!'' وہ احتجاج میں پوری قوت سے چیخا لیکن دھماکے کے بعد وہ خود بھی تو قوت گویائی سے قطعی محروم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بے آواز چیخ میں ایسا احتجاج کر رہا تھا جو فضا میں تیرتی حساس لاسلکی لہروں پر ہلکا سا ارتعاش بھی پیدا کرنے سے بھی قاصر تھا۔

ٹیکسی چلنے سے پہلے عورت نے انسپکٹر چوہان کی طرف دیکھ کر ممنونیت سے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس کی بغل میں بیٹھے کالا بابو کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس کے گندے کتھئی دانتوں میں دبی سگریٹ سلگ رہی تھی۔ انسپکٹر کو اچانک کچھ یاد آ گیا۔ اس نے جلدی سے ڈرائیور کو رکنے کا حکم دیا اور عورت سے کہا:

"ذرا کپڑا اٹھا کر اس کا چہرہ تو دکھاؤ۔"

عورت نے منھ اور ناک پر پلو رکھ کر سفید کپڑا اٹھا کر پولی تھین میں رکھے سر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر انسپکٹر چوہان کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اپنا کالا چشمہ اتارا، منھ پر رومال رکھ کر ٹیکسی کی کھڑکی میں سر ڈال کر اس بدبو پھیلاتے بدہیئت مردہ سر کو غور سے دیکھا اور بُری طرح سے چونک پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہوا، کیونکہ . . . گرم موم کی طرح پگھلتے مردہ سر کی آنکھیں بھی ہوئی تھیں اور دونوں ہونٹ آپس میں سختی سے ایسے بھنچے ہوئے تھے جیسے وہ کسی ناقابل برداشت کرب کو اپنے جبڑوں میں دبانے کی کوشش کر رہا ہو!

❁ ❁

یو آر اننت مورتی (U.R.Ananthamurthy) کنڑ زبان کے جدید ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستانی ریاست کرناٹک کے ایک گاؤں میلیگے (Malige) میں 1932 میں پیدا ہوئے۔ اپنی ابتدائی تعلیم روایتی سنسکرت مدرسے میں پانے کے بعد انھوں نے میسور اور پھر انگلستان میں انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انگریزی ادب کی تدریس ہی کو انھوں نے اپنے پیشے کے طور پر اختیار کیا اور میسور یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ وہ کوٹایم کی مہاتما گاندھی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور دہلی میں نیشنل بک ٹرسٹ اور ساہتیہ اکادمی کے سربراہ رہ چکے ہیں اور آج کل پونا میں قائم فلم انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین ہیں۔

اننت مورتی کی ادبی زندگی کا آغاز 1955 میں کہانیوں کے ایک مجموعے سے ہوا جس کے بعد سے ان کے چار ناول، ایک ڈراما، کہانیوں اور مضامین کے متعدد مجموعے اور نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ہندوستانی سماج میں ذات پات کے نظام اور موروثی اقدار اور جدید اقدار کے مابین ٹکراؤ کا مطالعہ ان کی تحریروں کا بنیادی موضوع ہے اور ان کے اسلوب کی بنیاد اپنے اردگرد کی معاشرت کے گہرے مشاہدے اور فہم پر استوار ہے۔

اننت مورتی کو احساس ہے کہ برہمن ہوتے ہوئے ذات پات کے نظام پر اس قدر بے باکی سے اظہار خیال کرنے کے نتیجے میں ان کے ہم طبقہ لوگوں میں برہمی پیدا ہوتی ہے، لیکن ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسے ایک با اثر اور طاقتور طبقے کے طور پر جو صدیوں تک ایک غیر منصفانہ نظام کو لوگوں کی اکثریت پر مسلط رکھنے کا ذمہ دار رہا ہے ان کو حقیقت کا سامنا کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ منصفانہ نظام سماجی تبدیلی کے عمل اور جمہوری اقدامات کے تحت رفتہ رفتہ کمزور پڑ رہا ہے اور جن لوگوں کو متواتر دبا کر رکھا گیا تھا وہ وسائل میں اپنا حق اور حصہ طلب کرنے کے قابل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان دبائے اور کچلے ہوئے لوگوں میں محض نچلی ذاتیں ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی شامل ہیں جنھیں صنف کی بنیاد پر انسانوں سے کمتر درجہ دیا جاتا رہا ہے۔ ان کی جو طویل کہانی ''گمشدہ شہزادہ'' آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہے وہ اننت مورتی کی عمدہ ترین کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اور نفسِ مضمون اور اسلوب کے اعتبار سے ان کی نمائندہ تحریر ہے۔ اس کہانی کا ترجمہ ہندی سے بشیر عنوان نے کیا ہے جن کے ترجمے آج میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

یو آر اننت مورتی

ہندی سے ترجمہ: بشیر عنوان

گھٹ شرادھ

ابھی اندھیرا ہی تھا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا آنگن میں آیا تو دیکھا کہ ہاتھ میں پوٹلی اٹھائے شیش گری اُڈوپ کہیں جانے کو تیار کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے: ''کرز ملیکے گیا تو تمھارے ماتا پتا سے ملوں گا۔'' ماں باپ کا ذکر آتے ہی یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ اگر گاؤں میں ہوتا تو میں اب تک اپنی ماں کی ساڑھی اوڑھ کر، انھیں کے ساتھ سویا ہوتا۔ ماں بعد میں جگا کر، منھ دھلوا کر پینے کو کافی دیتی۔ باڑ لانگھنے سے پہلے ایک بار کھڑے ہو کر شیش گری اُڈوپ نے اپنی بیٹی کو پکارا، ''جمنا!'' سر پہ لال ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے، جمنا دیدی دروازے پہ آ کھڑی ہوئیں۔ شیش گری اُڈوپ باڑ کا ٹٹو بند کرتے ہوئے بولے، ''تو میں جا رہا ہوں، بچی؟ بچوں پہ نگاہ رکھنا۔ ندی میں بہت دیر تک مت تیرنے دینا۔ گوکرن میں یگیہ پورا کر کے اُڈیاور جاؤں گا۔ آنے میں تین مہینے لگ سکتے ہیں۔ بچے روز سبق یاد کرتے رہیں۔ اُپادھیائے جی[1] کو میں نے ساری باتیں سمجھا دی ہیں۔''

اپنے پتا جی سے عمر میں بڑے شیش گری اُڈوپ کو دیکھ کر مجھے ڈر لگتا تھا، لیکن اپنی ماں سے چھوٹی جمنا دیدی سے میری قربت تھی۔ اُڈوپ جی کی پیٹھ مڑتے ہی میں جمنا دیدی سے اپنے گھر جانے کی ضد کرنے لگا۔

''ارے چپ ہو جا، بھیا! منھ دھو کر تلسی توڑ کر لے آ۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئیں۔ ان کے اندر جاتے ہی وشوناتھ شاستری اور گنیش اٹھ آئے۔ شیش گری اُڈوپ کی شکل جوں ہی اوجھل ہوئی، فوراً ہی

---

[1] اُپادھیائے: ویدوں کی تعلیم دینے والا پنڈت، استاد، برہمنوں کا ایک فرقہ۔

مجھے روتا کھڑا دیکھ کر وہ دونوں ہنس پڑے۔ ان کے ساتھ میں کنویں پر منھ دھونے چلا گیا۔

شاستری نے پوچھا، "کیا بات ہے رے ڈرپوک؟"

گنیش گاگر کو کنویں میں سر سے چھوڑتے ہوئے بولا، "ارے شاستری، یہ تو مورکھ ہے۔ جنیو بندی سے پہلے والی رات میں نے مذاق کیا کہ جنیو ... اس میں مینڈک بھر دیتے ہیں، تو یہ رونے بیٹھ گیا تھا۔"

یہ کہہ کر وہ گھڑے میں پانی بھرتے ہوئے ہنس پڑے۔ میں روتا ہوا رسوئی گھر میں پہنچا۔

"ابے پانی کھینچ کر دینے کے! آجا!" انھوں نے پیچھے سے آواز دی۔

جمنا دیدی وہیں بیٹھی تھیں۔ ان کا چہرہ روہانسا سا تھا۔ .... بار پکارنے پر انھوں نے میری طرف مڑ کر دیکھا اور کہا، "جا رے، تو ان کے ساتھ مستی سے مت جانا۔ میں ہی تیرا منھ دھلا دیتی ہوں۔" اس طرح انھوں نے مجھے تسلی دی۔

منھ دھلنے کے بعد، میں اپنی ٹوکری لے کر مشرق کی سمت چل پڑا۔ راستے میں اُگے تو بے کے پھول توڑے۔ میں اب بھی چھوٹا ہوں، ناٹا ہوں، یہ جتانے کے لیے شاستری یہ کہہ کر مذاق اڑاتا، 'ٹھہر جا تو بے کے پودے سے بھی ناٹا ہوں۔'"

شاستری مجھ سے عمر میں بڑا تھا۔ ویسے وہ قد میں بھی بہت بڑا تھا۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ میری طرح اُڈوپ جی کے یہاں، وہ پڑھتا تھا۔ اس کی ایک آنکھ چھوٹی اور دوسری بڑی تھی، اس لیے گنیش اس کا 'ٹھنگا چاری' کہہ کر مذاق اڑاتا تھا۔ ان دونوں کی جوڑی تھی۔ میں ہی اکیلا تھا۔ ٹوکری لے کر میں گوپال جوئیس کے گھر پہنچا۔ وہاں بیل پتر کا پیڑ تھا۔ اس کی پتیاں توڑنے کے لیے گوپال جوئیس کی بہن گوداورما سے لگی[2] مانگی۔ گوداورما بھی جمنا دیدی کی طرح چھوا چھوت ماننے والی عورت تھیں۔ لیکن جمنا دیدی ان سے بہت چھوٹی تھیں۔ وہ گوری اور سڈول تھیں۔ ماں سے بھی اچھی دکھتی تھیں۔ جمنا دیدی کی شادی کے کچھ ہی دن بعد ان کا پتی سانپ کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ شیش گری اُڈوپ کی پتنی کے مرنے کے بعد ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی چاہیے تھا، اس لیے جمنا دیدی اپنے پتا کے ساتھ رہنے لگیں۔ یہ بات گنیش نے مجھے بتائی تھی۔ گنیش اُڈوپ جی کا دور کا رشتے

---

2 لگی: بانس کا ڈنڈا

دار تھا۔

ہاتھ میں لکٹی لے کر جب میں اچھل اچھل کر بیل پتر توڑ رہا تھا، تبھی گوداور ما کی آواز سنائی دی،
''چھوڑ، میں توڑ کر دیتی ہوں۔'' انھوں نے بیل پتر توڑ کر مجھے دیے۔ بعد میں وہ تلسی توڑنے لگیں۔

تب انھوں نے پوچھا: ''کیوں رے، اُڈوپ جی گوکرن چلے گئے کیا؟''

میں نے ''جی ہاں'' کہا۔

بعد میں انھوں نے پوچھا: ''جمنا دیدی کیسی ہیں؟''

میں بولا، ''اچھی ہیں۔''

اس پر وہ بولیں، ''دو تین دنوں سے مندر نہیں آ رہی ہیں۔''

میں بولا، ''اچھا، مجھے پتا نہیں۔''

''پتا نہیں کا کیا مطلب رے؟ کیا وہ لیٹی نہیں رہتیں؟ اُڈوپ جی نے کچھ بھی نہیں کہا؟''

میں نے کہا، ''پرسوں یہ کہہ کر لیٹ گئی تھیں کہ سر میں چکر آتے ہیں۔ اُڈوپ جی نے اس کی دوا دے دی۔ بس اتنا ہی، اور کچھ بھی نہیں۔''

''اوہ، یہ بات ہے۔'' کہہ کر گوداور ما ہنس پڑیں۔ اندر جاتے ہوئے گوپال جوئیس سے ہنس کر بولیں: ''سنا بھئی، جمنا کو بخار نہیں ہے، پر تلی بڑھ گئی ہے، بے چاری!''

ان کے گھر سے لوٹتے وقت ہون جلانے کے لیے اشوتھ کے پیڑ کی سوکھی ٹہنیاں پیڑ کے پاس سے چن کر لیتا آیا۔ جمنا دیدی میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ ''کتنی دیر لگا دی رے! اُپادھیائے جی انتظار کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر کنویں سے جلدی جلدی دو تین گاگر پانی کھینچ کر انھوں نے میرے سر پر ڈالا اور کہا، ''جا، جلدی جا کر بیٹھ۔'' گیلی دھوتی نچوڑ کر اسی سے اپنی لمبی چوٹی پونچھ کر میں نے اس میں ایک گانٹھ لگا دی اور چوٹی کو یوں ہی لٹکنے دیا۔ گیلے کپڑوں میں ہی اندر بھاگ کر گیا۔ جمنا دیدی سے پاک صاف جگہ پوچھ کر کپڑے سوکھنے کو ڈالے۔ جسم ڈھانپنے کا کپڑا مانگا اور ایک کو پہن کر اور دوسرے کو اوڑھ کر پنچ پاتر[3] لے کر چل پڑا۔

''ارے، لنگوٹ پہنتا کہ نہیں؟'' کہہ کر جمنا دیدی نے اس کی یاد دلائی۔ میں لنگوٹ پہننا بھول گیا

[3] پنچ پاتر: چوڑے منھ کا پانچ خانوں والا ایک برتن جس میں پوجا کے لیے پانی رکھا جاتا ہے

Scanned with CamScanner

تھا۔ انھوں نے ہنس کر میری چاندی کی کردھنی[4] میں لنگوٹ کھونس دی اور ہنستی ہوئی بولیں، "اب جا۔"

اُپادھیائے جی کے منھ اور سارے جسم پر چیچک کے داغ تھے۔ انھوں نے ڈانٹا، "اتنی دیر کیوں لگا دی؟" اُڈوپ جی نے مجھے کبھی نہیں ڈانٹا تھا۔ "اب تک جپ کے منتر تم نے نہیں سیکھے!" یہ کہہ کر پھر ڈانٹتے ہوئے انھوں نے جپ کرایا۔ مجھے ڈانٹ پڑتے دیکھ کر وہیں بیٹھے جپ کرتے ہوئے شاستری کو خوشی ہوئی۔ اس نے ہنس کر اپنی اکلوتی آنکھ سے گنیش کی طرف دیکھا۔ جپ کے بعد میں نے ہون جلانے کا کام کیا۔ اس کے بعد اُپادھیائے جی پوجا کے لیے مندر جاتے ہوئے بولے، "مانڈ پینے کے بعد ذرا چندن گھس کر دینا۔"

اندر قطار میں پتلیں[5] بچھی تھیں۔ ہم تینوں دوڑ کر وہاں جا بیٹھے۔ جمنا دیدی نے چاول کی کنی سے بنایا مانڈ پروسا اور ناریل کا تیل ڈال کر ساتھ میں مرچی کا اچار بھی دیا۔ اگر ناریل زیادہ ہوتے تو ناریل کی کھیر بنتی۔ ہم نے مانڈ کو ذرا آواز کرتے ہوئے سڑ سڑ کر کے پیا۔ شاستری اور گنیش باہر چلے گئے۔ میں گھر پر ہی رہ گیا۔

جمنا دیدی نے بتایا، "آج تم سب لوگوں کا بھوجن ساہوکار کے گھر پر ہے۔" مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ پوجا کے بعد بھوجن کے ساتھ کھیر ملے گی۔ ساتھ میں دان بھی ملے گا۔ جنیو بندی سے پہلے صرف ایک پائی ملا کرتی تھی، اب ایک آنہ ملنے لگا تھا۔ یہ خوشی کی بات تھی۔ لیکن کُرباڑ والا کھیل نہیں کھیل سکتے، کتوں پر پتھر پھینکنا منع تھا، جانگیا نہیں پہن سکتے، بھوجن کے لیے بیٹھنے پر بات کرنے کی بھی مناہی تھی۔ ان باتوں کا برا بھی لگتا تھا۔ پھر بھی جنیو بندی کے بعد سے پتل کے پاس رکھے پنچ پاتر میں اکنی پڑتے دیکھ کر خوشی ہوتی۔ جمنا دیدی کے پاس چھید والا ایک ڈبا تھا۔ دان میں آئے سارے پیسے میں اسی میں ڈال دیتا تھا۔ جمنا دیدی نے کہہ رکھا تھا کہ گھر جاتے وقت لے جانا اور گھر والوں کو دے دینا۔ 'ماں کو دینا'، اس پر شاستری تو مجھے کنجوس کہتا تھا۔

جمنا دیدی نے پوچھا، "نانی، تو صبح اتنی دیر کر کے کیوں آیا؟ بے کار میں اُپادھیائے جی سے ڈانٹ کھائی۔"

4 کردھنی: کمر میں باندھی جانے والی ایک قسم کی زنجیر۔

5 پتل: ڈھاک وغیرہ کے پتوں کی بنی ہوئی تھالی جس میں کھانا کھاتے ہیں۔ پتّاوَل۔

میں نے گوداور ما کے گھر بیل چھڑانے کے لیے جانے کی اور وہاں ان کے ساتھ ہوئی ساری باتیں ان سے کہیں تو ان کا منھ اتر گیا۔ انھوں نے زور دے کر پوچھا، ''اور کیا کیا بات ہوئی رے؟'' میں نے بتایا، ''کوئی بخار وخار میں تپتی بڑھنے کی بات کہہ کر آپس میں ہنس رہے تھے۔'' یہ سن کر جنا دیدی پلو سے منھ ڈھانپ کر رو پڑیں۔

وہ بولیں، ''کوئی اور پوچھے تو کہہ دینا کہ بخار آتا ہے۔''

جنا دیدی موقع ملنے پر لیٹی رہتی تھیں۔ انھوں نے مندر جانا بھی بند کر دیا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا، بخار ہو سکتا ہے۔ دوپہر ہو گئی تو میں جپ کرنے بیٹھ گیا۔ مندر میں پوجا کے بعد جنا دیدی کے سوا ہم سب نے ساہوکار کے گھر جم کر بھوجن کیا۔ ان کی ماں کا شرادھ[5] تھا۔

بھوجن کے بعد اُپادھیائے جی نے ہمیں بلا کر کہا، ''آج میں نہیں آ سکتا، تم اپنے آپ سبق یاد کر لینا۔ شاستری، ذرا دھیان رکھنا، لڑکا سبق ٹھیک سے یاد کرے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے مجھے شاستری کے حوالے کر دیا۔ بھوجن کے بعد ہر روز دوپہر کو مجھے اُڈوپ جی تکلی پر جنیؤ کا سوت تیار کرتے وقت 'شری سوکت'، 'پُرش سوکت' جیسے منتر یاد کراتے تھے۔ دور بیٹھ کر جنا دیدی مندر کے لیے بتیاں بٹتی تھیں۔ اُڈوپ جی کے گھر میں رہتے ہوئے یہ سلسلہ ایک دن بھی نہیں ٹوٹا تھا۔ لیکن اس دن اس سے چھٹی مل رہی تھی، اس لیے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

شاستری نے مجھے بلا کر کہا، ''اچھا، ذرا پُرش سوکت سناؤ۔'' وہ مجھ سے زیادہ عرصے سے وہاں پڑھ رہا تھا۔ 'سانڈ جیسا ہے'، کہہ کر جنا دیدی اسے ڈانٹا کرتی تھیں۔ میں منھ لٹکا کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ بولا، ''خیر، یہ سب جانے دے، پہلے اپنے پرور گوتر ٹھیک سے سنا۔''

گنیش ہنس رہا تھا۔ میں 'آنگی رَس، امبریش، یووناشو، تریارشوے پرور اونت، آنگی رَس گوتر، اشوالین سوتر، شرکشا کا دھائی نارین شرمن' کہہ ہی رہا تھا کہ اس نے کہا، ''اچھا ذرا کھڑا ہو کر، کان پکڑ کر ٹھیک طرح سے بول۔'' میں نے وہ سب دہرا کر کہا، ''ابھم بھو ابھی وادیے۔'' اس نے پھر حکم دیا، ''اچھا نمسکار کر دو۔'' میں نے نمسکار کیا۔ پھر وہ بولا، ''جیسا میں کہتا ہوں ویسا ہی کیا تو آگے سبق نہیں ہوگا۔'' مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے ''اب بھوت!'' کہتے ہی میں جنا دیدی کے پاس بھاگا۔

---

[5] شرادھ: مرے ہوئے رشتے داروں کے نام پر بخشش کی نیت سے خیرات کرنا اور لوگوں کو کھانا کھلانا۔

جمنا دیدی کھانا پروس کر چکی کے سامنے بیٹھی تھیں۔ چاول کے ساتھ آم کا اچار پروس رکھا تھا۔ لیکن ایسا نہیں لگا کہ انھوں نے ایک نوالہ بھی منھ میں رکھا ہو۔ میں وہاں جا کر بیٹھا۔ اس کے بعد نام کے لیے انھوں نے چار لقمے لیے اور باقی سارا کا سارا کھانا گھورے پر پھینک آئیں۔ میں نے پوچھا، ''کیوں دیدی، ایسا کیوں کیا؟'' مجھے معلوم تھا کہ انھیں آم کا اچار بہت اچھا لگتا ہے۔ ''پتا نہیں کیوں، آج کھانے کو من نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر انھوں نے ایک لمبی سانس لی۔ میں نے دان کے پیسے ان کے ہاتھ پر رکھے۔ وہ انھیں چھید والے ڈبے میں ڈالتے ہوئے بولیں، ''شاستری سے جا کر کہو کہ شوپور جا کر ایک سیر سوکھی مرچ اور ایک سیر دھنیا لے آئے۔''

میں شاستری کو ڈھونڈتا ہوا ساہوکار کے گھر تک پہنچ گیا۔ ان کے نوکر نے بتایا کہ وہ چھت پر ہے۔

اوپر جا کر دیکھا تو دری بچھی تھی۔ ساہوکار کا بیٹا رگھنا، گاؤں کے دو نوجوان اور شاستری بیٹھے تھے۔ پتے ہاتھوں میں جوڑ کر انھیں چھپاتے ہوئے وہ تاش کھیل رہے تھے۔ گنیش بیٹھا انھیں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی کھڑا ہو کر انھیں دیکھنے لگا۔ ''اکا، غلام، بادشاہ، بیگم'' کہتے ہوئے وہ دری کے بیچ پتوں کو پھینکتے اور پھر ایک دوسرے کے منھ کو دیکھتے۔ ''اس کھیل کا نام کیا ہے؟'' میرے یہ پوچھنے پر گنیش نے بتایا کہ یہ تاش کا کھیل ہے۔ جمنا دیدی کی بات میں نے شاستری سے کہی۔ ''شوپو جا کے بیچ بھالو آگیا۔'' یہ کہہ کر اس نے غصے میں پتے گنیش کے ہاتھوں میں تھما دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اگر یہ بات تو نے منھ سے نکالی کہ میں تاش کھیل رہا تھا تو تیرے سارے دانت توڑ دوں گا، سمجھا!'' یہ کہہ کر ڈانٹتے ہوئے وہ میرے ساتھ باہر آیا۔

اس نے مجھ سے اپنے ساتھ شوپور چلنے کو کہا۔ میں بولا، ''جمنا دیدی سے پوچھنا پڑے گا۔'' اس نے پھر ڈانٹتے ہوئے کہا، ''ارے، ایک دم سے لڑکی مت بن۔'' میری خواہش بھی شوپور جانے کی تھی، اس لیے میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ گاؤں کی حد پار کرنے کے بعد ایک تالاب آتا تھا۔ اس کے بعد بڑے سے جنگل میں ایک چھوٹا سا مندر۔ اسی راستے پر ہم چلتے گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد سیدھا راستہ چھوڑ کر اس نے کوئی اور راستہ پکڑ لیا اور کہا، ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہاں ایک بڑا اپیڑ تھا۔ اس پیڑ میں یک آدم قد کھوکھل تھی۔ شاستری نے اس کے اندر ہاتھ

ڈالا۔ میں بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس نے اندر سے کچھ نکالا اور مٹھی میں چھپاتے ہوئے مجھ سے پوچھا، "بتاؤ، میرے ہاتھ میں کیا ہے؟" "مجھے نہیں معلوم۔" کہنے پر اس نے مٹھی کھول کر دکھائی۔ مٹھی میں بیڑی کا بنڈل تھا۔ دوبارہ ہاتھ ڈال کر اس نے دیا سلائی کی ڈبی نکالی۔ اس کے اشارہ کرنے پر میں بیٹھ گیا۔ اس نے پوچھا، "معلوم ہے، ناک سے دھواں کیسے نکلتا ہے؟ کتنا اچھا لگتا ہے!" یہ کہتے ہوئے اس نے ناک سے دھواں نکال کر دکھایا۔ پھر زور ڈالتے ہوئے مجھ سے کہا، "تم بھی پیو۔" منہ بنا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے گھبرا کر کہا، "نہیں۔"

اس نے کہا، "جمنا دیدی سے کبھی مت کہنا۔ کسی کی شکایت نہیں کرنی چاہیے۔"

میں نے کہا، "ٹھیک ہے۔"

"تمھارے کہنے سے بھی میں نہیں ڈرتا، سمجھے! مجھے کیا جمنا دیدی کے کرتوت نہیں معلوم؟ اب انھوں نے مجھے ڈانٹا تو میں ساری پول کھول دوں گا۔ بلی آنکھیں موند کر کب تک دودھ پیتی رہے گی؟"

شاستری کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں، مگر سن کر ڈر لگا۔ ایسا لگا کہ جمنا دیدی کو بتائے بغیر مجھے اس کے ساتھ نہیں آنا چاہیے تھا۔ گوپال گپتی کی دکان سے اس نے سامان خریدا۔ شوپور کی پہاڑی سے اترتے وقت شاستری بولا، "واپس لوٹتے وقت دوسرے راستے سے چلتے ہیں، ندی کنارے سے۔"

مجھے انکار کرنے میں بھی ڈر لگا۔ شاستری کی کانی آنکھ اور اس کے اذیت رساں نوکیلے طعنے یاد آتے ہی اس کی کھینچی ہوئی لکیر لانگھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں رہا۔ لوٹتے وقت راستے میں کہنے لگا، "اب میں تمھیں ایک تماشا دکھاتا ہوں۔ تمھیں یہ دیکھ کر خود پتا چل جائے گا، پہلے سے بتا کر میں کیوں بدنام ہوں؟"

ہم کافی دور چل کر ایک اُجاڑ گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں ندی کے کنارے سے ذرا اوپر کی طرف پڑتا تھا۔ اس کا نام تھا ہوگل۔ ایک بار پہلے بھی میں جمنا دیدی کے ساتھ لکڑی چننے وہاں تک گیا تھا۔ سارے گھر گرے ہوئے تھے، مکانوں کی صرف ٹوٹی دیواریں اور نیویں ہی بچی تھیں۔ وہاں جینیوں کی پرانی بستی رہی تھی۔ مورتیوں سے خالی مندر میں چمگادڑیں اڑ رہی تھیں۔ جمنا دیدی نے بتایا کہ پرانے زمانے میں یہاں لوگ بستے تھے، اب یہ گاؤں اجڑ گیا ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ وہاں کہیں بھوت نہ ہوں۔ "ڈرپوک کہیں کا!" کہہ کر شاستری ہنس پڑا۔ پھر مجھے ساتھ لے کر دبے پاؤں آگے بڑھا۔ چھوٹی سی ایک دیوار کے پاس رک گیا اور مجھے دیوار میں بنی دراڑ میں سے دیکھنے کو کہا۔ وہ

Scanned with CamScanner

خود ایک دوسری دراڑ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی کو اوپر آتے ہوئے دیکھ کر مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں نے کہا: "چلو چلیں۔"

شاستری نے ڈانٹ کر کہا: "تمھیں بھی کچھ پتا ہونا چاہیے۔ ایسے ہی سدا بے وقوف بنے رہو گے! تم تو ٹھک مٹی کے اوتار ہو۔"

میں ڈرا ہوا کھڑا اس طرف دیکھتا رہا۔ لانگ دار دھوتی اور قمیض پہنے ایک آدمی آ رہا تھا۔ اس نے انگریزی کاٹ کے بال بنا رکھے تھے۔ اس آدمی کو میں نے پہچان لیا۔ تب میرا ڈر ذرا کم ہوا۔ اسے میں روز دیکھا کرتا تھا۔ وہ اُڈوپ جی کے گھر کے پاس والے اسکول میں پڑھاتا تھا۔ وہ تمکور سے آیا تھا اور اب شوپور میں رہتا تھا۔ روز سائیکل پر آتا تھا۔ رام نومی کو اس نے مندر میں ہارمونیم بجایا تھا۔ دیکھنے میں لمبا، پتلا اور شہری سا لگتا تھا۔

میں نے کہا: "اب چلو۔"

شاستری نے تھوڑی دیر اور رکنے کو کہا۔ جب میں دراڑ میں سے دیکھ رہا تھا تو اچانک مجھے ایک سانپ دکھائی دیا۔ ڈر کے مارے میرے منھ سے نکلا: "سانپ!" "ذرا چپ رہو!" شاستری نے مجھے ڈانٹا۔ کچھ دیر بعد بڑی بڑی مونچھوں والا ایک اور آدمی وہاں آیا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ کون ہے۔ وہ دونوں کچھ دیر تک باتیں کرتے رہے۔

وہاں سانپ دکھ جانے کے باعث میں وہاں سے فوراً نکل جانا چاہتا تھا۔ بڑا ڈر لگ رہا تھا مجھے۔ شاید شاستری بھی دراڑ میں سے دیکھتے دیکھتے اُوب گیا ہوگا۔ "چلو، تم تو ایک دم ڈرپوک ہو،" یہ کہتے ہوئے وہ جھک کر دبے پاؤں چلتا ہوا مجھے گاڑی والے راستے تک لے آیا۔ وہاں سے سیدھے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ جناویدی اُوبی ہوئی بیٹھی تھیں۔ میں نے انھیں دکان تک جانے کی بات ہی ڈرتے ڈرتے بتائی۔ اجڑے گاؤں جانا، وہاں دراڑ میں سے جھانکنا، سانپ کا دکھنا، یہ سب باتیں بتانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ ہم نے سنان کیا اور شام کی پوجا کرنے بیٹھے۔ بعد میں کھانا کھایا۔ جناویدی نے چھاچھ میں ستو گھول کر پیا۔

رات کو میں، شاستری اور گنیش برآمدے میں بستر بچھا کر سوئے۔ جناویدی بیچ والے کمرے میں سوئیں۔ اس رات ہمارے ساتھ سونے والے اُڈوپ جی نہیں تھے۔ شام کو ہم اس اجاڑ گاؤں سے

Scanned with CamScanner

ہو کر آئے تھے۔ وہاں سانپ دکھائی دیا تھا، اس لیے مجھے ڈر کے مارے بہت دیر سے نیند آئی۔ اگر کہتا کہ جمنا دیدی کے پاس جا کر سوؤں گا، تو شاستری ڈرپوک کہہ کر میرا مذاق اڑاتا، اس لیے میں برآمدے میں سویا تھا۔ ڈر لگ رہا تھا، اس لیے نیند آنے میں بڑی دیر لگی۔ ماں اور پتاجی کی بھی یاد آئی۔ میرے پاس لیٹا شاستری دھیرے سے میرے اوپر ہاتھ رکھ کر پاس سرک آیا۔ اس کے منھ سے بیڑی کی بدبو آرہی تھی، جو مجھے ناقابل برداشت لگی۔ اس نے میری دھوتی کھول کر میرے لنگوٹ پر ہاتھ رکھا۔ میں جھٹ سے اٹھ کر سیدھا جمنا دیدی کے پاس جا کر لیٹ گیا۔ انھیں نیند نہیں آئی تھی۔ میں نے کہا، "ڈر لگ رہا ہے۔" "ٹھیک ہے، میرے پاس ہی سو جا۔" یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنی ساڑھی مجھے اڑھا دی۔

کچھ دیر بعد میری آنکھیں بھاری ہونے لگی۔ تبھی ایسا لگا جیسے گھر میں کوئی چل پھر رہا ہے۔ گھبرا کر میری آنکھ کھل گئی۔ بھوت ہوگا، یہ سوچ کر میں کانپ اٹھا۔ جمنا دیدی نے مجھے کس کر اپنے سے لپٹا لیا۔ بعد میں پچھواڑے کے دروازے پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ ایسا لگا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ میں نے جمنا دیدی کو اور زور سے پکڑ لیا۔ پھر ایسا لگا کہ کوئی دھیرے دھیرے آواز دے رہا ہے، "دروازہ، دروازہ کھولو۔" اندھیرے میں اس طرح چور قدموں سے گھر کا چکر لگانے والا کہیں برہما راکشس[7] نہ ہو، یہ سوچ کر میں اور گھبرا گیا۔ جمنا دیدی اٹھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں روکا۔ لیکن وہ اٹھ کر چلی گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ اٹھ کر چلنے لگا تو انھوں نے کہا، "تو مت آ۔ بھوت ہو سکتا ہے۔ دروازے پر جھاڑو رکھ کر آتی ہوں تا کہ وہ اندر نہ آسکے۔"

وہ مجھے کمرے کے بیچ میں لیٹا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں روتا ہوا ان کا انتظار کرتا رہا۔ جمنا دیدی پچھواڑے کے دروازے تک گئیں لیکن انھوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اگر دروازہ کھلتا تو 'کھر' کی سی کرخت آواز ضرور ہوتی۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں، "جائیے، جائیے، یہاں نہیں آیا کیجیے۔" یہ کہہ کر لوٹ آئیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے اور ڈر لگا۔ وہ برہما راکشس سے بات کر کے آئی تھیں۔ انھوں نے مجھے اپنے پاس کھینچ کر سلا لیا۔ مجھے بہت دیر بعد نیند آئی۔

سورج نکلنے سے پہلے آنکھ کھل گئی۔ سنان کے لیے لکڑی اٹھا کر کنویں کے پاس جاتے ہوئے

---

[7] برہما راکشس بد روح، عفریت، بھوت، پریت۔

مجھے ڈر لگا۔ میں نے جمنا دیدی کو آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ مجھے یہ سوچ کر اور ڈر لگا کہ اگر شاستری کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ میرا اور مذاق اڑائے گا۔ جب میں اکیلا ڈلیا لے کر بیل پتر، تلسی اور پھول لانے کے لیے نکلا تو شاستری بھی یہ کہہ کر میرے ساتھ ہو لیا: "میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" منع کرنے میں بھی مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن رات کو برہما راکشس کے گھر میں چکر لگانے اور پہلے دن سانپ بھی دیکھنے کی واردات کے باعث اکیلے جانے میں اور ڈر لگ رہا تھا۔

راستے میں شاستری نے پوچھا: "برہما راکشس نے جمنا دیدی سے کیا کہا؟"

میں نے کہا: "مجھے نہیں معلوم۔"

اس نے پھر سے پوچھا: "جمنا دیدی اٹھ کر گئی تھیں۔ انھوں نے کچھ بتایا نہیں؟"

"بس یہ کہا تھا مت آؤ، چلے جاؤ، چلے جاؤ دروازے پر جھاڑو رکھ کر آئی تھیں۔"

"یہ برہما راکشس ہے کون، پتا ہے کچھ؟ تجھے ابھی تک پتا نہیں چلا۔ یہ تو بلی کے آنکھ موند کر دودھ پینے کے برابر ہے۔ چلو، چھوڑو — ایک نہ ایک دن پتا چل جائے گا تجھے۔ جمنا دیدی کو میں پھوٹی آنکھ نہیں سہاتا۔ تجھے چھپا کر سوجی کے لڈو، نمکین کوڑوے دیتی ہیں نا؟"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں، اس لیے چپ رہا۔ بیل پتر لانے جب ہم گوداورما کے گھر پہنچے تو انھوں نے پوچھا: "جمنا دیدی کیسی ہے؟"

میں نے کہا: "جمنا دیدی کو بخار آتا ہے، یہ سچ ہے۔"

"بھن بھار کچھ نہیں آتا۔ کل رات کو ایک برہما راکشس گھر کا چکر کاٹ رہا تھا۔ پچھواڑے آکر اس نے دروازہ بھی کھٹکھٹایا تھا۔" شاستری نے اپنی کافی ٹھکے مارتے ہوئے گوداورما سے کہا۔

گوداورما ساری باتیں کرید کرید کر پوچھنے لگیں۔

بیل پتر توڑ چکنے کے بعد شاستری نے مجھ سے کہا: "اے بھر گو، سیرا ہنسے چل۔ مندر سے چمپا کے پھول توڑ کر لائیں!"

ہم ایک کھیت لانگھ کر گئے اور چمپا کے پھول توڑے۔ تب شاستری نے مجھ سے کہا: "سیرا ہنسے بھگوان کو تو بنا نہائے دھوئے چھو سکتا ہے؟ تجھ میں اتنی ہمت ہے؟"

میں نے سن رکھا تھا کہ سیرا ہنسے بھگوان کے مندر میں ناپاکی ہو جائے تو سانپ دکھائی دیتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ میں نے کہا، ''نہ بابا نہ۔''

اس پر شاستری نے کہا، ''اسی لیے تو تجھے چھوکری، ڈرپوک بھرگو کہتے ہیں۔ کیسا ڈرپوک ہے! گھر چکر کاٹنے والے کو برہما راکشس کہا تو جھٹ سے ڈر گیا۔ یہ دیکھ، میں چھو کر آتا ہوں۔''

وہ سیدھا مندر کے اندر گیا اور اس نے بھگوان کی مورتی کو چھو دیا۔ مجھے شرم آئی اور ڈر بھی لگا۔ ''تو بھی چھو لے!'' یہ کہہ کر اس نے مجھے کھینچا اور مورتی سے میرے ہاتھ چھوا دیے۔ بعد میں ہنستے ہوئے کہنے لگا: ''میرے ہاتھ میں گرڑ[8] کا تل ہے، اس لیے میں نے نڈر ہو کر چھوا۔ تجھے ضرور سانپ آ کر کاٹے گا۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ناچنے لگا۔ مجھے رونا آ گیا۔ ''میرے کہنے کے مطابق چلے گا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں دھیان رکھوں گا کہ تجھے سانپ نہ کاٹے۔ جمنا دیدی کے بارے میں میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ انھیں مت بتانا۔ اگر تو نے بتایا تو میں بھی یہ بتا دوں گا کہ تو نے ناپاکی کی حالت میں جا کر بھگوان کی مورتی کو چھوا ہے۔''

میں آنسو پونچھتا ہوا گھر آیا۔ جمنا دیدی کے پوچھنے پر میں ڈر کے مارے چپ رہا۔ انھوں نے شاستری کو بلا کر کہا، ''تجھے روٹیاں لگ گئی ہیں!'' پھر اسے خوب ڈانٹا۔ میں سارا دن شاستری کے پاس نہیں گیا۔ بیٹھے کھڑے یہ سوچ کر ڈرتا رہا کہ کہیں سانپ نہ آ جائے۔ گائتری منتر کا جپ کرتا گھومتا رہا۔ اس رات برہما راکشس چکر لگانے نہیں آیا۔

اس دن سے میں شاستری سے نہیں ملا۔ وہ جب بھی ملتا اپنی کانی آنکھ کی تیکھی نظر سے دیکھ کر ڈانٹتا، ''اگر تو نے جمنا دیدی کو بتایا تو تجھے سانپ آ کر کاٹے گا۔'' مگر میں اس سے بات ہی نہیں کرتا تھا۔ جمنا دیدی جہاں جاتیں، ان کے ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ شاستری اور گنیش، ساہوکار کے بیٹے رنگا کے ساتھ گپ چپ باتیں کرتے رہتے۔

ایک دن جمنا دیدی نے کہا، ''آؤ، چلیں جنگل میں سے جلاون[9] لے آئیں۔'' ہم دونوں اسی اجاڑ گاؤں میں پہنچے۔ دور سے ہی مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ ''وہاں سانپ ہے،

[8] گرڑ: بڑا عقاب نما پرندہ جسے دیوتا وشنو کی سواری مانا جاتا ہے۔

[9] جلاون: جلانے کی لکڑیاں، ایندھن۔

میں نہیں جاؤں گا!'' یہ کہہ کر میں نے ضد کی۔ انھوں نے ڈانٹا، منت کی، لیکن میں نہیں مانا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی میرے ساتھ گھر لوٹ آئیں۔

ایک دن میں بیل پتر لانے گوداوریا کے گھر گیا۔ گوداوریا نے مجھے دیکھ کر کہا، ''آؤ، اندر چلیں۔'' پھر میری پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اندر لے گئیں۔ رسوئی میں بٹھا کر پینے کو کافی دی۔ کافی پینے سے میں نے انکار کیا۔ انھوں نے کہا: ''کبھی کبھی پی لینی چاہیے۔''

کافی دیکھ کر مجھے بھی پینے کی بڑی خواہش ہونے لگی تھی، اس لیے کافی پینے لگا۔

گوداوریا ہنستی ہوئی بولیں، ''تم تو بڑے اچھے بچے ہو۔ ریت رواج کا خیال رکھتے ہو۔ دوسرے لڑکوں جیسے نہیں ہو۔ آج کے لڑکے کسی کی بات سنتے ہیں کوئی! سب نے پوجا پاٹھ کرنا بھی کا چھوڑ دیا ہے۔ ہون وغیرہ تو بالکل ہی بند ہو گئے ہیں۔ اب اس ساہوکار کے بیٹے رنگنا ہی کو دیکھو۔ سانڈ کی طرح بڑھ رہا ہے۔ عمر بھی کیا کوئی کم ہے؟ مونچھیں آنے لگی ہیں۔''

پھر وہ میری تعریف کرنے لگیں۔ اٹھتے وقت انھوں نے مجھ سے پوچھا: ''کیوں رے، کیا جمنا مندر نہیں جاتی؟ بستر سے بھی نہیں اٹھتی کیا؟''

میں نے کہا: ''نہیں۔''

انھوں نے پوچھا: ''تو تم سب کے لیے کھانا کون پکاتا ہے؟ اڈوپ جی بھی گھر میں نہیں ہیں۔ وہ بدمعاش کیا آج کل بھی گھر کا چکر لگاتا ہے؟''

میں نے کہا کہ اس دن کے بعد سے وہ نہیں دکھائی دیا۔

پھر انھوں نے پوچھا: ''کیوں رے، جمنا دیدی کو اُلٹی وُلٹی ہوتی ہے کیا؟ کہتے ہیں باری کے بخار میں اُلٹیاں بہت ہوتی ہیں۔ پرسوں میں نے اسے دوائی لینے کے لیے کہا تھا۔ کچھ لے رہی ہے کیا؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ تیزی سے قدم رکھتا ہوا میں وہاں سے چل پڑا۔ گھر پہنچا۔ ساری باتیں جمنا دیدی کو بتائیں۔ انھوں نے جو جو سوال مجھ سے کیے، میں نے ان سب کا جواب دیا۔ جمنا دیدی ساری باتیں سن کر گھبراہٹ کے مارے زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انھوں نے کہا: ''تم آگے سے اس طرف کبھی مت جانا۔''

اس دن دوپہر کو گنیش کے چچا، سُبّا شاستری، ہورنی سے ہمارے گاؤں آئے۔ جمنا دیدی

Scanned with CamScanner

کے بات کرنے پر بھی وہ ان سے بولے نہیں۔ جمنا دیدی کا بنایا شربت بھی نہیں چھوا۔

"گنیش، تو اپنی چٹائی اور کپڑے باندھ لے۔" یہ کہہ کر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ بعد میں جمنا دیدی بیٹھ کر بہت دیر تک روتی رہیں۔

اس دن بھوجن کرنے میں جب ہاتھ دھونے کے لیے پچھواڑے گیا تو ایسا لگا کہ گلی پر کوئی پاؤں دھرتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ میں ڈر کے مارے چیخ پڑا، "جمنا دیدی!" جمنا دیدی اور شاستری دوڑے آئے۔ ایک آدمی بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔

"اس برہما راکشس کا کیا کریں؟" یہ کہہ کر شاستری نے جمنا دیدی کی طرف دیکھا۔ جمنا دیدی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا، "تو چپ رہ، تجھے بولنے کی ضرورت نہیں۔" پھر گنیش کے پتاجی بھی آ کر اسے لے گئے۔ "میرے پتاجی آ کر مجھے کیوں نہیں لے جاتے؟" یہ کہہ کر میں رات بھر روتا رہا۔ جمنا دیدی مجھے گلے لگا کر بلک بلک کر روئیں، "تو مجھے چھوڑ کر کبھی مت جانا۔"

جمنا دیدی اب چاروں پہر گھر میں ہی رہنے لگی تھیں۔ ایک دن شام کو گوداورما نے دروازہ کھٹکھٹایا تو جمنا دیدی نے مجھ سے کہلوا دیا کہ گھر میں نہیں ہیں۔ دوپہر کو ہمیں وید پڑھانے کے بعد اُپادھیائے جی جانے کے لیے اٹھے۔ جمنا دیدی نے انھیں شربت لا کر دیا۔ انھوں نے نہیں پیا۔ "مجھے نہیں چاہیے۔" کہہ کر وہ چلے گئے۔ جمنا دیدی سارا دن کونے میں بیٹھی سوچتی اور روتی رہیں۔

ایک دن دوپہر کو اُپادھیائے جی نے ہم سب کو جلدی جلدی سے وید پاٹھ کی مشق کرائی۔ اس کے بعد وہ چلے گئے۔ شاستری رنگنا سے گپیں لگانے چلا گیا۔ گھر میں میں اور جمنا دیدی ہی رہ گئے تھے۔ تبھی پٹ رنگی نام کی ایک کونکنی عورت نے پچھواڑے کے دروازے پر آ کر آواز دی، "بہن جی!" پھر وہ ان سے بات چیت کرنے لگی۔ پھر اچانک بیچ میں بولی، "بہن جی، آج کل آپ بہت سندر دکھنے لگی ہیں۔ گول گول موٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟" یہ سنتے ہی جمنا دیدی نے باتیں کرنا ایک دم بند کر دیا اور اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ بعد میں وہ باہر نہیں آئیں۔ پٹ رنگی دیر تک انتظار کرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے چلی گئی، "کیا بات ہے؟ بہن جی کو غصہ آ گیا کیا؟"

اس رات جمنا دیدی نے مجھے اپنے پاس سلایا اور بہت دیر تک روتی رہیں۔ بعد میں انھوں نے ساڑھی کی گانٹھ کھولی اور اسے ذرا نیچے سرکا کر اپنے پیٹ پر میرا گال رکھوا کر پوچھا، "تجھے کچھ سنائی

Scanned with CamScanner

دیتا ہے؟" ان کے کومل اور ٹھنڈے پیٹ پر گال رکھنا مجھے اچھا لگا۔ ماں کی یاد آنے لگی۔ جمنا دیدی کا روتا دیکھ کر مجھے بھی رونا آنے لگا۔ بعد میں انھوں نے میرے منھ کو اپنی چھاتیوں سے لگالیا اور میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگیں، "تو مجھے چھوڑ کر مت جانا، سمجھے؟" مجھے اس رات بڑے آرام کی نیند آئی۔

اس سے دوسرے دن اپادھیائے جی نے ہمیں جب پاٹھ نہیں کرایا۔ وہ وید پڑھانے کے لیے بھی نہیں آئے۔ مندر آئے، پوجا ختم کرتے، وہیں سے چلے گئے۔ بعد میں وہ گھر کی طرف پھٹکے تک نہیں۔ سے پہر کی سنان اور شام کی پوجا سے چھٹی ملنے کی مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

ایک دن مجھے تکیے کے نیچے اور بیل پتا دے جاتا تھا۔ شاستری لوٹا ہی نہیں تھا۔ وہ ساہوکار کے گھر میں ہی رہنے لگا تھا۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی وہ دونوں مجھے دور سے ہی چڑایا کرتے تھے۔

ان دنوں مجھے جمنا دیدی گھر سے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ مجھے بڑا غصہ آتا تھا۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوا بیٹھا رہا کرتا۔ کانا شاستری رنگنا کے ساتھ گھومتا رہتا اور موج مناتا تھا۔ وہ پرائمری اسکول کے لڑکوں کے ساتھ بندر کا کھیل کھیلا کرتے۔ کبھی تو چیتا۔ خوب اُدھم مچا رہا تھا وہ بھی۔ ہمارے گھر پر آدمی کی کون کہے، بچے تک کی چھایا نہیں پڑتی تھی۔ میں نے اور جمنا دیدی نے اسی طرح گھر میں رہتے ہوئے ایک ہفتہ گزارا۔ یہ سوچ سوچ کر رونا آتا کہ چاچی آ کر مجھے گھر کیوں نہیں لے جاتے۔ جمنا دیدی کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے غصہ آنے لگتا۔ میں غصہ کرتا تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر فریاد کرتے ہوئے کہتیں: "مجھے چھوڑ کر مت جائیو؟"

ایک دن جب جمنا دیدی مجھے منانے آئیں تو میں نے ان کے پیٹ پر لاتیں ماریں۔ بعد میں اپنی غلطی کے لیے ان سے معافی بھی مانگی۔ اس رات جب پورا گاؤں سویا ہوا تھا تو جمنا دیدی مجھے جگا کر اپنے ساتھ مندر لے گئیں۔ وہاں بھگوان کے سامنے دیا جلا کر وہ دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھی رہیں اور بھگوان کو پرنام کرکے، مجھے لے کر گھر لوٹیں۔

اس دوپہر میں اکیلا کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ جمنا دیدی پر مجھے بڑا غصہ آرہا تھا۔ چاچی مجھے گھر کیوں نہیں لے جارہے ہیں، یہی سوچ رہا تھا۔ گھر کو یاد کرکے رونا آرہا تھا۔ باہر لڑکیاں لنگڑی ٹانگ

کھیل رہی تھیں۔ تبھی رنگنا کے ساتھ شاستری گلی میں آیا اور ہاتھ کے اشارے سے اس نے مجھے باہر بلایا۔ میں نے سر ہلا کر کہا کہ میں نہیں آتا۔ اس نے کہا، "آ، ذرا گھوم آئیں۔" میرا باہر جانے کو دل چاہا۔ "جمنا دیدی سے پوچھ کر آتا ہوں،" میں نے کہا۔ اس نے کہا، "جمنا دیدی گھر میں نہیں ہیں۔ تو چلا آ۔"

میں اندر گیا تو دیکھ کر تعجب ہوا کہ دیدی وہاں نہیں تھیں۔ میں باہر آ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ رنگنا اور شاستری کے ساتھ گاؤں کے تین بڑے لڑکے اور تھے، جو اس دن ان کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ تالاب کے پاس سے گزرتے وقت مجھے ڈر لگا کہ وہ کہیں مجھے پھر سے اس اجاڑ گاؤں کی طرف نہ لے جائیں۔ "میں نہیں جاتا" کہہ کر میں نے ضد کی۔ لیکن شاستری نہیں مانا۔ مجھے کھینچ کر اپنے ساتھ لے گیا۔

"تیرے پتا جی نے تجھے بھی لے جانے کے لیے خط لکھ دیا ہے رے۔ اس سے پہلے تجھے ایک تماشا دکھاتے ہیں۔"

میرا ہاتھ پکڑ کر شاستری نے مجھ سے یہ بات بڑے پیار سے کی۔ اس ڈر سے کہ وہ کہیں ڈرپوک کہہ کر میرا مذاق نہ اڑائے، میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ راستے بھر برابر اپنے بھگوان کو چھوڑ کر بھرشٹ کرنے، سانپ دیکھنے، برہما راکشس کی گھر کے چکر کاٹنے کی وارداتیں یاد کر کر کے ڈرتا رہا۔ بانس جیسے لمبے رنگنا کو دیکھ کر مجھے اپنے پتا جی سے بھی زیادہ ڈر لگتا تھا۔

جنگل میں بہت لمبے راستے سے چلتے ہوئے ہم اس اجاڑ گاؤں میں ایک کونے سے داخل ہوئے۔ ندی کا پانی بہنے کی آواز وہاں سنائی دے رہی تھی۔ شاستری دھیرے سے بولا، "یہاں سے تم لوگ میرے پیچھے پیچھے دھیرے دھیرے چلے آؤ۔"

وہ آگے اور ہم پیچھے چلے۔ ایک دم چپ چاپ، بنا کسی آہٹ کے۔ تھوڑی دیر بعد میں اور شاستری اسی چھوٹی دیوار کے پیچھے پہنچے جہاں سے ہم نے پہلے چھپ کر دیکھا تھا۔ میں اور شاستری اسی درز میں سے جھانکنے لگے۔ ہمارے ساتھ کے باقی چاروں لڑکے لمبے تھے، وہ دیوار سے لگ کر اور سر نکال کر دیکھنے لگے۔ سانپ کی یاد آتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

میں نے کہا، "شاستری، وہ دیکھ، سامنے سانپ دکھائی دے رہا ہے"

ہم سے ذرا دور ۔ دیدی ہماری طرف پیٹھ کر کے ایک چٹان پر دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی تھیں۔ مجھے یہ سوچ کر تعجب ہوا کہ وہ گھر سے اتنی دور آکر یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہیں۔ انھیں ڈر نہیں لگتا؟ انھیں یہ نہیں معلوم کہ یہاں سانپ ہے؟ کچھ دیر بعد جمنا دیدی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دیوار پر سے جھانکنے والے لڑکے جھٹکے سے نیچے بیٹھ گئے۔ جمنا دیدی کسی کو ڈھونڈتی ہوئی ہماری طرف ہی آنے لگیں۔ میں نے کہنا چاہا: "جمنا دیدی، ہم سب یہاں ہیں۔ چھپ کر تمھیں دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ایک سانپ بھی ہے۔" لیکن میرا منھ کھلنے سے پہلے ہی شاستری نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ رنگنا نے اپنی ناک پر انگلی رکھ کر مجھے ڈرایا۔ میں چپ ہو گیا۔

اچانک جمنا دیدی ٹھٹکیں اور اس دیوار کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگیں۔ شاستری سانس روک کر بیٹھ گیا اور اس نے میرے منھ پر ایک ہاتھ رکھے رکھا۔ جمنا دیدی پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے اندھوں کی طرح پاؤں رکھتے ہوئے پھر اسی چٹان پر جا بیٹھیں جہاں پہلے بیٹھی ہوئی تھیں۔

میں بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔ ساہوکار کا بیٹا رنگنا اور دوسرے لڑکے بھی تھک کر نیچے بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے نے شاستری کے کان میں کہا کہ کچھ دکھائی دے تو ہمیں بھی بتانا۔ رنگنا نے سگریٹ سلگائی۔ دوسری سگریٹ شاستری کو دی۔ شاستری نے مجھ سے کہا، "اب تھوڑی دیر میں یہاں برہما راکشس آئے گا تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔" یہ سن کر مجھے بڑا ڈر لگا۔ اسی طرح کچھ وقت اور گزرا۔ میں اونگھنے لگا۔ دھیرے دھیرے شام ہونے لگی۔

مجھے اپنے ماں باپ کی یاد آنے لگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کیسے لوگوں کے ہاتھ پڑ گیا ہوں میں۔ پتا نہیں صحیح سلامت گھر پہنچ پاؤں گا بھی یا نہیں۔ میں نے شاستری سے لوٹنے کو کہا۔ "جاتا ہے تو تو اکیلا چلا جا۔ راستے میں تجھے سانپ ضرور ملے گا۔ میرے ہاتھ میں تو گرڑ کا تل ہے، یہ تجھے پہلے ہی پتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ میں چپ ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد دور سے ایک آدمی آتا دکھائی دیا۔ وہ پتلا اور لمبا تھا۔ اس نے لانگ دار دھوتی پہن رکھی تھی۔ انگریزی کاٹ کے بال تھے۔ پاس آنے پر پتا چلا کہ یہ وہی آدمی ہے جسے ہم نے پہلی بار یہاں چھپ کر دیکھا تھا، جو سائیکل پر درشوپور سے ہمارے گاؤں آتا ہے۔ اس گیہویں رنگ والے شہری کا نام مجھے معلوم نہیں تھا۔

Scanned with CamScanner

شاستری نے چٹکی بجا کر کہا: "یہ ہمارا شمشان ہے۔"

بیٹھے ہوئے لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے چھوٹی دیوار پر سے جھانکنا شروع کیا۔

وہ جمنا دیدی کے پاس، ہماری طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ "دیکھ دیکھ، اچھی طرح دیکھ" کہتے ہوئے شاستری نے جیسے کنی چھپائی۔ اس نے جمنا دیدی سے کچھ کہا۔ وہ ایک دم کانپ اٹھیں۔ اس نے ان کا بازو پکڑا۔ وہ اس کے ہاتھ کو جھٹک کر دور ہٹ گئیں۔

شاستری نے سیٹی بجاتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور بھنویں چڑھا کر میری طرف دیکھا۔

تبھی دراڑ میں سے دیکھتے ہوئے مجھے ایک سانپ دھیرے دھیرے رینگتا ہوا دکھائی دیا۔ میرے منھ سے نکلا، "سانپ!" سب نے اس طرف دیکھا۔ "پانی کا سانپ ہوگا۔" یہ کہہ کر انھوں نے مجھے چپ رہنے کو کہا۔ میں چیخنا چاہتا تھا۔ رنگنا نے ایک چپت جما کر میرا منھ بند کر دیا۔ شاستری نے کہا: "رونا مت! آگے بڑا مزہ آئے گا۔ تھوڑی دیر ٹھہر جا۔" میں چپ ہو گیا۔

گال ملتا ہوا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سانپ بغیر کسی آہٹ کے جمنا دیدی کے بیٹھنے کی جگہ کی سمت جا رہا تھا۔ جس طرف سے سانپ آ رہا تھا، ادھر ان کی پیٹھ تھی۔ انھوں نے اس طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ سانپ بل کھاتا، شام کی روشنی چمکاتا ہوا، جگہ جگہ سونگھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ شاستری نے پھر کہا: "پانی کا سانپ ہے، ڈرو مت۔ اس کی طرف مت دیکھ، اپنے آپ چلا جائے گا۔ ان دونوں کا مزہ دیکھ۔"

سانپ بائیں طرف مڑا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ جمنا دیدی کی طرف نہیں جائے گا، مگر وہ پھر دائیں طرف مڑ گیا۔ ہمارے ساتھ آئے ایک لڑکے نے کہا: "اس رانڈ کی وجہ سے بھگوان کی ناپاکی ہوگئی ہے، اسی لیے یہ سانپ یہاں آیا ہے۔" سب نے ہامی میں سر ہلایا۔ میرا بیٹھے بھگوان کو ناپاکی حالت میں چھونے کی بات یاد کر کے میں کانپ اٹھا۔ میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

رنگنا نے کہا: "اگر بھگوان نے ہی یہ سانپ بھیجا ہے تو یہ اسے ضرور کاٹے گا۔ یہی اس کی صحیح سزا ہے۔"

سانپ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا اور اپنا پھن پھیلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ تب سب کے منھ سے ایک ساتھ نکلا: "ارے، یہ تو ناگ ہے!" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شاستری نے مجھے کھینچ کر بٹھا دیا۔ سانپ پھر چٹان کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ جمنا دیدی سے باتیں کیے جا رہا تھا، لیکن وہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی تھیں۔

Scanned with CamScanner

اس نے ان کے پاس جا کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جمنا دیدی نے پھر سے ہاتھ جھٹک دیا۔ اس بار وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ دیوار کے اوپر سے جھانکنے والے سب لڑکے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر میرا من ذرا ہلکا ہوا کہ اب جمنا دیدی اپنی طرف بڑھتے سانپ کو دیکھ لیں گی۔ لیکن ان کی نگاہ اس کی طرف نہیں تھی۔ وہ پھر سے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ مجھے اتنا ڈر لگا کہ رونا آ گیا۔ سانپ اس پتھر کی طرف ہی جا رہا تھا جس پر وہ بیٹھے تھے۔ ''سبرا مپیہ!'' کہتے ہوئے میں نے آنکھیں موند لیں اور بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگا۔ پتھر کے پاس پہنچے سانپ نے اپنے منھ سے پتھر کو کئی بار چھو چھو کر دیکھا۔ میں کانپ رہا تھا۔ شاستری نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا، ''یہی اس کے گناہ کی سزا ہے۔''

سانپ پتھر کے نیچے گھس گیا۔ جمنا دیدی اور وہ، دونوں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ اس حالت میں سانپ انھیں کاٹ سکتا ہے، یہ سوچتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پتھر کے نیچے سانپ کے لیے شاید کافی جگہ نہیں رہی ہوگی، اس لیے وہ پھر سے باہر آ گیا۔ بادلوں سے باہر نکلے سورج کی روشنی میں سانپ چمچما رہا تھا۔

اس آدمی نے پھر سے کچھ کہتے ہوئے جمنا دیدی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے سوچا، اس بار بھی جمنا دیدی غصے سے پھر سے اس کا ہاتھ جھٹک دیں گی، ان کی نگاہ پتھر کو اپنے منھ سے چھو چھو کر دیکھتے ہوئے سانپ کی طرف چلی جائے گی۔ یہ اچھا رہے گا، یہ سوچتے ہوئے میں نے ایک لمبی سانس چھوڑی۔ لیکن جیسا میں نے سوچا تھا ویسا نہیں ہوا۔ جمنا دیدی اٹھ کر کھڑی نہیں ہوئیں۔ اس سے لگ کر رونے لگیں۔ اس نے انھیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر بیٹھ گئیں۔

میں اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے کی طرف کود پڑا۔ رنگنا اور شاستری مجھے پکڑنے کے لیے لپکے۔ لیکن اس سے پہلے ہی میں ان کی طرف چیختا ہوا بھاگا، ''سانپ ہے، سانپ! جمنا دیدی!''

جمنا دیدی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ گھبرا کر دس قدم پیچھے ہٹیں اور بے بسی کے انداز میں کھڑی ہو گئیں۔ چھوٹی دیوار کے پیچھے کھڑے سبھی لڑکے کود کود کر بھاگ گئے۔ جمنا دیدی کے ساتھ کا وہ آدمی انھیں دیکھتے ہی اپنی دھوتی سنبھال کر مخالف سمت میں بھاگا۔ میں نے بھاگتے ہوئے وہیں پڑا ایک پتھر اٹھایا اور اپنی پوری طاقت سے بڑے پتھر کی طرف بڑھتے سانپ کی جانب پھینکا۔ ڈر کے مارے میں پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ دوڑتا ہوا میں جمنا دیدی کے پاس پہنچا اور ان کے پیٹ پر منھ رکھ کر انھیں زور

Scanned with CamScanner

سے کس لیا۔ بعد میں ایک وزنی پتھر اٹھا کر سانپ کی جانب پھینکا۔

سانپ سر سے پتھر کے اوپر سے اترنے لگا۔ اپنے لمبے جسم کو کھینچتا اور لہراتا ہوا، بل کھاتا، پھس پھس کرتا ہوا ہماری طرف بڑھنے لگا۔ جمنا دیدی کا ہاتھ پکڑ کر، انھیں اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا میں تھوڑی دور تک بھاگا۔ جمنا دیدی تھک کر رک گئیں اور وہیں زمین پر دھپ سے بیٹھ گئیں۔

میں پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں جمنا دیدی کے پاس بیٹھ گیا اور تھوڑی دیر ستا کر میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سانپ ہمارے سامنے والی باپی میں اپنا سر گھسا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اس نے اپنے پورے لمبے جسم کو اندر کھینچ لیا۔ میں صرف اس کی پتلی سی دم باہر رہ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بھی اوجھل ہو گئی۔ میں ٹکٹکی لگا کر ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ تب اس بے آباد اجاڑ گاؤں میں میں، جمنا دیدی اور باپی کے اندھیرے میں چھپا ہوا، بل کھایا، زندہ اور غصے میں بھرا سانپ رہ گئے تھے۔

میں نے دیدی کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ انھیں ساتھ لے کر پچھواڑے کے دروازے سے گھر پہنچا۔ میرے پاؤں ٹوٹ رہے تھے۔ یہ بہادری کا کام میرے ہی ہاتھوں ہوا ہے، اس احساس کے اثر سے گھر پہنچنے تک میں نہیں رویا۔ سارے دروازوں کی چٹخنیاں چڑھا کر گھر کے بیچ میں آیا۔ وہاں جمنا دیدی فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ وہ اس طرح کراہ رہی تھیں جیسے مر رہی ہوں۔ میں چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ سارے دروازے بند کر دینے سے گھر میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ اندھیرے میں جمنا دیدی دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ صرف ان کے کراہنے اور تڑپنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں ایسے ہی بہت دیر تک ایک کونے میں کھڑا رہا۔

کراہنا بند کر کے جمنا دیدی نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا میں ان کے پاس آیا۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاتھوں سے کس لیا۔ تب مجھے لگا کہ وہ بالکل ننگی ہیں۔ میرے چہرے کو انھوں نے اپنے پیٹ سے چپٹاتے ہوئے کہا، ''ہائے ہائے، جل رہا ہے، جل رہا ہے!'' پھر وہ زور سے رو اٹھیں۔ ابھرے ہوئے گول پیٹ سے لگا میرا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا۔ سانس لینا دوبھر ہونے لگا۔ ''ارے مجھے چھوڑیے، چھوڑیے!'' میں نے مشکل سے خود کو چھڑایا۔ جمنا دیدی بھی چپ ہو گئیں۔ ساکت ہو کر وہ چت لیٹ گئیں۔

Scanned with CamScanner

میں کچھ دیر تک ویسے ہی بیٹھا رہا۔ لگ رہا تھا کہ مجھے بھی کنیش کی طرح یہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ جمنا دیدی مر جائیں تو اچھا ہے۔ تب میں اپنے گھر جا سکوں گا۔ لیکن تبھی یہ ڈر بھی لگا کہ کہیں مر ہی نہ گئی ہوں۔ ''جمنا دیدی! جمنا دیدی!'' میں نے زور سے آواز دی۔ جواب نہیں ملا۔ ڈر کر میں نے کہا، ''جمنا دیدی، مجھے بھوک لگی ہے۔'' یہ کہہ کر میں رونے لگا۔ جمنا دیدی اٹھیں اور ساڑھی باندھ کر رسوئی میں چلی گئیں۔ میرے لیے چھاچھ میں ستو گھول کر دیا۔ میں نے پوچھا، ''آپ نہیں لوگی؟'' ''تو کھا لے،'' یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں بیٹھ گئیں۔ اندھیرے میں ستو کھاتے کھاتے مجھے رونا آ گیا۔

''رو نہیں،'' کہتے ہوئے انھوں نے مجھے پیار کیا۔

اچانک آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں بستر میں اکیلا ہوں۔ اوپر چادر اڑھائی گئی تھی۔ ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کہ جمنا دیدی پاس نہیں ہیں۔ میں ڈر کے مارے اٹھ بیٹھا اور میں نے جمنا دیدی کو زور سے آواز دی۔ پچھواڑے جا کر دیکھا، وہ وہاں بھی نہیں تھیں۔ کنویں کی جگت[10] کے پاس کھڑا ہو کر میں رونے لگا۔ یہ سوچ کر غصہ بھی آیا کہ مجھے بستر پر سلا کر جمنا دیدی کہاں چلی گئی ہیں! دور ایک گھر کے اُسارے میں لالٹین کے چاروں طرف بیٹھے کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس وقت کیا بجا ہوگا — آدھی رات ہے، صبح ہو رہی ہے یا شام کے بعد ابھی رات شروع ہونے والی ہے، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں صرف ستارے چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پوجا پاٹھ کیے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس لیے مجھے تاریخ، دن وغیرہ کا کوئی اندازہ نہیں رہا تھا۔ اماوس کی رات ہو سکتی ہے، یہ سوچ کر ڈر لگا۔ برہما راکشس یاد آ گیا۔ ''یہ گندی جمنا دیدی کہاں چلی گئیں!'' یہ کہتے ہوئے میں نے انھیں کوسا۔ ''مجھے چھوڑ کر چلی گئیں،'' یہ کہتا اور روتا ہوا میں کنویں کی جگت سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پچھواڑے دور سے کسی کے ''ماں جی!'' کہہ کر پکارنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک پڑا۔ ایسا لگا کہ کوئی ''ماں جی، ماں جی!'' کہہ کر زور سے آواز دے رہا ہے۔

میں نے پوچھا، ''کون ہے؟'' تبھی باڑ کے پاس سے آواز آئی، ''میں ہوں، مہاراج، کٹیر۔ کیا

---

10 جگت کنویں کی مینڈھ، پشتہ۔

Scanned with CamScanner

آج مجھے بھکتا نہیں ملے گی؟"

میں نے کہا: "ارے کبیر، یہاں آ رے!"

اس نے کہا: "میں وہاں نہیں آ سکتا۔"

میں نے ہی اس کے پاس جا کر کہا: "ماں جی گھر میں نہیں ہیں، تو میرے ساتھ چل۔" میں نے سوچا کہ جمنا دیدی ندی کے پاس والے اسی اجاڑ گاؤں میں گئی ہوں گی۔ وہ سب پھر وہاں آ گئیں گے۔

کبیر میرے آگے آگے چلا۔ جنگل میں چپ چاپ چلتے ہوئے مجھے ڈر لگ رہا تھا، اس لیے میں نے کبیر سے باتیں کرنا شروع کیا اور سارے دن میں جو جو کچھ ہوا تھا، سے زور زور سے بول کر بتایا۔ لیکن ایسا نہیں لگا کہ اسے میری بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ چپ چاپ آگے چل رہا تھا۔ ہم تالاب کے پاس پہنچے۔ وہاں اسی کی ذات کے کچھ چمار مشعل کی روشنی میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ان سے ایک مشعل مانگ کر اس نے کہا: "ادھر اندر سے بھی ایک راستہ ہے، آئیے۔"

گھنی اور چھوٹی چھوٹی کانٹے دار جھاڑیوں کے بیچ والے راستے سے وہ مجھے لے چلا۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اور ڈر لگنے لگا۔ کبیر اپنے آپ گانے لگا۔ وہ کافی آگے چل رہا تھا، اس لیے مجھے راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کئی جگہ تو ہمیں پیٹ کے بل رینگنا پڑا۔ کبیر ایک دم جھک کر چلتے وقت ہُش ہُش کہتا جا رہا تھا۔ تبھی سر سر سر کی آواز ہوئی، ویسی ہی جیسے کسی سرکنے والی چیز کے بھاگنے کی ہوتی ہے۔

"واپس چلو، کبیر!" یہ کہہ کر میں نے رونا شروع کر دیا۔ اس نے کہا: "اب پہنچ ہی گئے ہیں۔" آگے راستہ کچھ ہموار تھا۔ میں نے کہا: "کبیر، میرا ہاتھ پکڑ لو۔" "یہ کیسے ہو سکتا ہے، مہاراج؟ میں چمار ہوں!" یہ کہہ کر وہ اور دور سرک گیا اور مشعل پیچھے کی طرف کر کے کھڑا ہو گیا۔ صرف لنگوٹ باندھے ہوئے، اس کے کالے لمبے ننگے بدن کو دیکھ کر مجھے اور ڈر لگا۔ بکھرے بالوں والے اس دیو قامت شخص میں مجھے چیلے والے بھوت کا روپ نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا: "کبیر... تم کبیر ہی ہو نا؟"

"جی ہاں مہاراج!" اس نے کہا۔

میں نے دوڑ کر اسے چھونے کی کوشش کی۔ وہ مشعل زمین پر پھینک کر بھاگ نکلا۔ میں نے مشعل اٹھائی اور رونے لگا۔

اس نے لوٹ کر کہا، ''آپ آگے آگے چلیے۔'' تب مجھے ایسا لگا کہ میں مشعل کی روشنی کے چھوٹے سے گولے کے بیچ میں کھڑا ہوں ور مجھے جنگل میں چاروں طرف سے عجیب وغریب قسم کے جاندار اور بھوتوں جیسے ہیولے ہاتھ پھیلا پھیلا کر اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ ایسا بھی لگا کہ جہاں پاؤں رکھتا ہوں، وہاں سانپ ہے۔ میں موت پر فتح پانے والے منتر کا جاپ کرتا ہوا آگے چلا۔ اچانک سارا خوف جاتا رہا۔ گھنے اندھیرے کو پار کرنے کے بعد ذرا روشنی دکھائی دی۔ پیڑ پودے بھی نظر آنے لگے۔ تب لگا کہ مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔ جمنا دیدی کو بچانے کا بار میرے اوپر ہے۔ میں لڑکی نہیں ہوں۔ جنیئو بندی کی رسم کے دوران مجھے گائتری منتر کا پاٹھ کرایا جا چکا ہے۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ مجھ میں حوصلہ لوٹ آیا۔ کٹیر اپنے آپ گاتا ہوا میرے پیچھے آ رہا تھا۔

باپی کے پاس آ کر دیکھا تو وہاں اکیلی جمنا دیدی باپی کے اندر ہاتھ ڈالے بیٹھی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر بھی مجھے ڈر نہیں لگا۔ ایسا لگا کہ جمنا دیدی مر گئی ہیں۔ اب کیا کریں؟ دوسرے ہی لمحے سارا جسم کانپ اٹھا۔ میں نے کہا، ''کٹیر، جمنا دیدی کو جگا!'' وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ مجھے یاد آیا کہ اس باپی میں چوٹ کھایا سانپ ہے اور ماں کے کہے کے مطابق سانپ بارہ برس بیت جانے پر بھی دشمن کو نہیں بھولتا۔ میں ایک دم گھبرا اٹھا۔ چاروں طرف مشعل گھمائی اور پھر اپنے پاؤں کی جانب دیکھا۔ ایک لمبی لکڑی جمنا دیدی کو چبھوئی۔

وہ تھر تھر کر کھڑی ہو گئیں اور کہنے لگیں، ''تو یہاں سے چلا جا۔'' میں نے کہا، ''میں نہیں جاؤں گا، آپ میرے ساتھ چلیے۔'' وہ بنا کچھ کہے ہمارے ساتھ چل پڑیں۔ کٹیر کچھ بھی نہیں بولا۔ گاؤں تک ساتھ آ کر اور ہمیں گھر پہنچا کر وہ گیت گنگناتا ہوا چلا گیا۔

جمنا دیدی کچھ دیر تک کچھ نہیں بولیں۔ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ پھر مجھ کو کوسنے لگیں، ''مرنے کیوں نہیں دیا رے؟'' میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کہا، ''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔ چلیے، سوئیں۔'' انھوں نے کہا، ''کہیں جانا ہے مجھے۔ تو میرے ساتھ چل۔'' یہ سن کر مجھے غصہ آیا۔ میں رونے لگا۔ انھوں نے پھر سے کہا، ''تو میرے ساتھ چل۔'' میں نے کہا، ''میں نہیں چلتا، مجھے میری ماں کے پاس بھیج دو۔'' انھوں نے پھر سے کہا، ''جہاں چلنا ہے وہ جگہ اتنی دور نہیں۔ میرے ساتھ چل۔'' میں نے کہا، ''میرے پاؤں میں درد ہو رہا ہے۔ کچھ کیجیے۔'' انھوں نے مجھے گلے سے

Scanned with CamScanner

لگایا اور پھر ناریل کا تیل لگا کر میرے پاؤں کو ملا۔ ''اب تو سو جا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور اکیلی چلنے کو تیار ہو گئیں۔ مجھے وہاں اکیلے رہنے کے خیال سے ڈر لگا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔

گھنے اندھیرے میں سارا گاؤں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ نام کو بھی کوئی آدمی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ راستے میں ہم دونوں ہی چلے جا رہے تھے۔ پاس کے گنے کے کھیت سے گیدڑ کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں کانپ اٹھا۔ جمنا دیدی نے میرا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

''اگر اس اجاڑ گاؤں کو جا رہی ہو تو میں نہیں جاتا۔'' یہ کہہ کر میں پھر رونے لگا تو انھوں نے کہا، ''اپنی قسم، وہاں نہیں جانا ہے۔'' میرے پوچھنے پر کہ پھر کہاں جانا ہے، وہ بولیں، ''ایک کا گھر ہے۔ کسی سے یہ نہیں کہنا کہ ہم وہاں گئے تھے۔ کل میرے پتا جی بھی آ کر پوچھیں تو بھی کہہ دینا، مجھے کچھ معلوم نہیں، اور پھر چپ ہو جانا۔''

میں نے ہامی بھر دی۔ ہم دونوں بہت دور تک بیل گاڑی والے راستے پر چلتے رہے۔ بعد میں ایک پگڈنڈی پکڑ کر ایک ٹیلے سے ترے۔ کھیتوں کے ساتھ ساتھ کافی دور چلنے کے بعد آخر میں ایک گھر میں پہنچے۔

اس گھر میں دیا جل رہا تھا۔ روز سائیکل پر آنے والا اسکول ماسٹر وہیں تھا۔ میں یہ سوچ کر ڈرا کہ وہ پھر سے جمنا دیدی کے کندھے پر ہاتھ رکھے گا۔ اس نے جمنا دیدی کو دیکھ کر غصے سے پوچھا، ''اتنی دیر کیوں ہو گئی؟ میں کتنی دیر سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں۔ اندھیرا ہوتے ہی آنے کو نہیں کہا تھا؟''

جمنا دیدی کچھ نہیں بولیں۔ اس آدمی نے کسی کو آواز لگائی اور جمنا دیدی کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا۔ میں باہر بیٹھ گیا۔

وہ گھر برہمنوں کے گھر جیسا نہیں لگ رہا تھا، اس لیے مجھے ناقابل برداشت لگا۔ اس طرح کے گھر میں میں پہلی بار آیا تھا۔ سنان کے بعد میں شودروں کے لڑکوں سے بات تک نہیں کرتا تھا۔ مجھے وہاں بیٹھے رہنے میں گھبراہٹ سی ہوئی۔ آنگن میں مرغیوں کا دڑبہ تھا۔ گھر کے باہر سنان کا برتن رکھا تھا۔ اسارے میں آ کر پر بوجھ سے تھوک گیا۔ جوڑا باندھے، دھوتی پہنے اور چادر اوڑھے بیٹھے مجھے یہ سوچ کر بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ یہاں کہاں آ گیا ہوں۔ غصہ بھی آیا کہ اس جمنا دیدی کی وجہ سے یہ سب

Scanned with CamScanner

کچھ ہو رہا ہے۔ سوچنے لگا کہ پا جی کو آنے دو، سب کچھ بتا کر سبق سکھاؤں گا۔

کسی نے آنگن میں آکر پربو کو آواز دی۔ بعد میں اُسارے کے پاس آکر اس نے کہا، ’’ارے یہ کیا! بھٹ جی یہاں کیسے؟‘‘

بعد میں دیا لے کر باہر آئے پربو کو میں نے پہچان لیا۔ اس چھوٹی دیوار کی دراڑ میں سے میں نے پہلی بار اسی کو دیکھا تھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا لمبا چوڑا آدمی تھا۔ اس نے صرف ایک جانگیا پہن رکھا تھا۔ گردن کے گرد کچھ باندھ رکھا تھا۔ پربو نے آنگن میں رکھے ایک بڑے مٹکے سے کوئی گھنی بدبو والی چیز انڈیل کر اس آدمی کو دی۔ اندر سے ایک عورت نے ایک پتّے پر کوئی بدبودار چیز لا کر دی۔ کڑو ملیگے سے آگے والے بازار میں کنڑ پردیش سے آنے والی گاڑیوں میں ایسی بدبودار چیزیں آیا کرتی تھیں۔ وہ مچھلی کی بدبو تھی۔ مجھے وہ بدبو بڑی ناقابل برداشت لگی۔ وہ آنگن میں ہی بیٹھ کر کھانے پینے لگا۔ پھر گاتا ہوا آنگن میں جھومنے لگا۔ تب مجھے پتا لگا کہ پربو نے جو چیز انڈیل کر دی تھی وہ شراب تھی۔ آنگن میں بیٹھ کر پینے والا وہ آدمی کہیں میرے اوپر نہ گر جائے، یہ سوچ کر مجھے ڈر لگا۔ ’’بھٹ جی، پوجا والے بھٹ جی... ہی ہی ہی!‘‘ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اندر کی طرف بھاگا۔

وہاں جمنا دیدی ننگی لیٹی ہوئی تھیں۔ صرف پیشاب کرنے کی جگہ ڈھکی ہوئی تھی۔ پیٹ پر گوبر رکھ کر اس پر دیا جلا کر رکھا ہوا تھا۔ میں انھیں دیکھتا ہوا دیر تک کھڑا رہا۔ تبھی پربو نے اس پر دیر سے ایک پرت ڈھک کر کہا، ’’ایسے ہی چھوڑ دیجیے تاکہ کھینچ لے۔‘‘

جمنا دیدی کو گھیر کر پربو، ایک عورت اور وہ ’آدمی‘ بیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو چٹائی پر پھیلا کر، آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی جمنا دیدی کو دیکھ کر مجھے ڈر لگا۔ ان کے جسم پر کپڑا نہ دیکھ کر میں نے اپنی چادر ان کے جسم پر پھیلا دی۔ پربو نے میری طرف دیکھا۔

میں نے روتے ہوئے کہا، ’’جمنا دیدی چلیے، گھر چلیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے... مجھے ڈر لگ رہا ہے... چلیے۔‘‘

لیکن جمنا دیدی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ ’آدمی‘ مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا۔ اس عورت نے پیک بھرے منھ سے پربو سے کونکنی زبان میں کچھ کہا اور پھر جا کر پیک تھوک آئی۔ اس کے

Scanned with CamScanner

ماتھے پر کم کم[11] نہیں تھا، لیکن سر پر گھنے بال بکھرے تھے۔

پربو اس 'آدمی' کو باہر لے گیا۔ میں بھی باہر آ گیا۔ پربو کہہ رہا تھا، "میں سب سنبھالے لیتا ہوں۔ اب آپ جائیے۔"

اس 'آدمی' نے جیب سے پیسے نکال کر اسے دیتے ہوئے اس کے کان میں دھیرے سے کہا، "مجھے ابھی سائیکل سے کڑوملیشے چلے جانا ہے۔ وہاں سے آگے بس پکڑ کر چلا جاؤں گا۔" اس کے منھ سے کڑوملیشے کا لفظ نکلتے ہی مجھ میں اپنے گھر جانے کی خواہش نے زور کیا اور مجھے رونا آ گیا۔

بعد میں جب وہ 'آدمی' سائیکل لے کر چل پڑا تو اس نے پربو کے کان میں کہا، "یہ سب باتیں تم تک ہی رہیں۔"

"میں بھی چلوں تمھارے ساتھ؟" میں نے پوچھا، لیکن اس نے میری بات کی طرف ذرا بھی دھیان نہ دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

آنگن میں بیٹھ کر پینے والا آدمی پھر سے ہنسنے اور گانے لگا۔ اندر جمنا دیدی کراہ رہی تھیں۔ "اوہو، بھٹ جی!" کہتے ہوئے وہ چیخنے لگا۔ پربو نے اسے ڈانٹا۔ مجھے روتے دیکھ کر مجھ سے چپ رہنے کو کہا۔ اندر کراہتی جمنا دیدی سے میں نے باہر سے ہی چیخ کر کہا، "جمنا دیدی، میں جانا چاہتا ہوں۔"

پربو نے مجھے دھمکایا۔ تبھی آنگن میں ایک اور آواز سنائی دی۔ وہ آواز کشیر کی تھی۔ وہ آواز سن کر میری جان میں جان آئی۔ میں نے زور سے آواز لگائی، "کشیر!" پربو نے ہاتھ اٹھا کر مجھے اس طرح دھمکایا جیسے مارے گا۔ میں چپ چاپ بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد کشیر نے اپنے آپ گانا اور بکنا شروع کر دیا۔ میں نے آواز دی، "اے کشیر!"

کشیر اٹھ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا، "ذرا تھوڑی اور ڈالیے!" تب میں نے کہا، "اے کشیر، میں ہوں۔"

یہ سن کر اس نے کہا، "کون؟" پھر لڑکھڑاتا ہوا باہر چلا گیا۔ کشیر نے بھی ایسا کیا، یہ سوچ کر مجھے اور تکلیف ہوئی۔ کئی بار بتانے پر بھی وہ مجھے پہچان نہ سکا۔

---

11 کم کم ہلدی اور چونے کے سفوف سے بنائی جانے والی بندی، ٹیکا، تلک۔

تبھی اندر سے جنا دیدی کی "ہائے ہائے" سنائی دی۔ میں باہر سے چیخا: "جنا دیدی۔۔۔ جنا دیدی، میں یہیں ہوں۔۔۔ آؤ چلیں۔" پھر رونے لگا۔ پر بو باہر آیا اور بولا: "سو جا یہیں، صبح چلے جانا۔" پھر اس نے کٹورا لا کر میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا: "لے، پی لے۔" میں نے کہا: "نہیں۔" "ارے یہ شراب نہیں، دودھ ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں روتا ہوا وہیں بیٹھا رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو صبح ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا وقت ہے، صبح ہوئے کتنی دیر ہو گئی ہے، میں کہاں ہوں، یہاں کیسے آ گیا ہوں۔ میں نے واقعات کی ترتیب کو یاد کرنے کی کوشش کی۔

جنیؤ بندی کے بعد ایک دن کرؤ ملیکے سے ایک بیل گاڑی میں ماں صبح کے وقت اُڈوپ جی کے گھر منتر جاپ سیکھنے کے لیے چھوڑنے آئی تھی۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر، گاڑی میں بیٹھ کر یہاں آ گیا تھا، یہ سوچ کر مجھے رونا آنے لگا۔ جہاں دیکھو وہاں مرے مرغیوں، شراب کی کھٹی بدبو آ رہی تھی۔ اسارے میں آنکھیں ملتا ہوا میری ہی عمر کا ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اس کے بال انگریزی کاٹ کے تھے۔ اس نے ایک گندی سی قمیض اور جانگیا پہن رکھا تھا۔ مجھے چادر اوڑھے اور جوڑا باندھے بیٹھا دیکھ کر اس نے مذاق کیا: "واہ ری چوٹی، واہ ری دھوتی!"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ سر نیچا کر کے بیٹھ گیا۔

پچھلی رات جس عورت کو میں نے دیکھا تھا اس نے اس لڑکے سے کونکنی زبان میں کچھ کہا۔ وہ لڑکا آنگن میں اتر کر ایک مرغی کو پکڑنے لگا۔ مرغی کونک کونک کرتی ہوئی ادھر اُدھر بھاگنے لگی۔ پنکھ پھڑ پھڑاتی ہوئی وہ ادھر اُدھر بچ رہی تھی۔ آخر میں اس نے اسے پکڑ ہی لیا اور اسے اندر لے گیا۔ کچھ دیر بعد بڑے زوروں سے پنکھ پھڑ پھڑانے کی آواز آئی، جیسے اسے مارا جا رہا ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ میں بری طرح سے کانپ اٹھا۔

میں نے ایک بار پھر زور سے پکارا: "جنا دیدی، جنا دیدی، اب گھر چلو۔" پھر وہیں چپ چاپ بیٹھ گیا۔

تبھی جنا دیدی دیوار پکڑ کر ٹٹولتی ہوئی باہر آئیں۔ ان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں جا کر ان سے

Scanned with CamScanner

لپٹ گیا۔ وہ رونے لگیں۔ پربو نے ان سے کہا، "اور تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ذرا ستا کر جانا۔" لیکن جمنا دیدی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا، "آؤ چلیں۔"

ٹھیک اسی وقت وہاں لمبا سا چوغہ پہنے ایک داڑھی والا آدمی آیا۔ اس سے پربو نے کوٹھی میں کچھ کہا اور اسے اندر لے گیا۔ ہم دونوں دھیرے سے آنگن میں اترے۔ وہ آدمی اندر سے چتوں میں ایک لال لال لوتھڑا سا باندھ کر باہر آیا۔ چتوں سے باہر تک دکھائی دینے والے لال لوتھڑے کو دیکھ کر مجھے اور جمنا دیدی کو ابکائی سی آنے لگی۔ دونوں نے منھ پھیر لیا۔

باہر آ کر وہ جمنا دیدی کے پاس آیا اور ان سے ٹھہرنے کے لیے کہا۔ پھر صاف آواز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا، "بھگوان پاپیوں کی رکشا کرتا ہے۔ آپ کو تو ڈرنا نہیں چاہیے۔"

جمنا دیدی ڈر کے مارے کانپنے لگیں۔ وہ ہمارے اور قریب آ گیا اور کہنے لگا، "ڈریے نہیں، آپ کے گاؤں کے لوگ آپ کو باہر نکال دیں گے لیکن آپ ہمارے خداوند پر بھروسا کریں، وہ آپ کی رکشا کرے گا۔ میرے ساتھ گرجا گھر چلیے۔ وہاں ہم آپ کی رکشا کریں گے۔"

کہیں جمنا دیدی اس کے ساتھ نہ چل پڑیں، یہ سوچ کر میں پریشان ہو گیا۔ لیکن جمنا دیدی نے اس داڑھی والے کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھا، پھر سر پر پورا پلو کھینچ کر، بغیر کچھ کہے وہ میرے ساتھ چلنے لگیں۔

اس نے پھر کہا، "آپ کے پتھر کے دیوتا کے پاس پتھر کا دل ہے لیکن ہمارے بھگوان مسیح اپنے پر بھروسا کرنے والوں کی رکشا کرتے ہیں۔ میری بات مان کر گرجا گھر چلیے۔"

جمنا دیدی اور میں تیزی سے چل پڑے۔ پربو اور وہ آدمی کوٹھی میں باتیں کر رہے تھے، جو دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میں پھر سے گھر جا رہا ہوں۔ میرا جوش بڑھ گیا۔ جمنا دیدی ہانپتی کراہتی چل رہی تھیں۔ ان کی میلی لال ساڑھی پر خون دکھائی دیا تو میں پھر گھبرایا۔ میں نے کہا، "جمنا دیدی، آپ کی ساڑھی پر پیچھے خون لگا ہے۔"

وہ وہیں ڈھے گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے انھیں آگے بڑھ کر پکڑ لیا۔ انھوں نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ میں نے کہا، "اٹھیے، گھر چلیں۔" انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور کہا،

Scanned with CamScanner

''مجھ سے نہیں ہوگا، بھیا! تو اکیلا چلا جا۔''

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''اٹھیے۔'' میں نے ضد کی۔

انھوں نے کہا: ''مجھے پیاس لگ رہی ہے۔ مجھ سے نہیں ہوگا، تو چلا جا۔''

میں نے کہا: ''آپ کے بغیر میں نہیں جاؤں گا۔''

انھوں نے پوچھا: ''گھر اب کتنا دور ہے؟''

تبھی مجھے دور سے گاؤں کے برہمنوں کے ساتھ شاستری اور رنگا آتے ہوئے دکھائی دیے۔

میں نے روتے ہوئے کہا، ''جمنا دیدی، وہ سب آرہے ہیں۔ جلدی سے اٹھو۔ میں آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا، جمنا دیدی۔'' لیکن وہ نہیں اٹھیں، دھیرے سے سانس لے کر بولیں، ''آنے دو انھیں، میں اٹھ کر نہیں چل سکتی۔ جو چاہے آ کر دیکھ لے۔ میں یہیں...''

میں نے جمنا دیدی کے جسم کو ہلایا اور ضد کرتے ہوئے کہنے لگا، ''آپ کو چلنا ہی پڑے گا۔''

انھوں نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

وہ سب آ کر ہمیں گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ شاستری نے مجھے الگ کھینچا۔ میں نے اسے مارا، اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹ کھایا، روتے ہوئے جمنا دیدی کو آواز دی۔ انھوں نے اس طرف نہیں دیکھا۔ پتا نہیں ان کا دھیان کس طرف تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور وہ ان کے گالوں پر ڈھلکنے لگے تھے۔

پتا جی آئے اور مجھے گھر لے گئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ گھر پہنچنے پر مجھے دوسرا جنیو پہنایا گیا اور پنچ گویہ[12] سے پاک کیا گیا۔ ماں کے پوچھنے پر میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا۔ ماں کے منھ سے نکلا: ''ستیاناسی، رنڈی، حاملہ ہی کیوں ہوئی؟'' مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوئی کہ ماں حاملہ ہو سکتی ہے تو جمنا دیدی کے حاملہ ہونے پر اتنا بکھیڑا کیوں؟ کچھ دنوں میں خبر آئی کہ اڈوپ جی نے جمنا دیدی کے زندہ رہتے ہوئے بھی ان کا شرادھ[13] کر دیا ہے اور انھیں ذات سے باہر کر دیا ہے۔

---

[12] پنچ گویہ گائے کی پانچ چیزیں، دودھ، دہی، گھی، گوبر اور پیشاب۔

Scanned with CamScanner

پتا جی اور ماں اُڈوپ جی کی تعریف کرتے ہوئے کہنے لگے: ''اُڈوپ جی کتنے اچھے ہیں۔''
پھر جمنا دیدی کو کوستے ہوئے کہا: ''بدچلن لڑکی!''

کچھ دنوں بعد ہمارے گھر اُڈوپ جی کے بیاہ کے دھان کے دانے[14] آئے۔ بعد میں پتا جی سے سنا کہ بوڑھے اُڈوپ جی نے ایک چھوٹی عمر کی لڑکی کے ساتھ بیاہ کے چبوترے پر بیٹھ کر کیسے آرتی اتروائی۔ یہ سن کر میرے منھ سے نکلا: ''چھی چھی!'' پتا جی بولے: ''ایسا کہتا ہے رے!'' ماں بولیں، ''جب وہ بدچلن نکل گئی تو پھر؟ اُڈوپ جی کو اپنا گھر چلانے، روٹی پکانے کے لیے کوئی تو چاہیے نا۔ کچھ بھی ہو، زمانہ بہت بگڑ گیا ہے۔''

❁ ❁

---

[13] گمت شرادھ: قبل از مرگ ادا کی جانے والی شرادھ کی رسم۔ شرادھ کی رسم عموماً خاندان کے کسی فرد کی موت کے بعد اُس کی بخشش کی غرض سے ادا کی جاتی ہے۔ لیکن اگر خاندان کا کوئی فرد خصوصاً عورت کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کے گناہوں کی تلافی کے لیے اس کی زندگی ہی میں شرادھ کی رسم ادا کر دی جاتی ہے اور اسے جیتے جی مردہ تصور کرتے ہوئے قطع تعلق کر لیا جاتا ہے۔

[14] دھان کے دانے: شادی کی تقریب کی دعوت دینے کے بے کم کم میں رنگے چاول کے دانے بھیجے جاتے ہیں۔

اہم کتابیں

تہذیبی نرگسیت
(پاکستان میں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہا پسندی)
مبارک حیدر
قیمت: 150 روپے

معاصرے کا روزنامچہ
(بی بی سی کے لیے لکھے گئے کالموں کا انتخاب)
وجاہت مسعود
قیمت: 300 روپے

سندھ کی عورت
سپنے سے سچ تک
عطیہ داؤد
قیمت: 100 روپے

پاکستان جاگیرداری نظام کے شکنجے میں
محمد نعیم اللہ
قیمت: 300 روپے

ادب کی نسائی رد تشکیل
(مضامین کا انتخاب)
ادارت، فہمیدہ ریاض
قیمت: 150 روپے

شعر شور انگیز
(غزلیات میر کا انتخاب اور مفصل مطالعہ)
شمس الرحمٰن فاروقی
چار جلدوں کے سیٹ کی قیمت: 1350 روپے

لسانیات اور تنقید
ناصر عباس نیر
قیمت: 350 روپے

تنقیدی افکار
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 250 روپے

دھنی بخش کے بیٹے
حسن منظر
قیمت: 600 روپے

کئی چاند تھے سر آسماں
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت: 600 روپے

Scanned with CamScanner

کچھ کھویا، کچھ پایا

رالف رسل کی خودنوشت سوانح کا دوسرا حصہ

1945 سے 1958 تک

(LOSSES, GAINS)

Part II

of the autobiography of Ralph Russell

1945-1958

مصنف:

رالف رسل

(بہ تعاون میرین مولٹینو)

مترجم:

ارجمند آرا

Scanned with CamScanner

13

شادی اور ازدواجی زندگی

مجھے یاد نہیں کہ میں نے شادی کرنے کا باقاعدہ فیصلہ کب کیا تھا لیکن 1947 کے اواخر تک یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ میں اور سولی شادی کرنے والے ہیں۔ میں نے خود کو اس کی تیاریوں میں مصروف پایا۔ شادی مارچ 1948 میں ہیمر اسمتھ (Hammersmith) ٹاؤن ہال کے رجسٹری آفس میں ہوئی تھی۔ میرے نزدیک یہ تقریب ایک ایسے وصل کی غیر اہم سی بیوروکریٹک سند تھی جس کا فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ میں شادی کے روایتی ناشتے جیسی رسموں میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے نہیں لگتا کہ سولی کو بھی اس میں کوئی خاص دلچسپی تھی۔ لیکن مسز مزگروف کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ ضروری ہے، اور ظاہر ہے کہ ان کی خواہش کا احترام نہ کرنا ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی۔

یوں ان تمام رشتے داروں اور دوستوں کی فہرستیں تیار کی گئیں جن کو مدعو کرنا تھا اور مزگرو وری میں ان کی آمد اور طعام کی تیاریاں کی گئیں۔ میری ماں، سولی اور مسز مزگروف سے ملاقات کے لیے آئیں۔ ریکس نے کہا کہ وہ وقت پر پہنچ جائے گا۔ نوئیل لندن میں رہتا تھا اس نے کہلوایا کہ وہ اور اس کی بیوی شرکت نہ کر سکیں گے، لیکن اس نے تجویز رکھی کہ بعد میں ہم لوگ ان کے ہاں چائے پر آئیں۔ یہ تجویز میرے لیے بھی مناسب تھی - کیونکہ نوئیل اور اس کی بیوی اعلیٰ متوسط طبقے کا طرز زندگی اختیار کر چکے تھے، جس کے ساتھ نخوت اور لوازمات کا ہونا لازمی ہے۔ مجھے نہیں لگتا تھا کہ سولی کے بارے میں ان کا تاثر مثبت ہوگا، یا مسز مزگروف کی مہمان نوازی سے وہ مطمئن ہوں گے۔

جب تک میں کمانے کے قابل نہ ہو جاتا اس وقت تک ہمارا کسی الگ رہائش کے اخراجات برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا، چنانچہ یہ طے ہوا کہ میں اور سولی ایک مشترکہ کمرے میں

Scanned with CamScanner

رہیں گے، اور چونکہ میری میز اس کمرے میں نہیں آسکتی تھی اس لیے میرا کمرہ بھی بطور اسٹڈی ہمارے پاس رہے گا۔ سارے کمروں کو پھر سے آراستہ کیا گیا، چنانچہ اس پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ازدواجی زندگی میں داخل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ کمروں کا فرش وفروش بھی پھر سے ضرور بدلا جائے۔ لیکن مولی اور مسز مزگروف کے خیالات اس سلسلے میں بالکل واضح تھے، اور یہ بات بھی صاف تھی کہ انھیں آراستہ کرانے کی ذمے داری میری تھی۔ جب ایسا تھا تو مجھے تیار ہونا ہی تھا، چنانچہ فرنیچر کی دکانوں کے میں نے ایک دو پھیرے بھی لگائے ۔ ایک موقعے پر جو ورجوائس کلیمنٹ میرے ساتھ تھے جنھوں نے اپنی شادی شدہ زندگی کے پرانے تجربے کی بنیاد پر ہمیں مشورے دینے کی ذمے داری سنبھال رکھی تھی۔ اس پوری صورت حال سے بھی میں نے عبرت لی۔ سب کمیونسٹوں کی مشترکہ اقدار کے بارے میں میرے تصور بڑی سادہ لوحی پر مبنی تھے ۔ مثال کے طور پر میرا یہ خیال تھا کہ غیرضروری چیزوں پر پیسہ خرچ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن ایک بار جب میں کپڑوں کی سیکنڈ ہینڈ الماری خرید لایا جو میرے خیال میں ہمارے لیے بالکل مناسب تھی، تو مجھے واپس بھیجا گیا کہ نئی خرید کے لاؤ جو خوش نما اور مہنگی ہو۔ میں نے اس کی فلسفیانہ توجیہہ کرنی چاہی۔ لیکن یہ مولی کی خواہش تھی، اور گو کہ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر وہ اس کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے، اور زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ ایسا نہ کرتی، لیکن بات کا بتنگڑ بنانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

شادی کی تاریخ جیسے جیسے قریب آتی گئی، گھر میں گہما گہمی بڑھ گئی۔ پردے اتار کر دھلائی کے لیے بھیج دیے گئے۔ سلائی مشین مرمت کے لیے لے جائی گئی۔ میری پتلونیں رنگنے کے لیے بھیجی گئیں ۔ نئی خریدنے کا کوئی سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ شادی سے چند ہفتے پہلے میں، مولی اور مسز مزگروف کو یونٹی تھیٹر لے گیا جہاں Winkles and Champagne کا شو چل رہا تھا۔ وہاں پرانے میوزک ہال میں گیتوں کی ساتھ ساتھ گانے والی محفل بھی چل رہی تھی۔ اس میں وہ گیت بھی شامل تھا جس کو ہم سب Waiting at the church کے نام سے جانتے تھے۔ یہ گیت ایسی دلہن کے بارے میں تھا جس کا ہونے والا دولہا شادی کے لیے نہیں آتا:

All at once he sent me round a note/
Here's the very note/ This is what he

Scanned with CamScanner

wrote/ Can't get away to marry you today/
My wife won't let me!

(اچانک ہی اس نے میرے پاس ایک رقعہ بھیجا/ یہ ہے وہ رقعہ/
اس نے لکھا ہے/ میں تم سے آج شادی کرنے نہیں آ سکتا۔
میری بیوی مجھے آنے نہیں دے گی:)

لیکن ہمارے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔ میں اور مولی دونوں ہی شادی کے لیے پہنچ گئے اور شادی کی رسم کسی غیر معمولی واقعے کے بغیر پوری ہوگئی۔ میں کھانے کے دوران صرف اس وقت پریشان ہوگیا جب ہنی مون پر جانے کا وقت آیا۔ ہمیں ہیسٹنگز (Hastings) جانا تھا اور میں یہ مان کر چل رہا تھا کہ وہاں پہنچنے کے لیے ہم وہی طریقہ اختیار کریں گے جو عموماً کرتے ہیں، یعنی ہم سڑک تک جائیں گے وہاں سے گولڈ ہاک روڈ (Goldhaik Road) ٹیوب اسٹیشن کے لیے بس پکڑیں گے، اور وہاں سے وکٹوریہ پہنچ کر ہیسٹنگز کے لیے ٹرین لے لیں گے میرے اس منصوبے کو خاصا حیران کن سمجھا گیا اور مجھے سخت الفاظ میں بتا دیا گیا کہ وکٹوریہ کے لیے ٹیکسی کرنی ہوگی۔

ہم نے اپنا ہنی مون ہیسٹنگز کے نیدر وڈ (Netherwood) میں منایا۔ میں اس علاقے سے اس وقت سے واقف تھا جب میں نے ایک پارٹی اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ اپنے ہنی مون کے بارے میں ایک بات جو مجھے یاد ہے، یہ ہے کہ ایک روز صبح کے وقت میں نے نوئیل کی خواہر نسبتی، برتھا (Bertha) کو دیکھا جو دوسرے درجنوں لوگوں کے ساتھ ایک دائرے میں رقص کر رہی تھی۔ بیٹرسبیز (Battersbys) یعنی مارگوٹ اور برتھا کے خاندان کے لوگ ایک تنظیم FPSI-Fedration of Progressive Societies and Individuals کے یا تو رکن تھے یا ہمدرد۔ اس تنظیم سے میرا اور نیکس کا واسطہ جنگ سے پہلے پڑا تھا اور ہم اسے تضحیک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک غیر موزوں سے شخص پروفیسر سی ای ایم جوڈ (C.E.M. JOAD) اس کے صدر تھے۔ ان کے، اور ان کے شاگردوں کے نزدیک پروگریسو ایک بے حد مبہم لفظ تھا اور ہر وہ شخص یا تنظیم ان کی تعبیر کے دائرے سے باہر تھا جو واقعی ترقی پسند ہو اور جسے دنیا بھی ترقی پسند مانتی ہو۔ بنیادی بات جس سے ان لوگوں کو سروکار تھا، یہ تھی کہ یہ لوگ، یعنی اس تنظیم کے تمام اراکین، ایک قسم

کے اشرافیہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اسی تنظیم کے لوگ تھے جو لان میں رقص میں مشغول تھے۔ اکثر اوقات میں برتھا سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا، خصوصاً اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا وہ مولی کے ساتھ سرپرستانہ رویہ اختیار کرے۔ میں محسوس کرتا تھا کہ جب بھی اسے پتا چلے گا کہ مولی ایک معمولی پڑھی لکھی مزدور طبقے کی لڑکی ہے اور میں نے، یعنی کیمبرج گریجویٹ نے، اس سے شادی کی ہے تو ہمارے تئیں اس کی ناپسندیدگی فوراً ظاہر ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑے خلوص سے ملی اور اس سے یہ ملاقات بغیر کسی واقعے کے گزر گئی۔

ہم مسز مزگروف کے ہاں واپس لوٹ آئے۔ وہی گھر، وہی معمول۔ مولی کام پر جاتی اور میں سوالیس۔ اس کی ماں ہمارے لیے اور دوسرے کرایہ داروں کے لیے گھر سنبھالتی۔ اپنی شادی کے ابتدائی مہینوں میں مجھے ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، اور میرے خیال میں ایسی صورت حال نئے شادی شدہ جوڑوں کو پیش بھی آتی ہے۔ خیر، میں نے کوشش کی کہ اس بارے میں زیادہ غور و فکر نہ کروں بلکہ ان پہلوؤں کی جانب توجہ دوں، جن کے سبب ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکتے ہیں۔

میری اور مولی کی شادی کے بعد ایک طرح سے ہماری زندگی میں اتنی تبدیلیاں نہیں آئیں جتنی عموماً دوسرے لوگوں کی زندگی میں آتی ہیں— ہم اسی گھر میں کوئی ڈیڑھ برس سے رہ رہے تھے اس لیے کوئی نیا اور حیران کن احساس نہیں ہوا۔ پھر بھی ایسے بہت سے موڑ آئے جو دو مختلف قسم کا پس منظر رکھنے والے لوگوں کی زندگی میں آسکتے ہیں۔

پہلا سوال تو خاندانوں کا ہی تھا۔ چھٹیوں کے ایک موقعے پر ہم لوگ چند دن ریکس اور فراڈ کے ساتھ گزارنے کی غرض سے ہوم گئے۔ ریکس چھٹیوں میں ڈرہم (Durham) سے ہوم آیا ہوا تھا جہاں وہ تاریخ میں ڈگری حاصل کرنے کے لیے زیرِ تعلیم تھا۔ فراڈ بچوں کے ساتھ ہوم ہی میں رہ رہی تھی۔ ان کا دوسرا بچہ، ایڈرین (Adrian) پیدا ہو چکا تھا۔ ہمارا یہ سفر بخیر و خوبی گزرا، حالانکہ مولی کسی بھی اعتبار سے دیہاتی لڑکی نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے سائیکل چلانا سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ملی کیونکہ وہ سامنے سے آنے والے سے سائیکل ٹکرا دیتی تھی۔ اس صورت حال سے میں بڑا محظوظ ہوا کیونکہ یہی وصف ٹالسٹائے کا بھی تھا (اس کے بارے میں کہیں پڑھا تھا، لیکن

اب یہ یاد نہیں کہ کہاں)۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ماں اور نانس مولی کے ساتھ کس طرح پیش آئیں گی۔ ماں کی نگاہ بڑی تیز تھی اور طرز و مزاج کی حس شائستہ — میں ان کی باتوں سے خصوصاً ان کی غیر موجودگی میں زیادہ لطف اٹھا سکتا تھا، کیونکہ آمنے سامنے تو ان کی ہر بات کو دہرانے کی عادت سے مجھے کوفت ہوتی تھی۔ ایسٹ اینگلیا (East Anglia) میں دوستوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے کے بعد کا ان کا ایک خط اس کی اچھی مثال فراہم کرتا ہے

> یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میں چھٹیاں گزارنے گئی تھی یا پھر امپروومنٹ کورس کرنے۔ اینگس (Angas) کو سمفنی کنسرٹ میں بہت دلچسپی ہے۔ مجھے بھی یہ پسند تو ہیں لیکن وقفے وقفے سے، ہر شام نہیں۔ میں اعلیٰ تہذیب سے اتنا تعلق نہیں رکھتی جس کو کافی یا مناسب کہا جاسکے۔ اور نیلی کولس (Nelly Colls) نے مجھے بہت ہی اصلاحی قسم کا ادب پڑھنے کو دیا، جس سے مجھے خاصی کوفت ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ اصلاح کی بہت سی گنجائشیں ہمیشہ موجود رہتی ہیں لیکن کہہ نہیں سکتی کہ مجھے یہ کوئی خاص اپیل کرتا ہے۔ چنانچہ میں بازار گئی اور ایک سنسنی خیز ناول خرید لائی۔ ندی کے کنارے دھوپ میں بیٹھ کر میں یہ اعصاب جھنجھوڑنے والا ناول پڑھتی تھی۔ بہت سے دوستوں سے میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ سب شائستہ لوگ تھے لیکن بیشتر نیم جان تھے۔ ان میں سے ایک اسی برس سے زیادہ عمر کی ایک بوڑھی عورت تھی۔ صرف وہی تھی جو زندہ دلی کے ساتھ بے تکی باتیں خاصی بے ساختگی سے کرتی تھی۔ ہم دونوں کی خوب نبھتی تھی لیکن شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے مناسب نہیں تھے۔

لیکن ماں اور نانس بھی طبقاتی نخوت کی اچھی خاصی شکار تھیں (برسوں پہلے کی بات ہے کہ جب نانس کو پتا چلا تھا کہ میری نے کسی اور سے شادی کر لی ہے، تو اس کا ردعمل کچھ یوں تھا: "شکر ہے، اس عورت نے ہمارے کسی لڑکے پر ہاتھ نہیں ڈالا")۔ لگتا تھا کہ حسن اتفاق سے دونوں نے ہی مولی کو قبول کر لیا۔ فاصلے کی وجہ سے ماں اور مولی کی ملاقاتیں خاصی کم ہوتی تھیں، لیکن وہ دونوں جب بھی ملتیں تو فطری طور پر جلد ہی عورتوں والی باتیں کرنے لگتیں۔ بعد میں مولی نے مجھے کئی ایسی باتیں

Scanned with CamScanner

بتائیں جو ماں نے اس سے کہی تھیں لیکن مجھے کبھی نہیں بتائی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ جب ان کی شادی ہوئی تھی تو ان کو ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ بچے کہاں سے آتے ہیں۔ (ان کے الفاظ تھے، ''میں سوچتی تھی کہ وہ خسرہ کی بیماری کی طرح ہمیں لگ جاتے ہیں۔ لیکن یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ وہ بیماری کی طرح نہیں لگتے۔'')

نوئیل اور اس کی بیوی مارگوٹ الگ ہی قسم کے لوگ تھے۔ ہم ان سے ایک بار بے معنی سی ملاقات کر چکے تھے۔ اس ملاقات کے دوران انھوں نے مولی کی تہذیبی حیثیت کے تئیں اپنی ناپسندیدگی چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ [illegible] انداز پر مولی نے بھی کوئی رواداری نہیں برتی اور اپنا ردعمل ظاہر کر دیا تھا۔ جب مشروبات پیش کیے گئے تو مارگوٹ نے جن (gin) پینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ محنت کشوں کے طبقوں میں جن کا تصور ان حلقوں سے مختلف ہے جن میں مارگوٹ اور نوئیل کا اٹھنا بیٹھنا تھا کھانے سے پہلے کے ایک لطیف ٹانک کے بجائے جن، غریب بستیوں میں زندگی کی سخت کوشیوں کو نشے سے وحشت ہو کر بھلانے والے مشروب کی علامت تھی، اس روپے کو برباد کرنے کی علامت جس کو بچوں کی غذا پر خرچ کیا جانا چاہیے۔ مولی فوراً بول پڑی: ''تم جن دوگی! ستیاناس!'' اور مارگوٹ کی برہمی پر وہ ہنس پڑی۔

اس واقعے کے بعد دونوں نے یہ بات واضح کر دی کہ آئندہ ملنے میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے وہ الفاظ تو یاد نہیں جن میں نوئیل نے یہ بات مجھ تک پہنچائی البتہ اس نے یہ اشارہ ضرور کر دیا کہ آئندہ بھی اسے مجھ سے مل کر خوشی ہوگی لیکن میں اس کے ہاں اکیلا ہی آؤں۔ حالانکہ سیاسی سطح پر ہم میں کچھ بھی مشترک نہ تھا اور میں اس کے تکبر و نخوت کو سخت ناپسند کرتا تھا، پھر بھی میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے رشتے اس کے ساتھ پوری طرح منقطع ہو جائیں۔ چنانچہ کبھی کبھار میں اس سے ملنے جاتا رہا اور مولی کو بھی میرے تنہا جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ باہمی اختلافات کے باوجود ہم ذاتی معاملات پر کھل کر بات کر سکتے ہیں، اور اس صورتِ حال نے ہم میں ذی شعور دوستی کی بنیاد فراہم کی۔

کیمبرج کے اور آکسفرڈ کے دنوں کے میرے کمیونسٹ دوستوں میں حقانی تکبر نام کو بھی نہ تھا۔ اس کے برخلاف، اگر ان میں کچھ تھا تو محنت کش طبقے کے لیے تنظیم کا جذبہ، جس سے ہم (لفظ [illegible]

Scanned with CamScanner

پر) انقلاب کا ہراول دستہ بننے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن ان میں ایک انتہائی مضبوط، ممکنہ فرق اس بات کا تھا کہ وہ لوگ مطالعہ کرتے اور اس پر بحث کرتے تھے، سیاسی تبدیلیوں پر نظر رکھتے اور ایک بھرپور دانشورانہ زندگی جیتے تھے۔ جب بھی ہم یکجا ہوتے، گفتگو کا رخ فطری طور پر ان باتوں کی طرف مڑ جاتا، اور میں یہ سوچ کر مضطرب ہو جاتا کہ اس صورتِ حال میں مولی خود کو اجنبی محسوس کرے گی۔ لیکن یہ صورت بھی بخیر و خوبی گزر گئی۔ انھوں نے مولی کو ویسے ہی قبول کیا جیسی وہ تھی، اور مولی نے بھی انھیں اسی طرح قبول کیا جیسے وہ تھے۔ لوگوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کی شدید حس مولی میں تھی، اور میرے دوستوں سے، جنھیں وہ 'اِنٹلکچول فرینڈز' کہتی تھی، وہ کچھ خاص مرعوب نہ تھی۔ اپنی ماں کی طرح، اور غالباً اس وقت کے بیشتر مزدور طبقے کے لوگوں کی طرح، وہ بھی یہ سمجھتی تھی کہ دانشور طبقے کے لوگ خاصے فضول ہوتے ہیں جو عملاً کچھ نہیں کر سکتے اور ان میں عمومی سوجھ بوجھ بالکل نہیں ہوتی۔ لیکن ان کے ساتھ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے اسے مسرت ہوتی تھی۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کی شادی ہو چکی تھی اور کئی کے پاس بچے بھی تھے، یوں سیاست کے علاوہ اور بھی چیزیں ان سے بات کرنے کے لیے تھیں۔

ان میں سے ایک دو 'اوّلیں ملاقاتیں' قابلِ ذکر ہیں۔ میری اور ریکس کی وُوڈفرڈ کے دنوں کی ایک قریبی دوست مارگریٹ ہورٹن تھی۔ وہ عمر میں ہم سے کئی برس بڑی تھی بلکہ جب میں اور ریکس اسکول میں پڑھتے تھے تب اس کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اور اس کا آرٹسٹ شوہر رون (Ron) پارٹی کے بانی اراکین میں سے تھے اور ہم نو آمدہ اراکین ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ جنگ سے پہلے اس کا گھر ہی وہ مقام تھا جہاں ہم میں سے کچھ لوگ وقفے وقفے سے ملتے تھے اور ان کے باغیچے میں بیٹھ کر ادب اور سیاست پر بات کرتے تھے۔ وہ اور رون اب ہوف (Hove) میں رہتے تھے لیکن وہ کبھی کبھی لندن آتی رہتی تھی۔ مولی کی اور اس کی شخصیت اور زیادہ متضاد نہ ہو سکتی تھیں۔ مارگریٹ ایسی عورت تھی جس کے نزدیک دانشورانہ دلچسپیاں سب سے اہم تھیں — لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک پرخلوص، صاف گو عورت تھی۔ میری شادی کی خبر سے اسے خوشی ہوئی اور میری نئی نویلی بیوی سے مل کر اسے اچھا لگا۔ ہماری شادی کے کچھ ہی دنوں بعد مارگریٹ نے ہمارے لیے لنچ کا اور ایک شو کا اہتمام کیا اور ہمیں ہوف آنے کی دعوت دی۔

Scanned with CamScanner

ایک اور ملاقات فریڈی اور جان ڈکرس کے ساتھ ہوئی۔ یہ کیمبرج کے میرے پرانے ساتھی تھے جن کے ساتھ میں نے ہندستان سے واپسی کے بعد، پارٹی کی ماس ممبرشپ کے متعلق پالیسی کے بارے میں بات کی تھی۔ جان اب ٹریڈ یونین کا عہدیدار تھا جس کے بارے میں فریڈی نے لکھا کہ، "وچ ہنٹرز (witch hunters) سے مقابلہ کرنے میں بری طرح مصروف ہے (وچ ہنٹرز سے مراد لیبر پارٹی کے وہ لوگ تھے جو سرد جنگ کے روز افزوں ماحول میں معروف و مقبول کمیونسٹوں اور ٹریڈ یونین والوں کو تلاش کر کے انھیں لیڈرشپ سے باہر کر دینا چاہتے تھے)۔ فریڈی آج کل گھر پر ہی رہتی تھی اور اپنی نوزائیدہ بچی سیلی (Sally) کی پرورش کر رہی تھی۔ ایک ایسی عورت کے لیے جس کی دونوں ٹانگیں مصنوعی ہوں، یہ واقعی امتحان کا کام تھا۔ انھوں نے دعوت دی کہ میں مولی کو لے کر ان سے ملنے ان کے گھر چزِک (Chiswick) آؤں۔ دعوت آٹھ بجے کے لیے دی گئی تھی جو ورکرز کے مطابق ڈنر کی دعوت تھی۔ ایسی صورت حال سے ہمارا پہلے واسطہ نہیں پڑا تھا کیونکہ مزکر ووری میں ہم لوگ شام کا کھانا جلدی کھا لیتے تھے۔ ہم کھانا کھا چکے تھے اور جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک اور ڈنر پر ہمارا انتظار ہو رہا ہے۔ اس صورت حال پر ہم سب خوب ہنسے۔

ایک بات جس میں میری اور مولی کی خوب نبھی، یہ تھی کہ ہم چھوٹی چھوٹی بے وقوفانہ باتوں سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم، جو اور جوائس کلیمنٹ کے ہاں شام کے کھانے پر جا رہے تھے تو ہم نے راستے میں ایک ویران دکان دیکھی جس کے سائن بورڈ پر کسی زمانے میں The Tuck Shop لکھا ہوتا تھا۔ کسی مسخرے نے T کو F سے بدل دیا تھا، اور اس تبدیلی کو درست کرنے کی سب کوششوں کی ناکامی کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ ایسی ہی ایک اور احمقانہ بات یہ ہے — ہماری شادی کے کچھ دن بعد ہی ہارسبرگ کی بھی شادی ہوئی تھی۔ وہ کیتھولک تھا اور کئی بار ہمیں یہ باور کرانے کی کوشش کر چکا تھا کہ 'محفوظ دنوں' میں جنسی اختلاط کو، رحقیقت مانع حمل نہیں کہا جا سکتا، اور اسی وجہ سے مذہب کی رو سے ایسا کرنا درست ہے۔ میں اور مولی دونوں ہی کبھی کیتھولک چرچ عبادت کے وقفے میں کبھی نہیں گئے تھے۔ ڈیوڈ کی شادی پر ایسا موقع آ گیا۔ لیکن اس وقت ہمارے لیے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا جب رسوم کی ادائیگی کے دوران پادری قربان گاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کے پیچھے کھڑا لڑکا وقفے وقفے سے اس کی پوشاک کا ایک کونا اٹھاتا اور ننھی سی گھنٹی

بجاتا تھا۔

باقی مصروفیات اپنی جگہ۔ ہفتے کی شام میں ہم نے کسی ایسی جگہ گزارنے کے لیے مخصوص کر رکھی تھیں جس کا انتخاب مولی کرتی تھی۔ عموماً ہم فلم دیکھنے ہی جاتے تھے۔ اس زمانے میں ٹیلی وژن نہیں تھا اور سینما جانا ہمارے ہاں چھٹی گزارنے کا 'قومی مشغلہ' تھا۔ 1947 کے ایک سروے سے پتا چلتا ہے کہ ہر تین میں سے دو نوجوان ہفتے میں ایک بار سے زیادہ فلم دیکھتے تھے۔ ہم اس معیار پر تو پورے نہیں اترتے تھے لیکن ہمارے نزدیک بھی تفریح کا یہی عام ذریعہ تھا — بنگ کروسبی، ڈوروتھی لیمر و بوب ہوپ وغیرہ کی فلمیں۔ ایک مزاحیہ فلم میں بوب ہوپ نے دانتوں کے ڈاکٹر کا رول کیا تھا۔ Painless Potter میں 'بٹن اور بو' والا یہ گیت بھی تھا

> East is East and West is West/ And the wrong one I have chose/ Let us go where they keep on wearing/ Those frills and flowers and buttons and bows.
>
> (مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب/ اور میں نے غلط کا انتخاب کر لیا ہے/ چلو ہم وہاں چلیں جہاں وہ ہمیشہ پہنتے رہتے ہیں/ وہ جھالریں اور پھول، وہ بٹن اور بو)

ایک اور گیت جس پر ہمیں ہنسی آتی گولڈن ایئر رنگز (Golden Earrings) تھا۔ بظاہر یہ ایک خانہ بدوش نے گایا تھا لیکن درحقیقت یہ جس عورت کی آواز تھی اس کے لہجے پر لنکا شائری لہجے کی گہری چھاپ تھی اور مناسب نہ ہونے کی وجہ سے بے تکی معلوم ہوتی تھی۔ گیت یہ تھا

> What the gypsy says is true/ If you wear a pair of golden earrings love will come to you.
>
> (جپسی جو کچھ کہتی ہے سچ ہے، اگر تم سونے کی بالیاں پہنو گی تو محبت تمھارے پاس خود آئے گی)

ہماری شادی کے کچھ ہی دن بعد مولی نے پابند ملازمت کو خیرباد کہہ دیا، اور صرف اسی دن جاتی جب اس کے سابق مالک کے پاس بہت زیادہ کام ہوتا اور وہ اسے اپنی مدد کے لیے بلا بھیجتا۔

Scanned with CamScanner

مجھے معلوم تھا کہ اسے ملازمت کوئی خاص پسند نہیں تھی اور اس نے اپنے لیے جو فیصلہ کیا میں اس پر خوش تھا۔ لیکن اس کے نتیجے میں جو صورت حال سامنے آئی وہ ایسی نہیں تھی جو اس کی شخصیت کے کسی مثبت فروغ میں مدد کرتی۔ اس کے پاس اپنی پسند کا کوئی دوسرا کام نہ تھا، وہ تو بس کام کے لیے باہر جانا نہ چاہتی تھی۔ شادی شدہ عورت ہونے کی حیثیت سے وہ یہ محسوس کرتی کہ اب اسے گھر میں رہنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ اس نے ایک سوچا سمجھا راستہ اختیار کیا تھا جو صرف روایت کی علامت تھا — بلکہ جنگ کے بعد برطانیہ میں فکر کی یہ ایک عام فضا بن گئی تھی کہ مرد کام پر واپس جائیں اور عورتیں گھر داری کریں۔ لیکن سوئی کا معاملہ یہ تھا کہ اس کے پاس بچے بھی نہ تھے اور عملی طور پر اس پر ایک بھی ذمہ داری نہ تھی۔ اس کو شاپنگ کرنا پسند تھا اور دن میں وہ اکثر اپنی ماں کے ساتھ باہر جاتی تھی، لیکن گھر کے باقی کام اس کی ماں تنہا ہی انجام دیتی تھی۔ مسز مزگروف کا معروف ترین وقت شام کا ہوتا تھا جب وہ ہمارے لیے اور کرایہ داروں کے لیے شام کا کھانا تیار کرتی تھیں۔ لیکن اس وقت بھی نہ تو وہ خود توقع کرتی تھیں اور نہ ہی سوئی ان کا ہاتھ بٹانے کے بارے میں سوچتی تھی۔ ان حالات میں مجھے اس سے یہ توقع کرنا غیر معقول نہیں لگتا تھا کہ وہ کم از کم بیڈروم میں ہمارا بستر ہی تیار کر لے۔ لیکن اکثر یہ ہوتا تھا کہ میں شام کو گھر آتا اور دیکھتا کہ اس نے اتنا سا کام بھی نہیں کیا ہے۔

اس طرح، ایک طرف میں تھا جو سوا اس میں دن بھر اپنے کام میں غرق رہتا، دوسری جانب سوئی تھی، جو گھر میں رہتی — کتنی کلاسیکی تقسیم کار تھی! چھٹیوں کے دنوں میں بھی مجھے پڑھائی کرنی ہوتی تھی کیونکہ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر میں نے محض اپنے اساتذہ کے ساتھ بیٹھ کر نصاب کا مطالعہ کرنے پر تکیہ کیا تو میں امتحان آنے تک سارا نصاب ہرگز ختم نہیں کر سکوں گا۔ یوں میں نے اپنی شادی کے بعد گرمیوں کی پہلی چھٹیاں — جو فائنل امتحان سے پہلے کی آخری چھٹیاں بھی تھیں — اکثر اوقات مزگروف کے باغیچے میں بیٹھ کر پلیٹس (Platts) کے لغت کی مدد سے حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے مطالعے میں صرف کیں۔

مجھے معلوم تھا کہ بالآخر اس سے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ سوئی کو یہ جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ میں کیا پڑھتا ہوں لیکن وہ یہ ضرور سمجھتی تھی کہ میں جتنی زیادہ محنت کروں گا اتنے ہی لیکچرر شپ ملنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اور اس وجہ

سے میں اس کی اور بچوں کی پرورش کا اہل ہو سکوں گا۔ ہم اس بارے میں گفتگو کر چکے تھے کہ اگر مجھے لیکچر شپ مل گئی تو بھی میں بہتر کارکردگی کے مظاہرے کے دباؤ میں رہوں گا۔ کیونکہ ایسے ماحول میں جب سرد جنگ شدید تر ہوتی جا رہی تھی، کمیونسٹ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اکادمک ملازمتوں میں ان کا مستقبل محفوظ ہے۔ ان کو اس قدر اچھی کارکردگی کی ضرورت تھی کہ ان کو ملازمت سے برطرف کرنے کے لیے کوئی اکادمک بنیاد نہ مل سکے۔ مولی نے یہ سب باتیں تسلیم کر لیں لیکن ان کے نتائج پر بھی غور کیا ہو، اس میں مجھے شک ہے۔

مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ اشتراکی سرگرمیوں اور ایک اچھا اشتراکی شوہر ہونے کی اپنی شدید خواہش کے درمیان کس طرح سے توازن قائم کروں۔ بسا اوقات میں سوچتا تھا کہ میری شدید سیاسی وابستگی مولی کو ناگوار تو نہیں گزرتی۔ وہ سدا سے یہ جانتی تھی کہ میرے ہاں اس کو مرکزی اہمیت حاصل ہے، اور شریک زندگی کے طور پر مجھے قبول کرتے ہوئے یہ جانتی تھی کہ آئندہ بھی اسی کو مرکزیت حاصل رہے گی۔ لیکن چونکہ اس کے سامنے کوئی ایسا کام نہ تھا جس پر وہ اپنی توانائی صرف کر سکے اس لیے مجھے یہ خیال گزرتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس کام میں جو وقت میں صرف کرتا ہوں اس پر وہ جز بز ہو۔ میں نے سوچا کہ غالباً مقامی شاخ ایک ایسا ذریعہ بن سکتی ہے جس کی وجہ سے ہم ساتھ ساتھ کام کر سکیں گے۔ اس نے میٹنگوں میں آنا شروع بھی کر دیا، اور حالانکہ مقامی معاملات میں اس نے کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی لیکن ان میٹنگوں کی وجہ سے اس کے سماجی رابطوں میں اضافہ ہوا۔

ہماری شادی کے ابتدائی مہینوں کے دوران یوروپ میں کئی ڈرامائی واقعات رونما ہوئے۔ پہلا اہم واقعہ ہماری شادی سے ایک ماہ پہلے، فروری 1948 میں، پیش آیا جب کمیونسٹوں نے چیکوسلوواکیہ کو قبضے میں لے لیا۔ چیکوسلوواکیہ میں اشتراکی تحریک ایک طویل عرصے سے بڑی مضبوطی سے چل رہی تھی اور اس کی قوت یکسانیت سے مسلسل بڑھ رہی تھی۔ اقتدار پر اجتماعی قبضے کی کارروائی بغیر کسی خوں خرابے کے پوری ہوئی، حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا جس میں صرف چند گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ لیکن پوری مغربی دنیا پر اس کا ردعمل اس قدر شدید ہوا کہ دونوں مخالف محاذ، جن کی سربراہی امریکہ اور سوویت یونین کر رہے تھے، پوری طرح متصادم نظر آنے لگے اور اس کے بعد مصالحت اور

مفاہمت کی سب کوششیں ادھوری چھوڑ دی گئیں۔

پراگ میں میری اور سولی کی ایک دوست ہیلن تھی۔ یہ انگریز تھی اور اس نے ایک مقامی چیک سے شادی کی تھی۔ اس سے ہماری ملاقات نوجوانوں کے عالمی فیسٹول کے دوران ہوئی تھی۔ ہم نے اسے خط میں اطلاع دی کہ ہم نے شادی کر لی ہے (اور اس کو اپنی شادی کے کیک کا ایک ٹکڑا بھی روانہ کیا (ایسا خیال سولی کا ہی ہو سکتا تھا) اور اس کے ساتھ ڈیلی ورکر میں پراگ کے حالات پر شائع ہونے والے ایک مضمون کی تفصیلات بھی لکھیں (یہ میرا آئیڈیا تھا)۔ ہیلن نے جواب میں جو خط لکھا اس میں وہاں کی روزمرہ کی تبدیل ہوتی زندگی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:

> تحریر کی خرابی کے لیے معاف کریں، لیکن میں اس وقت نہایت غیر یقینی کیفیت میں کاتیا (Katja) کی جھولے والی کرسی پر بیٹھی ہوں اور ایک تھیلے پر رکھ کر لکھ رہی ہوں جبکہ کاتیا ریت کے گڑھے میں کھیل رہی ہے۔ کھیل کا میدان ہر عمر کی، ہر جسامت کی اور ہر قسم کی عورتوں اور بچوں سے بھرا پڑا ہے۔۔۔۔ جو مضمون تم نے ورکر میں پڑھا ایک دوست نے لکھا تھا۔ اس مضمون کی اشاعت کے پندرہ دن بعد سے پہلے مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کرتی رہی ہے، لیکن مجھے اس سے خاصی خوشی ہوئی کیونکہ اخباروں میں ایسی تحریریں بہت ہی کم نظر آئی ہیں جو آنکھوں دیکھی سچائی پر مبنی ہوں۔ میرے بہت سے قریبی لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میرے نام خط لکھنے میں کوئی خطرے کی بات تو نہیں ہے اور کیا میں ابھی ہر طرح سے محفوظ ہوں۔ بہر حال، ممی نے سب سے زیادہ فہم و فراست کا مظاہرہ کیا اور اضطراب کے شکار میرے دوستوں اور رشتے داروں کو، جنھوں نے اظہارِ غم کے لیے فون کیا، میرے تعلق سے انھوں نے یقین دلایا کہ یقیناً وہ مسرت سے لبریز وینسلاس اسکوائر (Wenceslas Sqauare) پر سرخ پرچم لہرا رہی ہوگی۔
>
> فروری کے بعد سے حکومت بہت سرگرم ہوگئی ہے، اس نے کئی نئے قانون پاس کیے ہیں اور کئی پاس ہونے کے مرحلے میں ہیں۔ عملی طور پر ہر شے قومی ملکیت میں لے لی گئی ہے۔ سنیچر کے روز کیم مئی ہے، یعنی محنت کشوں کا دن۔ اس دن یہاں

پورے دن کی چھٹی ہوتی ہے، پریڈ نکلتی ہے، مظاہرے ہوتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔
ہماری فروری کی کامیابی کے بعد امسال اس موقعے پر نسبتاً زیادہ پرشکوہ نظارہ دیکھنے کو ملنا چاہیے۔

چند دن کے بعد کے ایک اور خط میں پس نوشت کے طور پر لکھا

یوم مئی کے مظاہروں میں ہم بھی شامل ہوئے۔ سردی بے حد پڑ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ پہلے کے مقابلے میں اس بار کی تقریبات کچھ پھیکی پھیکی سی تھیں — غالباً اس لیے کہ ٹھنڈ بہت ہے، لیکن میرے خیال میں اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس بار گزشتہ سال کی طرح کوئی مسابقت نہیں تھی۔ یا شاید یہ سب صرف میرا وہم ہی ہو، کہہ نہیں سکتی۔

اس کے بعد 1948 میں برلن سے فوجیں ہوائی جہاز کے ذریعے لے جانے کا عمل شروع ہوا جو آئندہ گیارہ مہینوں تک جاری رہا۔ اسی دوران یہ بھی ہوا کہ سوویت یونین نے زمینی راستے سے برلن تک مغربی طاقتوں کی رسائی پر روک لگا دی جہاں تمام قابض ممالک کے مرکزی دفاتر قائم تھے۔

ان تمام واقعات کو دیکھ دیکھ کر ہم یہ حقیقت اچھی طرح جان گئے تھے کہ اشتراکی اور سرمایہ دار ممالک کے درمیان حد فاصل بڑھتی جا رہی ہے اور یہ کہ ہم کہیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ سیاسی ماحول میں داخل ہو رہے ہیں۔ لیکن دنیا بھر کے کمیونسٹ اس وقت مشکل میں پڑ گئے جب پہلے پہل کمیونسٹوں کے اندر دراڑ پڑنے کے آثار نمایاں ہونا شروع ہوئے۔ جون 1948 میں کومنفورم نے یوگوسلاویہ کے لیڈر ٹیٹو (Tito) کا مکمل طور پر حقہ پانی بند کر دیا۔

مجھے اس معاملے سے بڑی فکر لاحق ہوئی۔ سوویت پارٹی نے اپنے ان خطوط کا متن شائع کیا جو اس نے یوگوسلاو لوگوں کو لکھے تھے، لیکن اپنے مخصوص انداز کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے جواب نہیں چھاپے۔ اس کے برعکس یوگوسلاووں نے دونوں متون شائع کیے اور میں نے بڑی باریکی سے دونوں کا مطالعہ کیا۔ اب مجھے تفصیلات تو یاد نہیں (ویسے بھی اس کہانی میں ان کا بیان غیر ضروری ہوگا) لیکن سوویت یونین کے الزامات کا لب لباب یہ تھا کہ ٹیٹو نے سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک کے ساتھ اتحاد قائم رکھنے کے معاہدے کو توڑا ہے اور ان سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ یہ بات بھی

یقیناً درست ہے کہ اس وقت ہمارے لیے یہ بتانا ممکن نہ تھا کہ سچائی کیا ہے اور یوگوسلاویہ کے اندر، اور اسٹالن اور ٹیٹو کے درمیان، کیا کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ البتہ اس وقت ہمارے نزدیک، ایک متحدہ بین الاقوامی اشتراکی تحریک کا تصور سب سے اہم تھا اور ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی راستہ نہ تھا کہ اس تصور کو نقصان پہنچانے میں اسٹالن کا کتنا ہاتھ ہے۔ اس لیے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ سوویت یونین کے الزامات درست ہیں۔ اس سلسلے میں کرس نے بھی، جو اب گلاسگو (Glasgow) میں رہتا اور کام کرتا تھا، مجھے لکھا کہ اس کے خیال میں یوگوسلاویہ غلطی پر ہے۔ لیکن سوویت یونین نے یوگوسلاویہ کے ساتھ تجارتی رابطے منقطع کیے تو مجھے یہ بات ٹھیک نہیں لگی۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار جیمز کلگ مین سے کیا اور نشاندہی کی کہ تیس کی دہائی میں سوویت یونین نے ہر قسم کے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کا اعلان کیا تھا، اسے وہاں کے سیاسی حکمرانوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جیمز نے میری بات سے اختلاف تو نہیں کیا لیکن یہ بھی کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کوئی اہم بات ہے۔

ان سب واقعات سے مزگروری میں ایک خاص طرح کی ہلچل پیدا ہو گئی کیونکہ اس وقت وہاں کے کرایہ داروں میں ایک یوگوسلاوی خاندان بھی شامل تھا — اس خاندان میں ڈشان (Dushan)، اس کی پُرکشش بیوی اور اس کی ننھی بچی، جس نے صاف ذہن میں حال میں ہی بولنا شروع کیا تھا، شامل تھے۔ (مجھے یہ بات بڑی دلچسپ لگی کہ جب اس ننھی بچی سے کوئی کام کرنے کو کہا جاتا اور وہ اسے کرنا نہ چاہتی تو وہ جواب میں 'نے چیو' (Naychu) کہتی تھی — یعنی 'میں نہیں کرنا چاہتی'۔ اس کا یہ جواب مجھے صوتی اعتبار سے سنسکرت کا سا لگتا تھا۔) ڈشان یوگوسلاویہ کے سفارت خانے میں ملازمت کرتا تھا، چنانچہ اس کے لیے ٹیٹو کے موقف کی حمایت کرنا قدرتی تھا۔ ڈیل زینڈ (Dell Zand) نام کی ایک عورت بھی تھی جس نے یوگوسلاویہ یوتھ ریلوے کی تعمیر میں کام کیا تھا۔ اس پروجیکٹ نے بین الاقوامی سطح پر کمیونسٹوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی، کیونکہ یوگوسلاوی حکومت نے دوسرے ممالک کے نوجوانوں کو اس میں رضاکارانہ طور پر کام کرنے کو مدعو کیا تھا اور اس میں شامل ہونے والے سب لوگوں نے اس برادرانہ ماحول کا خوب لطف اٹھایا تھا۔ یوگوسلاویہ میں کمیونسٹوں نے جو کامیابی حاصل کی تھی اس سے ڈیل خاصی پرجوش نظر آتی تھی اور قدرتاً ان الزامات کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی جو سوویت یونین نے لگائے تھے۔ بسا اوقات وہ جم سانڈرز (Jim

(Saunders ta نام کے ایک اور کرایہ دار کے ساتھ بحث میں الجھ جاتی۔ جم پارٹی کے ان اراکین میں سے تھا جو پارٹی کے کہے ہوئے ہر لفظ پر اندھا اعتقاد رکھتے ہیں اور جن کے ذہنوں میں کبھی شکوک وشبہات سر نہیں اٹھاتے۔ وہ فقرے جم کثرت سے استعمال کرتا تھا جو اس نے غالباً امریکی فلموں کی عامیانہ بولی سے اٹھائے تھے۔ جن لوگوں کو وہ سخت ناپسند کرتا ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتا تھا: a shot rang out یعنی اگر میرا بس چلے تو گولی مار دوں۔ ایسے لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ انھیں hootin' horney کا لقب بھی دیتا اور اکثر that hootin' horney Tito کا ذکر کر کے وہ ڈیل کو کبیدہ خاطر بھی کرتا رہتا تھا۔

انھی دنوں کی بات ہے کہ ڈشان اچانک ہی سولی کے لیے جنونی کشش محسوس کرنے لگا۔ کسی وجہ سے ایک دن سولی اس کے ساتھ اس کے آفس گئی جو اوپر کی منزل پر واقع تھا۔ آدھی سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اس نے اچانک ہی سولی کو کس کے بانہوں میں جکڑ لیا۔ وہ حیران رہ گئی، خود کو آزاد کرایا اور اس سے بیٹھنے کو کہا۔ اس کے بیٹھنے کے بعد سولی نے اسے اس وقت تک لیکچر دیا جب تک کہ اس کا جذبہ ٹھنڈا نہ پڑ گیا۔ اس صورت حال سے بعد میں وہ خاصی محظوظ ہوئی اور مجھے پوری تفصیل سنائی، اور یہ بھی کہا کہ اسے یہ سب اچھا لگا تھا لیکن ـــ

Scanned with CamScanner

14

اردو پر کچھ روشنی

کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں میرے تصور اور کمیونسٹ کے طور پر کام کے تعلق سے میری فکر میں جو گہری تبدیلی آئی اس کے سبب مجھے اردو پڑھنے کے اپنے مقصد پر از سرِ نو غور کرنا پڑا۔ سوالیس میں اردو تعلیم کے مواقع کی بات سننے سے لے کر آج تک میرا اندازِ فکر پوری طرح سے یہی تھا کہ اردو سیکھنے کے بعد میں پارٹی کا کام زیادہ موثر ڈھنگ سے کرنے کو تیار ہو جاؤں گا۔ پارٹی کے موجودہ تنظیمی نظام میں اب مجھے اپنے لیے کوئی خاص رول نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن میں نے اس نہج پر غور کرنا شروع کر دیا تھا کہ کچھ ایسے مقاصد بھی ہیں جو میں اردو کا معلم اور عالم بن کر حاصل کر سکتا ہوں اور جو کمیونسٹ نصب العین کے فروغ میں کچھ اس طرح سے معاون ہو سکتے ہیں جس پر میں نے پہلے غور نہیں کیا تھا۔

استعماریت کے خلاف ہندستانیوں اور برطانوی عوام کی مشترکہ جدوجہد میں زیادہ قریبی اور برابری کے مراسم کی ضرورت پر حالیہ دنوں میں میں نے کافی غور کیا تھا۔ لوگوں کے ساتھ میرے نجی رابطے بھی، مجھے یقین ہے کہ باہمی رواداری اور مساوات پر ہی مبنی تھے۔ لیکن میں نے اس بات کو پوری طرح سے نہیں سمجھا تھا کہ ایک حد پر پہنچ کر ہندستانی اور برطانوی لوگوں کے مراسم بہر طور نابرابری کے ہو جاتے ہیں۔ پارٹی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ کارکنان اور میرے شناسا ہندستانی طالب علم، جو دو تہذیبی (bi-cultural) تھے، دونوں کی تعلیم برطانوی طرز پر ہوئی تھی، اور یہ ہندستانی دوست برطانوی دانشوروں سے انھی کی سطح پر بات کر سکتے تھے -- ان کی زبان میں اور ان کے تہذیبی تصورات کے دائرے میں۔ لیکن، اس کے برعکس، انگریزوں کی جانب سے ایسا ہونا تقریباً ناممکنات میں سے تھا۔

Scanned with CamScanner

اسی بنا پر میرے لیے شاید ایک تہذیبی ترجمان کا رول مناسب ہو سکتا تھا۔ حالانکہ میں یہ مانتا تھا کہ میں ہندستان اور ہندستانیوں کے مزاج کو سمجھتا ہوں لیکن شروعاتی دور میں ہی اردو ادب کی لطافت کو سمجھنا اس قدر مشکل پڑا کہ مجھ کو سمجھ میں آ گیا کہ جس معاشرے کی تہذیبی اور اقداری نظام کی ترجمانی یہ ادب کرتا ہے، میں اس معاشرے کے بارے میں اپنے گمان سے کہیں کم علم رکھتا ہوں۔ اگر میں ادب کی اتنی فہم پیدا کر سکوں کہ اردو ادب کو اس کی شرطوں پر سمجھ سکوں اور اردو بولنے والوں کے تصورات کے مطابق ان کی چیزوں کی تفہیم کر سکوں تو ان کے ساتھ میری ایسی قربت پیدا ہو سکتی ہے جو کسی اور طریقے سے ممکن نہیں۔ اس سے میں ہندستان سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے مغربی لوگوں کو اپنی اس فہم میں شریک کرنے کی حیثیت بھی پا سکوں گا۔ اس طریقے سے میں انفرادی سطح پر لوگوں کے درمیان اور قوموں کے مابین زیادہ سچے اور برابری کے رشتے قائم کرنے کی راہ ہموار کرنے میں مدد کر سکوں گا۔

میرے نزدیک ادب کبھی میری سیاسی وابستگی سے الگ نہیں رہا تھا۔ ادب اور سیاست دونوں ہی کا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ کس طرح زیست کرنا چاہتے ہیں۔ میرے نزدیک عظیم ادب ایسی شے کا نام ہے جو آپ کو ہمیشہ سکھاتا رہتا ہے، آپ کو ڈھالتا ہے، آپ میں تبدیلی لاتا ہے، آپ کو بدل ڈالتا ہے، آپ کو اپنی شخصیت کا اور دوسرے لوگوں کا سچا اور گہرا ادراک کراتا ہے، اور اس کائنات کا ادراک کراتا ہے جس میں آپ رہتے ہیں۔ میری سیاسی وابستگی ان انسان دوستی کی اقدار کے اظہار کے سوا کچھ نہ تھی جو معاشرے کو تبدیلی کی راہ پر لگاتی ہیں تاکہ لوگ ایسے طریقوں پر زندگی گزار سکیں جو آزادی کی طرف لے جانے والے ہوں، ظلم و جبر کی طرف نہیں۔ آپ یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اس موقف میں کمیونسٹوں والی کوئی خاص بات نہیں ہے، یہ تو محض ایک انسانی موقف ہے۔ بالکل درست۔ لیکن میرا انسان دوستی کا نظریہ چونکہ اشتراکی انسان دوستی پر مبنی ہوا، اس لیے میں نے خود کو ہمیشہ کمیونسٹ ہی مانا۔ صرف انسان دوستی کے نظریے میں وہ تمام مقاصد شامل نہیں ہیں جو میرے عمل میں تھے، لیکن کمیونزم میں یہ سب باتیں شامل ہیں۔

اپنے ممکنہ تعاون کے تعلق سے اس نئے انداز فکر کا اظہار میں نے سب سے پہلے اپنے ہندستانی کمیونسٹ دوست اندرجیت گپتا کو لکھے ایک خط میں کیا۔ کیمبرج میں وہ میرے ہمعصر تھے اور بعد میں ہندستانی کمیونسٹ لیڈروں میں وہی تھے جن کے ساتھ ہندستان میں میرے ساڑھے تین

Scanned with CamScanner

سالہ قیام کے دوران، کبھی کبھار ہی سہی، میرا قریب ترین تعلق رہا۔ میں نے ان کو لکھا کہ میں قائل ہو گیا ہوں کہ اردو کا اسکالر اور معلم بننا میرے نزدیک بہترین طریقہ ہے جس سے میں اپنا سیاسی تعاون دے سکتا ہوں:

> یہ ایسا میدان ہے جس میں بہت ہی کم برطانوی عالموں نے اپنا کوئی قابلِ قدر تعاون دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ بات ہمارے (کمیونسٹوں کے) حق میں اہم ہوگی کہ تسلیم شدہ اکادمک حیثیت کا حامل کوئی شخص اس میدان میں ایک مقام حاصل کرے، اور میں نے طے کیا ہے کہ اس مقصد کے حصول کی پوری کوشش کروں گا۔ اگر حالات اسی راہ پر چلتے رہے جس پر آج نظر آرہے ہیں، تو مشرق اور مغرب کے درمیان روابط میں بہت اضافہ ہوگا اور یقیناً اس شعبے کے برطانوی کارکنان کے لیے، اور آپ کے یہاں کے اسکالروں کے لیے بھی، کام کرنے کا ایک وسیع میدان پڑا ہوگا۔

پہلے میں نے اور کچھ دوستوں نے مل کر یہ سوچا تھا کہ ایشیائی مطالعات کے شعبوں میں کام کرنے والے سارے کمیونسٹوں کو یکجا کرنا، اور کام کرنے کی حکمتِ عملی پر تبادلۂ خیال کرنا ہمارے مقاصد کے لیے مفید ہوگا۔ ہم میں سے بیشتر لوگوں کو تعلیم کا یہ موقع اسکاربرو رپورٹ (Scarbrough Report) کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا جس میں ایشیائی مطالعات میں مہارت رکھنے والوں میں خاصا اضافہ کرنے کی سفارش کی گئی تھی۔ چنانچہ 1948 میں میں نے ایک غیر رسمی میٹنگ منعقد کی جس کا مقصد رپورٹ کی منظوری کے نتیجے میں سامنے آنے والے مقاصد پر بات کرنا تھا۔ میں نے تعارفی خاکہ پیش کیا جس میں یہ وضاحت کی کہ اسکاربرو رپورٹ کے پس پشت کون سے استعماری رویے مخفی ہیں، لیکن اس بات پر زور دیا کہ اس کی وجہ سے ہمیں وہ موقع فراہم ہو گیا ہے جس کا فائدہ اٹھا کر ہم نوآبادیوں، یا استعماری قوتوں سے حال ہی میں آزادی حاصل کرنے والے ممالک کے لوگوں کی زبانوں اور تاریخ و ثقافت کے ساتھ سنجیدہ رشتے پیدا کر سکتے ہیں۔

اردو کے میدان میں خود کو آراستہ کرنے کی میری مساعی نے بالآخر رنگ لانا شروع کیا۔ بہت سارے نئے الفاظ پر مہارت حاصل کرنے کی گھنٹوں گھنٹوں جو مشق کیا کرتا تھا وہ نتیجہ خیز ہونے لگی۔

Scanned with CamScanner

نذیر احمد کے توبۃ النصوح سے سابقہ پڑنے پر میں نے جو مایوسی محسوس کی تھی، اب جا کر اندازہ ہوا کہ اس کا تعلق زبان کی مشکلات سے تھا۔ جب ان مشکلات سے گزر گیا تو ان کی نثر کی قوت اور کردار نگاری پر ان کی مہارت کا اندازہ ہونے لگا۔ دہلی میں ہیضے کی وبا پھیلنے کا بیان، یا یومِ محشر کا نصوح کا خواب، جو ایسا جاندار تھا کہ اس کی زندگی کا نقطۂ انحراف بن گیا، بے حد شاندار فن پارے ہیں جو دلوں پر زبردست تاثر چھوڑتے ہیں۔

ہیئت اور اسلوب کی غیر متوقع طرز ادا سے اب مجھے مزید پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ مثلاً سرشار کی فسانۂ آزاد ایسی ہی کتاب ہے جو شروع میں مجھے بہت انوکھی معلوم ہوئی، کیونکہ میں جس ادب سے واقف تھا اس میں اس قسم کی کوئی کتاب نہ تھی۔ ایک تو یہ بے حد طویل تھی، چار جلدوں پر مشتمل جس میں ہر جلد میں A4 سائز کے اوسطاً آٹھ سو صفحے تھے اور عبارت دو دو کالموں میں منقسم تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمیں اس کے منتخب حصے ہی پڑھنے تھے۔ اس میں کوئی کردار نگاری نہیں، اور پلاٹ بھی واجبی سا ہی ہے، جس میں آخر تک ایک قصہ دوسرے میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ میں اس قصے سے اس کے اپنے مطالبات کے مطابق محظوظ ہو سکا۔ اس میں لکھنؤ کی معاشرت کے، اس وقت کی زندگی کے بھرپور مرقعے پیش کیے گئے ہیں جب دہلی کے علاوہ لکھنؤ بھی اردو تہذیب کے دو بڑے مراکز میں سے ایک تھا، اور یہ قصہ بول چال کی بامحاورہ زبان میں ایک ایسے اسلوب میں لکھا گیا ہے کہ پڑھ کر مزہ آ جاتا ہے۔

میں نے اب ترجمے کی مشق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے نذیر احمد کے چند بہترین منظر نگاری والے اقتباس منتخب کیے، لیکن یہ بڑی حیران کن بات لگی کہ ان کے اسلوب کو معاصر انگریزی محاورے میں منتقل کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ ان کے زورِ بیان کا سارا دارومدار مختلف قسم کی ایسی ادبی تراکیب اور صنعتوں کے مشاقانہ استعمال پر ہے جو عہدِ حاضر کے انگریزی داں قاری کی فہم سے بالاتر ہیں۔ جب میں نے ان کو پہلی بار پڑھا تھا تو مجھے بھی ان کا اسلوب کچھ عجیب معلوم ہوا تھا لیکن بعد میں اس سے میں بے حد متاثر ہوا اور مجھے ان کے منظر نگاری والے بیشتر اقتباس بہت شاندار معلوم ہوئے۔ مثال کے طور پر اگر انگریزی میں ان کا مقابلہ کسی سے کیا جا سکتا ہے تو سترھویں صدی کی دعاؤں کی کتاب Book of Common Prayers کا عام اعترافات والا وہ حصہ

Scanned with CamScanner

ہے جو بہت پرشکوہ اور سنجیدہ اسلوب میں ہے، یا پھر بائبل کے وہ اقتباسات جو ایمان، امید اور محبت سے متعلق ہیں۔ مقفی جملے، صوتی تکرار والے الفاظ اور مترادفات کا استعمال اس قسم کی عبارت کے محاسن ہیں: نذیر احمد کی نثر میں بھی یہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی خوبیاں ہیں۔ شعوری طور پر اختیار کیا گیا شاعرانہ اسلوب، مبالغہ، لفاظی، مقفی و مسجع جملے، ایک ہی موضوع پر لگاتار مترادف جملوں کا استعمال، کبھی فارسی اور عربی کے مستعار الفاظ سے مزین بہت ہی نفیس زبان اور کبھی بول چال کی گھریلو اور مقامی زبان کا استعمال۔ خانگی زندگی کے موضوع پر، جو توبۃ النصوح کا بھی موضوع ہے، کسی جدید ناول میں اس قسم کا اسلوب دیکھ کر آج کا انگریزی داں قاری خاصا پریشان ہو جائے گا۔ لیکن جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ نذیر احمد کے قاری وہ لوگ تھے جن کی لکھے ہوئے الفاظ سے شناسائی قرآن کی شاعرانہ نثر کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو شاعری سے محبت کرتے ہیں اور اس قسم کے ادبی اسلوب کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ نذیر احمد کے قاری اس نثر کو پڑھ کر اتنے ہی لطف اندوز ہوتے ہوں گے جتنا وہ خود اس کو تحریر کرتے وقت محظوظ ہوئے ہوں گے۔

بعد کے ایک ناول (ابن الوقت) میں نذیر احمد نے 1857 کی جدوجہد (جس کو انگریز ادیب آج بھی 'غدر' اور ہندستانی ادیب 'پہلی جنگِ آزادی' مانتے ہیں) کا ایک منظر بیان کیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار، اپنے خادموں اور ماتحت عملے کے ساتھ شام کے وقت اپنے گھر کی جانب لوٹتے ہوئے ان انگریزوں کی لاشوں کے قریب سے گزرتا ہے جن کو باغیوں نے مار ڈالا ہے۔ سورج غروب ہو رہا ہے اور لاشیں ایک دیوار کے سائے میں پڑی ہوئی ہیں۔ نذیر احمد لکھتے ہیں:

> اِدھر آفتاب کا جنازہ کفنِ خون آلودِ شفق پہنا کر تیار کر چکے تھے کہ قبرِ مغرب میں اتار دیں، اُدھر بے کفن کی لاشیں دیواروں کے سائے کا ماتمی کفن پہن چکی تھیں۔

یہاں غروب ہوتے ہوئے سورج اور لاشوں کے درمیان مماثلت اور تضاد بیک وقت جوڑ دیا گیا ہے، اور بے کفن لاشوں کے دیوار کے سائے کا کفن پہننے کی بات سے جو تولِ محال پیدا ہوا ہے، اس سے اردو کا قاری بہت متاثر ہوگا اور اسے کسی بھی صورت میں یہ دور کی کوڑی لانے والی بات نہیں لگے گی۔ یہ محض ایک مثال ہے کہ نذیر احمد اپنے بنیادی مقصد سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے صنعتوں کا

Scanned with CamScanner

کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

جس میدان میں میں اب بھی بے حد پریشانی محسوس کرتا تھا وہ اردو شاعری کا تھا۔ میں اب بھی اس سے غرابت محسوس کرتا اور اس سے محظوظ ہونا مشکل پاتا تھا، اور آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ میرے اساتذہ میں سے کوئی بھی اس سلسلے میں میری مدد نہیں کر سکے گا۔

میرے سامنے سب سے زیادہ سوال تو غزل سے متعلق کھڑے تھے، یعنی وہ عشقیہ شاعری جس کو سبھی اردو والے اپنے ادبی سرمایے کا سب سے شاندار حصہ سمجھتے ہیں۔ اس سے بھی پہلے جب میں نے اشعار کے معنی سمجھنے سیکھے، اس کی ہیئت مجھے پریشان کرتی تھی۔ ہر غزل میں بہت سے اشعار ہوتے ہیں جو مفہوم میں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں لیکن ہیئت کے اعتبار سے ان میں بحر اور قافیہ و ردیف کا رشتہ ہوتا ہے۔ پہلے شعر (مطلع) کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں اور اس کے بعد والے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ پہلے شعر کے قافیے اور ردیف کے مطابق ہوتا ہے۔ اس طرح اس کی ہیئت یوں ہوگی AA BA CA DA وغیرہ۔ انیسویں صدی کے شاعر غالب کی غزلوں کے ترجمے سے (تصویر دیکھیں) آپ اس کی ہیئت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں کہ ہر شعر ایک آزاد وجود کا حامل ہوتا ہے، اور ضروری نہیں کہ اپنے ہمسایہ اشعار سے اس کا مزاج میل کھاتا ہو۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کوئی مجھے بتانے والا نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ غزل کو سچے موتیوں کا ایک خوبصورت ہار سمجھ سکتے ہیں جس کے سب موتی ایک ہی دھاگے میں پروئے گئے ہیں۔ لیکن مجھے یہ کوئی درست تشبیہ محسوس نہیں ہوئی۔ اشعار اپنے وزن اور بحر میں تو ایک جیسے تھے، لیکن ان میں کوئی دوسرا رشتہ نہ تھا' اور یہ بات تو طے تھی کہ ان میں سے ہر شعر کو موتی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ البتہ یہ مجھے ایسی لڑی ضرور لگتی تھی جس میں چند سچے موتی اور بہت سارے کانچ کے سادہ و رنگین، سستے قسم کے موتی ملا کر پرو دیے گئے ہوں۔

یہ بھی تھا کہ زیادہ تر اشعار کا مفہوم ناممکن حد تک دھندلا نظر آتا تھا۔ میں کسی شعر کے اگر سارے الفاظ اچھی طرح سمجھ لیتا تو بھی میرے لیے اکثر یہ سمجھنا دشوار ہوتا کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ مثلاً غالب (جس کو اکثر لوگ اردو کا عظیم ترین شاعر مانتے ہیں) کے ایک شعر کا لفظی مفہوم مجھے کچھ

Scanned with CamScanner

اس طرح سمجھ میں آیا:

میرے قاتل کو ڈر کیوں ہو؟ جو خون تمام عمر میری نمناک آنکھوں سے ہر لمحے ٹپکتا رہا، وہ خون اُس کی گردن پر کیوں رہے؟

(اصل شعر اس طرح ہے:

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے)

اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ شعر مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔

مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ زیادہ تر غزلیں عشقیہ ہوتی ہیں، لیکن بیشتر اوقات وہ مجھے عشقیہ محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ اور جہاں شعر خالص عاشقانہ ہوتا، وہاں میں اس میں مذکور صورتِ حال کو قطعی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ میں اسے اپنے تجربے میں آنے والے حالات سے یا دوسری زبان کے ادب کی عاشقانہ شاعری سے یکسر مختلف محسوس کرتا۔ اگر میں کسی شعر کا مفہوم (اپنے خیال میں) سمجھ بھی لیتا تو وہ مجھے بہت ہی کم متاثر کرتا تھا۔ میں اپنا ردِعمل شک و شبے کی صورت میں یا پھر استہزا کی شکل میں ظاہر کرتا۔ ان اشعار میں ہمیشہ ہی کسی خوبصورت محبوبہ کا ذکر ہوتا جس کے حسن کو روایتی انداز میں مبالغہ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا۔ مثلاً اٹھارویں صدی کے شاعر میر کا یہ شعر

گلبرگ کا یہ رنگ ہے، مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے
دیکھو نہ جھمکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا

یقیناً اس مبالغہ آمیز فرسودہ خیالی سے تو میں متاثر ہونے والا نہیں تھا۔ اس شاعری میں یہ بھی تھا کہ محبوبہ اپنے عاشق کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتی۔ ادب میں یا زندگی میں ایسا ہونا کوئی نئی بات تو نہیں لیکن غزل کی محبوبہ ہمیشہ اسی مزاج کی لگتی، اور اکثر 'ظالم' یا 'ستم گر' کہہ کر اس کا ذکر کیا جاتا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ جس محبوبہ نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا اس کو شاعر ظالم ہی سمجھے گا لیکن غزل کی محبوبہ ان معنوں میں ظالم نہیں ہوتی۔ وہ ایک مکمل طور پر بدطینت کردار ہے جس کو ظلم و ستم ڈھانے اور کیہ توری میں لطف آتا ہے۔

اور عاشق اس سب پر کس طرح کا ردِعمل ظاہر کرتا تھا؟ ایک ایسے خوددار آدمی کی طرح تو کبھی

نہیں جو عشق کے اس مایوس کن عارضے سے خود کو باہر نکالنے کی کوشش کرے، یا اپنی مستحکم وفاداری سے اپنی محبوبہ کا دل جیتنے کا عہد کرے، یا کم از کم بہادرانہ عزم اور عزتِ نفس کے ساتھ زندگی بھر ایک ایسی محبت کا بار اٹھانے کے لیے خود کو تیار کرے جو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوگی۔ وہ ان میں سے کوئی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ بے ریڑھ کے آدمی کی طرح خود ترسی میں مبتلا رہتا اور اپنی قسمت کو روتا ہے، اور یہ مان لیتا ہے کہ وہ ایسے حالات کے مدِ مقابل ہے جن کو وہ کسی صورت بدل نہیں سکتا۔ مختصر یہ کہ عاشق اور اس کی معشوقہ دونوں ہی مجھے سخت دل یا غیر ہمدرد کردار نظر آئے، ایسے لوگ جو میرے دل میں ذرا سی بھی ہمدردی و غم گساری پیدا کرنے میں ناکام رہے۔

اس سے بھی زیادہ بیزار کن بات یہ تھی کہ غزل کے عظیم کلاسیکی شاعر، جو سب کے سب مرد تھے، اپنی محبوبہ کا ذکر ہمیشہ مذکر کے صیغے میں کرتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ خالص کلاسیکی روایت بھی ہے۔ شاعرات بھی اسی طرح شعر کہتی تھیں گویا وہ مرد ہوں، اور ان کی شاعری کا معشوق بھی مرد ہی ہوتا۔ (باعزت عورتیں عام طور سے شاعری نہیں کرتی تھیں، یہ رواج صرف طوائفوں تک محدود تھا۔) لیکن محبوبہ کو ہمیشہ مرد ہی کی طرح کیوں مخاطب کیا جاتا تھا؟ کیا اس لیے کہ غزل صرف امرد پرستانہ عشق سے متعلق ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو یہ صورتِ حال میری شعر فہمی میں مشکل نہ کھڑی کرتی۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ کبھی کبھی یہ صورت ہوتی بھی ہے، یہ الگ بات ہے کہ جو لوگ اس حقیقت سے واقف تھے وہ عموماً اسے ظاہر کرنے میں پس و پیش کرتے تھے، لیکن جزئیات سے ایسے بہت سے اشارے مل جاتے تھے (مثلاً لمبے بالوں کے ذکر سے) جن سے اندازہ ہو جاتا کہ بلاشبہ معشوق عورت ہی ہے۔ ایسی صورت میں اسے مرد کی طرح سے پیش کرنا مجھے بڑی لغو بات محسوس ہوتی تھی۔

سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شعری بحر کو سمجھنا بڑا مشکل کام تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اردو شاعری میں بہت سے اوزان ہوتے ہیں اور ان کا نظام بڑا پیچیدہ ہے، اور یہ کہ ایک مخصوص غزل کے سارے اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔ لیکن جو غزلیں ہمیں پڑھائی جا رہی تھیں ان میں اوزان کا کوئی مخصوص سانچہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میرے لیے یہ ایک بڑا صدمہ تھا کیونکہ دوسری زبانوں میں شعری وزن پہچاننے میں مجھے کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی، خواہ یہ بحریں انگریزی کی طرح صوتی زور (stress-based) پر مبنی ہوں یا پھر لاطینی، یونانی اور سنسکرت کی طرح تعدادی وزن

پر (quantity-based)۔ اردو کی بحریں تو کسی ور ہی اصول پر مبنی معلوم ہوتی تھیں جو میری سمجھ سے باہر تھا۔

میں نے ہارلی (Harley) سے مدد مانگی۔ سمجھنے کے لیے میں نے اُن پر جتنا زور دیا اتنا ہی مجھے اندازہ ہوتا گیا کہ غزل ان کو بھی کچھ خاص متاثر نہیں کرتی، البتہ وہ اس کا کھلا اعتراف کرنا پسند نہیں کرتے۔ جڈ (Judd) بھی کوئی مدد نہ کر سکے کیونکہ وہ خود یہ بات پر زور دے کر کہتے تھے کہ ان کا میدان 'محاوروں اور ضرب الامثال' تک محدود ہے۔ بلگرامی بھی مدد نہ کر سکے، کہ غزل ان کی پرورش و پرداخت کا حصہ تھی اور انھیں اس کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی۔

میں نے مدد کے لیے اپنے ان پوسٹ گریجویٹ کا مریڈوں کی جانب توجہ دی جو اردو داں تھے اور اردو کی مشق کے لیے میں ان سے باقاعدگی سے ملاقاتیں کرتا تھا۔ ان میں سے سب تو نہیں لیکن بہت سے اردو غزل سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں سے بیشتر اردو والوں کے اس عمومی نظریے کو درست مانتے تھے کہ غزل کی شاعری، جو شعری ہیئتوں میں مثالی نمونہ ہے، اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ میں ان کی بات سے پوری طرح متفق ہونے کو تیار تھا، لیکن میرے چاہنے کے باوجود اس موضوع پر میرے علم میں اضافے کی کوششوں میں میرا کوئی دوست کامیاب نہ ہو سکا۔ درحقیقت وہ لوگ غزل کی روایت کے اسی طرح عادی تھے اور اس میں انھیں کوئی بات انوکھی نہ لگتی تھی۔

اس صورتِ حال نے مجھے توقف کر کے سوچنے، خاصی سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیے جب میں بھی اپنے اردو داں دوستوں کی طرح غزل فہمی کی صلاحیت پیدا نہ کر لوں۔ میں جانتا تھا کہ میر جیسے شاعر گزشتہ دو سو برسوں سے سراہے جا رہے ہیں، اور وہ سب تہذیب یافتہ لوگ جن کے ذوق اور ادراک کا میں لحاظ کرتا تھا، میر کو عظیم شاعر مانتے ہیں۔ یہ ممکن تھا کہ ان سب کی رائے غلط ہو لیکن کہیں زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ میری ہی صلاحیت محدود ہے، اور میں غزل کی لطافتیں درست طور پر سمجھنے میں مسلسل ناکام ہو رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے جی میں ٹھان لیا کہ سخت محنت کروں گا اور ایک دن اتنا سیکھنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جس کی مجھے ضرورت ہے۔

شعری اوزان کے معاملے میں ان کے ساتھ میری گفتگو بہت قلیل حد تک ثمر آور ہوئی۔ وہ

سب یہ بات جانتے تھے اردو شاعری میں عروض کا ایک مخصوص نظام ہے جو عربی شاعری کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھی بالکل ابتدائی نوعیت سے زیادہ علم رکھنے کا دعویٰ نہ تھا، لیکن وہ شعر کی موزونیت اور وزن پہچان لیتے تھے، جبکہ مجھے کچھ بھی پہچان نہ ہوتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں اپنے کسی دوست کو اپنی پسند کا کوئی شعر حافظے کی بنیاد پر سناتا جس پر وہ مجھے فوراً ٹوک دیتا، "تم نے اس کو ضرور غلط یاد کر لیا ہے۔ یہ مصرع درست نہیں ہو سکتا۔ یہ موزوں نہیں ہے۔" وہ اس پر تھوڑی دیر غور کرتا اور پھر کہتا: "یہ شاید اس طرح ہوگا" اور وہ کوئی مصرع سناتا جو میرے کانوں کو تقریباً ویسا ہی لگتا جیسے میں نے سنایا تھا۔ اس پر مکالمہ کچھ اس طرح سے آگے بڑھتا

"لیکن یہ تو مجھ کو بالکل اسی بحر میں معلوم ہوتا ہے۔"

"خیر، ایسا نہیں ہے۔"

"کیا فرق ہے، تب؟"

"میں تمھیں نہیں سمجھا سکتا، لیکن دونوں مصرعے الگ الگ ہیں۔ ایک وزن میں ہے، دوسرا نہیں ہے۔"

بہر طور مجھے یہ پتا چل گیا کہ یہ پیچیدہ بحریں، جن کا کوئی سانچہ میری سمجھ میں قطعاً نہ آتا تھا، اردو دانوں کے لیے خاصی اہمیت رکھتی ہیں، خواہ وہ انھیں سمجھنے میں میری کوئی مدد بھلے ہی نہ کر سکیں۔ میں یہ آس لگائے رہا کہ وہ دن ضرور آئے گا جب میں اتنی اردو شاعری سیکھ لوں گا کہ میں اسے سن کر خود سے اس کے اوزان کا تجزیہ اسی کی شرطوں پر کرنے کا کوئی طریقہ سیکھ سکوں اور مجھے انگریزی، لاطینی، یونانی، سنسکرت، عربی یا کسی اور زبان کے حوالے کی ضرورت نہ پڑے گی۔

آہستہ آہستہ، تمام تر مشکلات کے باوجود، غزل کے وصاف ٹکڑوں ٹکڑوں میں میری سمجھ میں بیٹھنے لگے۔ کچھ ایک شعروں میں، جن میں سے اکثر غالب کے تھے، میں ان احساسات کی شناخت کرنے لگا جن کو میں پوری طرح سے سمجھ سکتا تھا۔ ان میں ایک سادہ لیکن پُر تاثیر جذبوں کا اظہار تھا جو ہر ملک میں اور ہر دور میں محبت کرنے والوں نے محسوس کیے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

Scanned with CamScanner

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

بہت سے ایسے اشعار بھی تھے جو عشقیہ نہیں تھے، اور ان میں ایسی خوبیاں تھیں جو مجھے کسی دوسرے اردو شاعر کے ہاں نظر نہیں آئیں۔ وہ زندگی کے لیے شدید جوش یوں ظاہر کرتے ہیں

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ غالب ایک شخص ایسا ہے جو ہر تجربے سے گزرنا چاہتا ہے، ہر اس شے سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے جو لطف اٹھانے کے لائق ہے:

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

اس کے ہاں بے ادبی میں بھی ایک تازگی ہے، جنت کے وعدے کی سرخوشی پر وہ یوں شک وارتیاب جتاتا ہے:

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

اور خوش مذاقی کے ساتھ مروجہ مذہب کے مطالبات سے ہم آہنگی پیدا کرنے میں اپنی معذوری یوں ظاہر کرتا ہے:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

Scanned with CamScanner

مجھے اس کی یہ ادا بہت بھائی کہ بڑے خشک انداز میں مزاح کے ساتھ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہمیں اپنے خراب تجربوں میں بھی خیر کا پہلو ڈھونڈ لینا چاہیے:

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

مجھے یہ بھی اچھا لگا کہ اپنے محسوسات کا، اور ایسے حالات کا سامنا، جنھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، وہ بڑی دیانت سے کرتا ہے

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہوجائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

غالب کی گہری تفہیم کے میرے یہ لیے بہت پریشان کن بھی تھے کیونکہ اس کی بیشتر شاعری میرے لیے اب بھی ناقابل فہم بنی ہوئی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ بے حد پیچیدہ خیالات کو نہایت ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنے میں مہارت رکھتا ہے۔ یہ ایسی خوبی ہے جو میرے خیال میں غزل کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہے کہ اس میں اپنی ساری بات ایک ہی شعر میں کہنی ہوتی ہے۔ حالانکہ اس خوبی نے غالب کو بہت مشکل شاعر بنادیا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی اس مشقت میں مجھے یہ جھلک ضرور نظر آنے لگی تھی کہ اگر میں اس کی غزل کی ہیئت وراس کے طرز فکر سے اچھی طرح واقف ہوجاؤں تو آئندہ مجھے اس کا کیا صلہ ملنے والا ہے۔

اب میں نے اُس وقت کے بارے میں سوچنا شروع کردیا تھا جب میں اردو پڑھاؤں گا، اور نصاب کیسا ہو ور کیسے پڑھایا جائے، اس پر میری رائے کی اہمیت ہوگی۔ یہ نصاب کچھ زیادہ ہی مشکل تھا، دوسری جانب اس میں کچھ نرالی سی کمیاں بھی تھیں۔ مثلاً سوالیس آنے سے پہلے میں جس تنہا شاعر کا نام جانتا تھا اور جو بیسویں صدی کا بہت ہی بااثر شاعر ہے، وہ اقبال ہے۔ سوالیس کے نصاب میں اقبال کا کچھ بھی شامل نہیں تھا۔ جب میں نے اپنے اردوداں دوستوں کو یہ بات بتائی تو وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ اُس دور کی ایک عام روایت یہ تھی (جو خاصی غیر منصفانہ تھی) کہ زندہ ادیبوں کی کوئی تحریر

Scanned with CamScanner

نصاب میں شامل نہیں کی جاتی تھی۔ اس روایت کی رو سے بھی اقبال کو نصاب میں شامل نہ کرنے کا کوئی جواز نہ تھا کیونکہ اقبال 1938 میں رحلت کر چکے تھے۔

ایک بات میرے ذہن میں بالکل طے تھی، وہ یہ تھی کہ جب میں پڑھایا کروں گا تو صرف ادب پر نہیں بلکہ زبان کی تعلیم پر زیادہ زور دوں گا۔ اردو شاعری کی ایک بڑی مضبوط قسم کی زبانی روایت رہی ہے۔ اس میں ایسی شاعری بھی ہے جس کو آپ کانوں سے بغیر ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ انگریزی والوں کے لیے شاعری ایسی شے ہے جسے آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں، لیکن اردو والوں کے لیے یہ اس شے کا نام ہے جو آپ خود شاعر سے سنتے ہیں، اور پڑھتے تب ہیں جب بعد میں اس کا مجموعہ شائع ہو جاتا ہے۔ سوالیں میں طالب علموں کی توجہ کا مرکز اگر ادب تھا تو بھی زبان کی تعلیم کو بہت سنجیدگی سے لینے ضرورت تھی۔ یہاں نصاب کو اس طرح پڑھانے کے لیے ترتیب نہیں دیا گیا تھا۔ زبان دانی کی کلاس کے لیے نہ تو کوئی وقت مقرر تھا اور نہ اسے ترجیح دینے کی ضرورت سمجھی گئی۔ میں اس پر توجہ تو دے رہا تھا لیکن اس کے لیے مجھے اپنے طور پر تیاری کرنی تھی۔ آئندہ دنوں میں، پڑھانا شروع کرنے پر میرا طریق کار مختلف ہونے والا تھا۔

15

سنسکرت اور سنسکرت نواز

سوالیس میں تین برس تک اپنی تعلیم کے دوران میں اپنے ساتھی طالب علموں کے ساتھ ہر ہفتے سنسکرت کی کلاس میں بیٹھتا رہا۔ اس کلاس میں ہم ساڑھے تین ہزار سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال پہلے تک لکھا گیا ادب پڑھتے تھے۔ یہ کس کام کا تھا؟ اس سے میں نے کیا پایا؟

سنسکرت سیکھنے میں میری دلچسپی کی بنیادی وجہ بالکل عملی تھی۔ مجھے توقع تھی کہ جدید ہندستانی زبانیں سیکھنے میں سنسکرت سے مدد ملے گی۔ میں نے سنا تھا کہ شمالی ہندستان کی ساری اہم زبانیں اسی طرح سنسکرت سے نکلی ہیں جس طرح مغربی یورپ کی رومانس زبانیں لاطینی سے پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ کہ جنوبی ہندستان کی چاروں اہم زبانیں حالانکہ ایک بالکل ہی مختلف خاندان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان کی لفظیات بھی بڑے پیمانے پر سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ پر مشتمل ہے۔ لیکن مجھے اب یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے، اور سنسکرت کو میں ایک حد سے آگے اس مقصد کے لیے استعمال نہ کر سکوں گا۔

اپنے زمانے میں سنسکرت کو یہ نام ان زبانوں کے متضاد کے طور پر ملا جو پراکرت کہلاتی تھیں — اور سنسکرت کے بجائے دراصل یہی زبانیں شمالی ہند کی جدید زبانوں کی اجداد اعلیٰ ہیں۔ موجودہ سیاق میں 'پراکرت' کے معنی ہیں فطری یا قدرتی، اور سنسکرت کے معنی ہیں مہذب و شائستہ۔ روایتی طور پر پراکرتوں کو خالص سنسکرت سے نکلنے والی 'بگڑی' ہوئی شکلیں سمجھا جاتا تھا، جبکہ خود سنسکرت غالباً پانچویں صدی قبل مسیح میں رائج کسی پراکرت کی 'تہذیب یافتہ' شکل تھی — جو بعد میں اشرافیہ طبقے کی

Scanned with CamScanner

زبان بن گئی۔ اس کا بھی وہی رول تھا جو یورپ میں لاطینی کا — یہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تحریری زبان تھی، اور حسبِ ضرورت بولی بھی جاتی تھی، مثلاً ایسے موقعوں پر جب ایسے لوگوں سے ملنا ہوتا جن کی پراکرت زبان ان کی اپنی زبان سے مختلف ہوتی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ سنسکرت ڈراما میں اعلیٰ طبقے کے لوگ سنسکرت بولتے ہیں، جبکہ اس کے دوسرے کرداروں میں ہر ایک اپنی مخصوص پراکرت بولتا ہے، جو کسی حد تک علاقائی اور کسی حد تک طبقاتی خصائص پر مبنی ہوتی ہے۔

مغرب کے لوگوں نے سنسکرت کے مطالعے پر کیوں توجہ دی، اس کی بھی ایک دلچسپ تاریخ ہے۔ انیسویں صدی میں ہندستان کے انگریز حاکم، اپنی گہری ناواقفیت کی بنا پر، یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ ثقافتی سطح پر ہندستان کی ہر چیز کے مقابلے میں وہ اعلیٰ ترین حیثیت رکھتے ہیں۔ — یہ وہ مزاج ہے جس کو 1835 میں لکھے ہوئے میکالے (Macaulay) کے ایک جملے میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس نے کہا تھا: ''یورپ کی کسی اچھی لائبریری کا ایک شیلف، ہندستان اور عربستان کے سارے مقامی ادب کے برابر اہمیت رکھتا ہے''۔ لیکن ایسے مزاج کی تشکیل ہونے سے پہلے ایسے بہت سے انگریز تھے جو ہندستان میں نئے نئے وارد ہوئے اور یہاں جو کچھ دیکھا اس کے گرویدہ ہوئے۔ اس گرویدگی کا جواب انھوں نے مناسب تحسین و تکریم کی صورت میں دیا، اور اس خواہش کے ساتھ کہ جتنا ممکن ہو سکے گا اس ملک کے بارے میں علم حاصل کریں گے۔ ایسا ہی ایک شخص ولیم جونز (William Jones) تھا جو 1783 سے 1794 کے درمیان بنگال میں سپریم کورٹ کا ایک جج تھا۔ وہ یہاں جن لوگوں کے ساتھ کام کرتا تھا ان کے ذریعے اسے ہندستان میں محفوظ رہ جانے والی قدیم ترین کتابوں کے بارے میں پتا چلا۔ اسے بتایا گیا کہ یہ کتابیں جس زبان میں لکھی گئیں اسے سنسکرت کہتے ہیں۔ یہ کتابیں حفظ کی جاتی اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تھیں، اور تحریری شکل میں بہت سی صدیاں گزرنے کے بعد وجود میں آئیں۔ اس صدیوں پرانے ادب سے مسحور جونز اور اس کے ہم خیال ساتھیوں نے اس بارے میں ہر ممکن علم حاصل کرنے کی کوششیں کیں، اور 1787 میں جونز نے پہلی بار نشان دہی کی کہ لاطینی اور یونانی زبانوں کی قواعد کے ساتھ سنسکرت کا بڑا حیران کن رشتہ ہے۔ اسی طرح ان کی دلچسپی کا دوسرا موضوع ہندوازم کا مطالعہ تھا۔ ہندوازم اصل میں کسی ایک مذہب کا نام نہیں ہے، بلکہ ہندوؤں کے عقائد اور طرزِ زندگی کے لیے استعمال ہونے والی ایک عام اصطلاح ہے۔ ہندو، ہندستان کی بیشتر

Scanned with CamScanner

آبادی پر مشتمل تھے، جو آج بھی ہیں۔ وید، جن کو راسخ عقیدے والے ہندو آج بھی اپنے بنیادی مذہبی صحیفے مانتے ہیں، محفوظ رہ جانے والی سنسکرت کے قدیم ترین نمونے ہیں۔

انھی برطانوی عالموں نے یورپ میں سنسکرت مطالعات کی بنیاد ڈالی، اور ان کی یہ وراثت اس وقت بھی سرچشمہ تھی جب میں نے سوایس میں داخلہ لیا۔ سنسکرت مطالعات میں بالادستی ان عالموں کو حاصل تھی (اور شاید آج بھی ہے) جو یا تو تقابلی لسانیات (comparative philology) یا ہندومت اور فلسفے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ہمارے نصاب میں جو کچھ پڑھایا جا رہا تھا اس کا کچھ حصہ ویدوں سے لیا گیا تھا، اور ان ویدوں میں سنسکرت کے یورپی ماہرین کی دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ ان میں گرامر کی وہ شکلیں موجود ہیں جو کلاسیکی سنسکرت میں باقی نہیں رہیں۔

گرامر کے مبہم نکات اور مذہبی پہلو، دونوں سے مجھے دلچسپی پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن سنسکرت پڑھنا یا نہ پڑھنا عملی سطح پر میرے لیے کتنا سودمند ہوگا، اس سے قطع نظر مجھے اس کے مطالعے میں لطف آ رہا تھا۔ ہمارے گروپ میں ماحول خاصا خوشگوار تھا۔ ہم سب اس میں پوری دلچسپی لے رہے تھے، اور قواعد کی تکنیکی باریکیاں کتنی بھی دقیق ہوں، یا متن کتنا بھی انجانا ہو، ہمیں ایک اطمینان تو تھا کہ ہم ایک بالکل مختلف قسم کے ادب سے واقف ہو رہے ہیں۔ اردو کے برعکس، سنسکرت کا خاصا حصہ انگریزی ترجموں کی صورت میں فراہم تھا، لیکن میرا اس سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ اس ادب کے ساتھ میری ملاقات اصل زبان میں ہو رہی تھی، اور مجھے کم از کم سنسکرت ادب کا ذائقہ تو میسر آ رہا تھا۔

ہمارے اردو نصاب کی طرح سنسکرت کا نصاب بھی اتنا پھیلا ہوا تھا کہ اس کو ختم کر لینا حقیقت سے بعید تھا، خصوصاً ہم جیسے لوگوں کے لیے جن کے لیے یہ اختیاری مضمون تھا۔ شروع کے دنوں میں میں نے مطالعہ جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن بالآخر اس مسئلے کو خود ہی حل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ سنسکرت کے لیے کتنا وقت نکالوں اور کون سے لیکچر میں شرکت کروں، کون سا چھوڑ دوں۔ اس سلسلے میں اپنے اساتذہ سے ملا اور اس اختصار شدہ نصاب کے لیے ان کی منظوری لی۔

ہمارے دو اساتذہ تھے۔ ایک برو (Brough) جو انڈیا ڈپارٹمنٹ کے سربراہ بھی تھے، اور دوسرے رائلنڈز (Rylands)۔ برو سنسکرت کے اچھے عالم تھے لیکن انھوں نے یہ چھپانے کی بھی کوشش نہیں کی کہ تدریس ان کی ذیلی ترجیحات میں سے ہے۔ انھوں نے ایک بار واضح الفاظ میں

Scanned with CamScanner

ہمیں بتایا تھا کہ طالب علموں کو وہ مصیبت سمجھتے ہیں، اور دانش گاہیں تو دراصل تحقیق کے مراکز ہیں جن میں تدریسی کام ایک ناخواستہ موڑ ہے۔ اپنے علم کا مظاہرہ کرنا انھیں پسند تھا اور بسا اوقات وہ اس طرح سے اپنی بات شروع کرتے: ''آپ جانیں، کہ دراصل..'' جس کا مطلب ہوتا تھا، ''کیا میں عقل مند نہیں ہوں؟ میں یہ بات جانتا ہوں، اور شرط لگا سکتا ہوں کہ آپ نہیں جانتے۔'' ڈیوڈ ہاربرگ ان کے اس وصف کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ ایک موقعے اسے بڑی خوشی ہوئی جب بروا اپنے نوٹس سامنے رکھے ہمیں سنسکرت کا ایک متن پڑھا رہے تھے۔ انھوں نے صفحہ پلٹا تو پتا چلا جس اقتباس کو ہمیں پڑھنا تھا ان کے پاس اس کے نوٹس ہی نہیں ہیں، چنانچہ انھوں نے کلاس جلد ہی ختم کردی۔

رالمنڈز سواس کے سنکی لوگوں میں سے تھے۔ سواس میں ان کے ایک ساتھی استاد نے، جو بعد میں سواس کے ڈائرکٹر بنے، اپنی خودنوشت سوانح میں رالمنڈز کی شخصیت کی بڑی زندہ تصویر پیش کی ہے۔ وہ ان کے ساتھ اکثر سیر کو جاتے تھے۔ لکھتے ہیں:

> وہ ہمیشہ گہرے رنگ کا سوٹ پہنتے گویا آفس جا رہے ہوں، لیکن موزے کبھی پہنتے، کبھی نہ پہنتے اور اپنی پتلون اس طرح اچکائے رکھتے کہ اس میں سے ان کی سرکنڈے جیسی پتلی ٹانگیں سفید چھڑیوں کی طرح نکلی رہتیں۔ ان کی لمبی نوکدار ناک زمین کی طرف جھکی ہوئی تھی، اور وہ اس طرح سے گھٹنے اونچے اٹھا کر چلنے کے عادی تھے کہ ایک کالے بگلے کا پیکر نظر آتے... ان کو قدیم ہندستانی کتابوں میں مذکور جنگلی پھولوں کے مطالعے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ ایک دن جب ان کو بتایا گیا کہ ان کا ایک ساتھی سیب کے درخت سے گر کر زخمی ہوگیا ہے تو اس وقت رالمنڈز کسی گہری سوچ میں تھے، انھوں نے ذرا توقف کے بعد پوچھا: ''کیا اس نے یہ بتایا کہ وہ سیب کا کون سی قسم کا درخت تھا؟''

کچھ عجیب سی باتیں ایسی بھی ہوتیں جن کی بابت رالمنڈز بڑی شدت سے محسوس کرتے۔ مثلاً ہمارے گروپ میں ایک بار کسی نے fore-head کا تلفظ forhead کیا۔ اس پر انھوں نے اس کو ڈانٹ پلائی اور سخت لہجے میں کہا کہ اس کی ادائگی horrid کے وزن پر ہونی چاہیے، اور اپنی بات کی تائید میں انھوں نے یہ نظم سنائی:

Scanned with CamScanner

There was a little girl who had a little curl
Right in the middle of his forehead
And when she was good she was very, very good
And whe she was bad she was horrid.

(ایک چھوٹی سی لڑکی تھی، جس کی ایک چھوٹی سی لٹ/اس کی پیشانی کے بیچوں بیچ رہتی/جب اس کا مزاج اچھا ہوتا، وہ بہت اچھی رہتی/ور جب برا ہوتا تو وہ خوفناک لگتی۔)

ڈپارٹمنٹ سکریٹری ونی گارلینڈ (Winnie Garland) ان کے بارے میں دلچسپ باتیں بتاتی تھی۔ اس نے بتایا ایک باران کی بجلی کی کیتلی میں پانی ابل ابل کر خشک ہوگیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے کیتلی کے ایلیمنٹ پر جمی پپڑی اتر گئی ہے تو وہ اس بات پر بہت خوش ہوئے کہ پپڑی ہٹانے کے لیے انھیں اب کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

وہ برو سے بہتر استاد تھے، گو کہ ان میں چند ایسے اوصاف کی کمی تھی جو ایک اچھے استاد میں ہونے چاہییں۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں معلوم تھا کہ پڑھانا انھیں پسند ہے اور وہ ہمیں پسند کرتے ہیں۔ سنسکرت قواعد کے مختلف پہلوؤں کی پریکٹس کے لیے وہ ہمیں جو مشقیں دیتے ان میں خاصی تخلیقیت ہوتی تھی۔ مثلاً سنسکرت میں اسم کی شکلوں، دوگی (دو) اور جمع (دو سے زیادہ) میں تفریق کی جاتی ہے۔ اس فرق کی پریکٹس کرانے کے لیے رالنکنڈز نے ہم سے کہا برہمن اور شیر کی کہانی میں تبدیلی کر کے تین برہمنوں اور دو شیروں کی کہانی سنائیں۔

سنسکرت کے ایک 'اوور سیز لیکچرز' بھی تھے جن کا نام بھٹا چاریہ تھا۔ لیکن مجھے انھوں نے نہیں پڑھایا۔ ڈیوڈ نے، جو سنسکرت بنیادی مضمون کے طور پر پڑھ رہا تھا، ان کے، اور ان کی بیوی اور ننھے سے بچے کے ساتھ خاصے دوستانہ مراسم بنا لیے تھے۔ ڈیوڈ نے ایک دن تفریحاً بتایا کہ ایک بار وہ چھوٹے لڑکے کو بس میں کہیں لے جا رہا تھا۔ لڑکا بس کے سب سے اونچے ڈیک پر کھڑا تھا، اس نے بس میں جمع مسافروں کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں اعلان کیا، "میرا نام جان برو ہے۔" اس پر ڈیوڈ نے بھی اتنی ہی تیز آواز میں کہا تھا، "نہیں یہ صحیح نہیں۔ تمھارا نام جان برو نہیں ہے۔"

ہماری کلاسوں میں ایسے موقعے بھی آئے جب برو اور رالنکنڈز کے سامراجی رویے واضح طور

Scanned with CamScanner

پر دیکھنے کو ملے، اور ڈیوڈ نے، جو فطرتاً منہ پھٹ تھا، خود کو انھیں چیلنج کرنے پر مجبور محسوس کیا۔ ان کے خصوصاً اس رویے پر ڈیوڈ کو اعتراض تھا کہ وہ بھٹاچاریہ کو خود سے کمتر سمجھتے تھے۔ ایک بار رالمنڈز نے بتایا کہ سنسکرت کے عظیم قواعد داں پانِنی کے ہاں ایک اقتباس ایسا ہے جو ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آیا۔ اس پر ڈیوڈ بول اٹھا، ''تو پھر بھٹاچاریہ سے کیوں نہیں پوچھتے؟'' ہندستان میں سنسکرت کے دیگر ماہرین کی طرح بھٹاچاریہ کو بھی پانِنی کی تحریر ازبر تھی۔ اس پر رالمنڈز ہراساں تو نظر آئے لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بھٹاچاریہ سے نہ پوچھنے کا سبب بالکل واضح تھا— برطانوی راج قائم رکھنے کی اہمیت کا احساس اسی میں ہے کہ کسی ہندستانی کے دل میں ایسا خیال بھی پیدا نہ ہونے دو کہ وہ کوئی ایسی بات جانتا ہے جسے انگریز نہیں جانتے۔ رالمنڈز جھنڈا اٹھائے اٹھائے پھرنے والے سامراجی تو نہیں تھے لیکن مجھے اس میں شبہ نہیں کہ وہ بھی اسی رویے کے مارے ہوئے تھے۔

ایک اور بات جس پر ڈیوڈ کو غصہ آتا، یہ تھی کہ برو اور رالمنڈز دونوں ہی بلیک بورڈ پر سنسکرت الفاظ کو دیوناگری کے بجائے رومن رسم الخط میں لکھنے کے عادی تھے۔ ایسا وہ ہم لوگوں کی آسانی کے لیے نہیں کرتے تھے، کیونکہ ہم سب لوگ دیوناگری پڑھنا جانتے تھے اور سنسکرت متن ہم اسی رسم الخط میں پڑھتے تھے۔ ایک بار ڈیوڈ نے پوچھ ہی لیا کہ وہ دیوناگری میں کیوں نہیں لکھتے، اور اس بار بھی ان کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہ تھا۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ سنسکرت کے نئے نئے طالب علم ہونے کے سبب ہمیں فوراً ہی مذہبی متن پڑھنے کے لیے نہیں دیے گئے۔ زبان سکھانے کا عمل ہِتوپدیش کے مطالعے سے شروع ہوا، جو سلیس وسادہ نثر میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔ یہ بڑی دلچسپ بھی ثابت ہوئی۔ یہ کتاب مہذب لوگوں کو جینے کا فن سکھانے کے لیے لکھی گئی تھی، اور اس کے لیے بنیادی طور پر جانوروں کی دلچسپ حکایات سے کام لیا گیا ہے جس میں جا بجا نفیس قسم کے شلوک یا اشعار ہیں جن سے کہانی کے سبق یا اخلاقی پہلو تک رسائی ہوتی ہے۔ یہ پنچ تنتر نام کے ایک قدیم تر اور بڑے مجموعے پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا ایک شاندار انگریزی ترجمہ ملتا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے، اس کے مقابلے کا ہِتوپدیش کا کوئی ترجمہ مہیا نہیں۔ چنانچہ اس کے انداز کا احساس کرانے کے لیے میں پنچ تنتر سے کچھ نمونے نقل

Scanned with CamScanner

کروں گا۔ یہ بڑی بے اعتنائی کے انداز میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

> جنوب دیش میں ایک راجا رہتا تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے، اور وہ تینوں ہی مہامورکھ تھے۔

اس سے راجا بڑی فکر میں رہتا تھا، سو اس نے چاروں طرف دور دور تک کسی ایسے آدمی کی تلاش میں لوگ بھیجے جو انھیں جینے کا فن سکھا سکے۔ وشنوشرما نام کا ایک آدمی اس کے پاس آیا اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس نے راجا کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی، اور ان الفاظ پر اپنی بات ختم کی:

> میں اپنی بات مختصر کرتا ہوں... آپ کی درخواست کو پورا کرنے میں میں کھلاڑیوں والا جذبہ رکھوں گا۔ تاریخ درج کر لیں۔ اگر میں نے چھ مہینے کے عرصے میں آپ کے بیٹوں کو دانش مندی سے جینے کے فن میں بے مثل استاد نہ بنا دیا تو پھر مہاراج کو اختیار ہے کہ وہ مجھے اپنے شاہانہ چوتڑ عریاں کر دکھائیں۔

عملی معنوں میں بے اعتنائی کا یہ خوشگوار ہلکا پھلکا انداز آگے بھی جاری رہتا ہے۔ چڑیا کی حکایت اس کی ایک خاص انداز کی حکایت ہے۔

بسا اوقات مصنف اپنا زورِ تحریر دکھانے کے لیے مرصع عبارت لکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ شاہی اقتدار کی ناپائیداری کے بارے میں ایک نمونہ ملاحظہ ہو

> راجاؤں کی طاقت ایسی شے ہے جو غیر یقینی ہے۔ شاہانہ عظمت حاصل کرنا اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا بانس کے تنے پر چڑھنا؛ اسے گرفت میں رکھنا مشکل ہے، آپ کسی بھی لمحے لڑھک سکتے ہیں، اس کو سیدھا رکھنے کی آپ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لیں۔ یہ بندر کی طرح بے چین ہے؛ اس پانی کے مانند ہے جسے کنول کی پتی پر ٹھہرایا نہیں جا سکتا؛ ہوا کے راستے کی مانند تغیر پذیر ہے؛ بدمعاشوں کی دوستی کی مانند ناقابلِ اعتبار ہے؛ سانپ کی مانند اسے سدھانا مشکل ہے؛ یہ تابناک لیکن شام کے بادل کی پٹی کی طرح لمحاتی ہے؛ پانی پر بنے بلبلوں کی مانند اپنی فطرت میں شکستنی ہے؛ مرد کے بدن کی طرح احسان فراموش ہے؛ خواب میں ملے خزانے کی طرح یہ حاصل ہوتے ہی کھو جاتی ہے۔

سنسکرت ادب میں یہ عام بات ہے کہ نثر کے درمیان چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی صورت میں شاعری

Scanned with CamScanner

ڈال دی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ایک سی خصوصیات رکھنے والی مختلف چیزوں کی یکجا کیا گیا ہے:

وہ چیزیں جو پنجوں سے کھسوٹتی ہیں، یا سینگوں سے مارتی ہیں
ناقابل اعتبار ہوتی ہیں
اسی طرح ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے مرد بھی اعتبار کے قابل نہیں
اور ندیاں، عورتیں اور راجا بھی ناقابل اعتبار ہیں

مجھے اس کا افسوس ہے کہ ہمیں ہتوپدیش کو بیچ میں ہی چھوڑنا پڑا، اور اس کے بعد ہم نے ہندستان کے دو رزمیوں یا مہاکاویوں کے کچھ حصے پڑھے — مہابھارت کا ایک بہت طویل حصہ اور رامائن سے مختصر سا حصہ۔ ہندستان کے لوگ ان دونوں رزمیوں کی حیران کن حد تک تعظیم کرتے ہیں، اور محض اسی سبب سے یہ بات اہم تھی کہ ہم لوگ کم از کم ان سے واقفیت تو پیدا کرلیں۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہم سب لوگوں کے لیے یہ بے حد مایوسی کا سبب بنیں۔ مہابھارت بے ترتیبی سے پھیلی ایک ایسی طویل نظم ہے جس میں ایسا سب کچھ شامل ہے جسے بمشکل ہی قابل شمولیت کہا جا سکتا ہے۔ اس میں سے ہم نے سب سے پہلے نل کی کہانی پڑھی جو اس بیت سے شروع ہوتی ہے۔

آسید راجا نالو ناما ویرسین ستو بالی
اُپا پنو گنیر اشٹائی، روپ وان، اشو کو ویدا

(نل نام کا ایک راجا تھا، وہ ویر سین کا طاقت ور بیٹا تھا۔ وہ پسندیدہ صفات کا مالک تھا، خوبصورت تھا، اور گھوڑوں کا اچھا پارکھ تھا)

اس سے آگے جو کچھ بیان ہوتا ہے، اس سے کچھ بھی تحریک نہیں ملتی۔ میں نے دل میں سوچا، خدا کی پناہ! اور اس لغویت کے بارے میں ہندستانی ہومر سے بہتر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور وہ بڑے فخر سے یہ اعلان بھی کرتے ہیں کہ ایلیڈ اور اوڈیسی دونوں کو ملا دیں تو مہابھارت ان سے بھی زیادہ طویل ہے۔ اتنی طویل تو پھر لندن کی ٹیلی فون ڈائرکٹری بھی ہے، اس سے وہ بہتر ادب پارہ تو نہیں بن جاتی!

Scanned with CamScanner

مہابھارت کا سب سے معروف حصہ 'بھگوت گیتا' ہے، جس کے معنی ہیں 'خداوند (کرشن) کا گیت'۔ اس کو عموماً گیتا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس سے جو انتہائی اہمیت وابستہ رہی ہے، اس کے سبب ہمارے نصاب میں اس کی شمولیت عیاں اور لازمی تھی۔ لیکن مجھے اس کا افسوس تھا کہ یہ ہمیں شروع سے آخر تک ساری پڑھنی پڑی — افسوس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے کچھ حصے تو ضرور تہہ دار اور متاثر کن تھے لیکن بیشتر حصے میری نظر میں پیش پا افتادہ اور بسا اوقات کراہت انگیز تھے۔ اس کی کہانی اپنی ساخت میں مخرب اخلاق ہے جس میں ایک ہی خاندان کے دو گروہ تخت کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جنگ آمادہ ہوتے ہیں۔ کہانی میں گیتا اس حصے میں آتی ہے جب ارجن نام کا نوجوان ہیرو اپنے رتھ پر کھڑا اپنے ہی خاندان والوں کے خلاف جنگ کرنے کے خیال سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔ اس کا رتھ بان تب اس پر ظاہر کرتا ہے کہ میں کرشن ہوں، اور پھر ارجن کو اس کا فرض یاد دلاتے ہوئے تقریر کرتے ہیں: 'تم چھتریہ (جنگجو ذات کا رکن) ہو، اور چھتریہ کا فرض جنگ کرنا ہے۔ علاوہ ازیں، تمھاری روح، اور ان کی بھی، اس جسم سے علاحدہ ایک آزاد زندگی رکھتی ہے جس میں وہ بسی ہوتی ہے، اور جسم کے اعمال سے وہ غیر متاثر رہتی ہے۔ یہ آسکت ہے — بندھنوں سے آزاد۔ چنانچہ جنگ کرو۔' ایک دوسرے مقام پر وہ ذات پات کی بنیادی اہمیت واضح کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ کسی دوسری ذات (caste) کے فرائض اچھے ڈھنگ سے ادا کرنے کے بجائے انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کے فرائض بُرے ڈھنگ سے ادا کر لے۔

اس تمام کہانی میں ذات پات کے تئیں فرض والا حصہ مجھے سخت ناپسند ہے، لیکن ساتھ ہی آسکت رہنے کے تصور کو اتنی ہی شدت سے پسند کرتا ہوں۔ میں نے جنگ کے دنوں کے اپنے تجربے پر غور کیا جب میں کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہو سکتا تھا جب مجھے لوگوں کو قتل کرنا پڑتا جن کو میں دیگر حالات میں کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اُس وقت میں یہ کام اپنی فطری خصلت پر، اگر آپ کہنا چاہیں تو اسے روح بھی کہہ سکتے ہیں، اثر انداز ہوئے بغیر کر لیتا۔ میرا خیال ہے کہ آسکت رہنے کا تصور اپنے آپ میں ایک اچھا تصور ہے۔ 'کرم' یا عمل کا تصور بھی میرے نزدیک بہت متاثر کن ہے (زیادہ مناسب لفظوں میں کہوں اس میں جو بات مجھے پسند ہے وہ کرم کے نظریے کی بنیادی خصوصیت ہے، یعنی یہ کہ آپ اچھا یا برا جو بھی کام کرتے ہیں وہ آپ

کے پسماندگان پر، آپ کے بعد آنے والوں پر اثر انداز ہوتا ہے، اور اس طرح اسے دوام حاصل ہے)۔

ہم نے سنسکرت ڈرامے کا بھی مطالعہ کیا۔ اس نصاب میں ڈراما مرچھ کٹیکا (مٹی کی گاڑی) پورا پڑھا اور سنسکرت کے سب سے مشہور ڈراما نویس کالی داس کے ایک ڈرامے مالوی اور اگنی متر کا اچھا خاصا حصہ پڑھا۔ اس ڈرامے کے ابتدائی سین نے مجھے بہت متاثر کیا۔ سنسکرت ڈرامے کی روایت یہ ہے کہ کھیل کے باقاعدہ شروع ہونے سے پہلے ڈراما نویس اور اسٹیج منیجر میں مکالمہ ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں اسٹیج منیجر کالی داس سے کہتا ہے: "ہمارے یہاں عظیم ڈراما نویسوں کی کمی نہیں۔ آپ کو کیوں لگتا ہے کہ ہمیں آپ کی ضرورت ہے؟" کالی داس جواب دیتا ہے:

کیا قدیم شاعری ہمیشہ ہی بیش قیمت ہوتی ہے؟
اور کیا یہ اس لیے غیر اہم ہے کیونکہ یہ نئی ہے؟
قارئین! اس کی صداقت آپ خود ہی طے کریں۔
بتائے جانے کے انتظار میں محض بے وقوف ہی اپنے فیصلے ملتوی رکھتے ہیں۔

ہمارے اساتذہ نے کسی وجہ سے، جو وہ خود ہی بہتر جانتے ہوں گے، شکنتلا کو نصاب میں شامل نہیں کیا تھا، جو اس مشہور ترین ادیب کا سب سے مشہور ڈراما ہے۔ لیکن میں اس ڈرامے کا میں نے انگریزی ترجمہ پڑھا۔ ولیم جونز نے 1789 میں اسے ترجمہ کیا تھا، جو نہ صرف برطانیہ میں، بلکہ جرمنی میں بھی مقبول ہو گیا اور گوئٹے نے اس کی بہت تعریف کی۔ اس میں وہی شاعری کے نمونے متن میں جا بجا بکھرے ملتے ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے (انگریزی ترجمے کے ابتدائی چار صفحوں میں چوہتر سطریں شاعری کی ہیں)۔ ایک شعری اقتباس یہ ہے

پھلوں سے لدے درخت جھک جاتے ہیں
پانی سے بھرے بادل نیچے رہتے ہیں
اسی طرح نیک آدمی اپنی طاقت پر پھولتے نہیں
وہ فطرتاً بے غرض ہوتے ہیں

مجھے یہ جان کر اچھا لگا کہ سنسکرت ڈراما اپنی ہمشیرہ زبان قدیم یونانی کے مقابلے میں انگریزی ڈرامے

Scanned with CamScanner

سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ ایسکائلس (Aeschylus)، سوفوکلیز (Sophocles) اور یوریپیڈیز (Euripides) کے المیوں کے تئیں یونانیوں کی اپروچ کو میرا ذہن کبھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب ان معنوں میں ہرگز ڈراما نہیں تھے جن معنوں میں ہم شیکسپیئر کے عہد سے اس کی تفہیم کرتے رہے ہیں۔ اسی تضاد کی وجہ سے سنسکرت ڈرامے کی تفہیم اور اس سے لطف اندوز ہونے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی، اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ تمام لوگ جو شیکسپیئر سے لے کر رابرٹ بولٹ تک انگریزی ڈرامے کو پسند کرتے ہیں، سنسکرت ڈراما بھی پسند کریں گے۔ یونانی ڈرامے کے تھوڑے بہت وہی حصے مجھے پسند تھے جن میں ایسے جذبات کی شاندار عکاسی ہے جو میرے بھی جذبات ہیں، مثلاً یوری پڈیز کے ڈرامے میڈی (Medea) کی وہ سطریں جہاں میڈی عورتوں کے بارے میں مردوں کے روایتی تصورات پر اپنی نفرت انڈیلتی ہے۔ وہ کہتی ہے (فلپ ویلاکوٹ کے انگریزی ترجمے کے مطابق):

اور، وہ ہم سے کہتے ہیں، گھروں میں تم
خطروں سے دور رہتی ہو، جبکہ وہ خود جنگ کے محاذ پر جاتے ہیں: احمق لوگ!
بچہ پیٹ میں پالنے کے مقابلے میں،
میں محاذ کی پہلی صف میں تین مرتبہ کھڑے ہونا پسند کروں گی۔

شاعری کے وہ چھوٹے اقتباسات زبانی یاد کرنا مجھے ہمیشہ اچھا لگا ہے جنھوں نے مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا، اور میڈی کے طعن آمیز الفاظ کا اصل یونانی متن اور کالی داس کے مذکورہ بالا ابیات مجھے آج بھی یاد ہیں۔

کالی داس ایک عظیم شاعر تھا، اور ایک عظیم ڈراما نگار بھی۔ وہ سنسکرت کے پیچیدہ عروضی نظام کو بڑی کامیابی سے استعمال کرتا تھا۔ یونانی اور لاطینی رزمیوں کی طرح اس کے مہاکاویوں کا وزن، اپنی بحر کے واحد بنیادی طرز میں تبدیلیوں کی گنجائش رکھتا ہے۔ نل کے متعلق مذکورہ بالا حصے کی ابتدائی سطروں کا وزن اس طرح بدلتا ہے:

— — — — / ∨ — — ∨ / — ∨ — — / ∨ — ∨ —

دوسری اصناف میں اس قسم کی تبدیلیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایسی ہی ایک بحر جو 'مندا کرانتا'

Scanned with CamScanner

(قدموں کی دھیمی آہٹ) میں استعمال ہوئی ہے اور مجھے بہت پسند ہے، اس طرح سے ہے:

− − v v − − − v − − v v v v − − − − −

مجموعی بات یہ کہ جو کچھ ہمیں پڑھایا گیا اس میں سے بیشتر مجھے اچھا لگا۔ اس زبان کے ادیبوں نے جس مہارت سے اپنی زبان کو برتا ہے اس پر میں حیرت آمیز تحسین اپنے دل میں محسوس کرتا تھا اس کے پیچیدہ نظامِ عروض پر ان کی کامل گرفت پر اور اس کمالِ فن پر جس کی مدد سے وہ حیران کن تاثرات پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے، تو اس میں مجھے اکثر ایک مکروہ سرد مہری اور کلبیت کا احساس ہوا۔ اس کی بڑی مثال کام سوتر کی ہے جس کی عموماً غلط تفہیم اور بے جا تعریف کی گئی ہے۔ یہ ہمارے مجوزہ نصاب میں تو (یقیناً) شامل نہیں تھی لیکن میں نے اس کا انگریزی ترجمہ (ضرور) پڑھا تھا۔ یہ کتاب مردوں کو یہ سکھانے کے لیے تحریر کی گئی ہے کہ ہر طرح کی عورتوں سے، جن سے ان کا کسی بھی طرح کے حالات میں ممکنہ حد تک سابقہ پڑ سکتا ہے، وہ کس طرح زیادہ سے زیادہ جنسی تلذذ حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں کہیں جنسی عمل کو باہمی محبت کی تکمیل کی صورت میں مصور نہیں کیا گیا ہے۔

ہتوپدیش کے بعد جو نثر پارہ ہم نے پڑھا وہ دش کمار چرت (دس راج کماروں کی کہانی) کے اچھے خاصے حصے پر مشتمل تھا، اور اس میں دونوں ہی مذکورہ خصوصیات نمایاں تھیں۔ اس میں انسانی احساسات کا غیر معمولی فقدان ہے، لیکن زبان کو برتنے میں اس کے مصنف کو جو غیر معمولی مہارت حاصل ہے اس کا ثبوت اس راج کمار کی کہانی سے فراہم ہوتا ہے جس کے ہونٹ کاٹ دیے گئے ہیں وہ اپنی کہانی ایسے الفاظ میں بیان کرتا ہے جس میں لبوں کے ملنے سے پیدا ہونے والی ایک بھی آواز والا لفظ شامل نہیں۔ لیکن نفسِ مضمون میں خون سرد کرنے والی کلبیت اور مردم بیزاری سنسکرت ادب کی مجموعی خصوصیت ہے۔ بیشتر انسانی جذبات کی عکاسی متاثر کن انداز میں ملتی ہے۔ مثلاً کادمبری (جو مرکزی کردار کا نام بھی ہے) میں۔ یہ ایک نثری بیانیہ ہے جسے میں نے ایک عرصے کے بعد پڑھا۔ اس کا اسلوب دش کمار چرت سے کسی طرح کم ماہرانہ نہیں ہے، اور ہم اسے بھی یکساں سطح پر پڑھ سکتے تھے۔

اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں اپنے نصاب سے بھگوت گیتا کو نکال دیتا اور اس کی جگہ زیادہ وقت

ایسے سنسکرت ادب کو پڑھنے میں صرف کرتا جسے میں سیکولر ادب کہتا ہوں اور جو مجھے شدت سے متاثر کرتا ہے۔ یہ وہ ادب ہے جو چھوٹی چھوٹی ان نظموں میں عیاں ہے، جن کو برو نے بڑی جا بکدستی سے Poems from the Sanskrit کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ ہمارے نصاب میں ایسی کوئی نظم شامل ہی نہیں تھی، اور نظم کے نام پر ہم نے صرف وہ شعری حصے پڑھے تھے جو نثری متون کے بیچ بیچ میں آجاتے تھے۔

ہمارے تین سالہ کورس کے دوران صرف ایک بار ایسا موقع آیا جب ہم نے سنسکرت شاعری باقاعدہ قرأت کے ساتھ سنی۔ اس کا اہتمام بھٹاچاریہ نے ڈیوڈ کی درخواست پر کیا تھا۔ وہ اپنے ایک دوست کو لائے جنھوں نے جے دیو کے گیت گووند (گووند یعنی کرشن کے گیت) کے ابتدائی حصوں کی قرأت کی۔ جے دیو گووند کے دس مختلف اوتاروں کا بیان کرنے کے بعد کہتے ہیں:

شری جے دیو کویر ادم اُدتم اُدارم

اس کے بعد کے چند الفاظ مجھے یاد نہیں رہے، پھر کہتے ہیں:

کیشو ادھرت دشا ودھا روپا
جئے جگدیشا ہرے ے ے

مجھے اس کی دھن آج بھی یاد ہے۔

جارج کیٹ (George Kyet) نے ان ابیات کا ترجمہ اس طرح کیا ہے: 'شاعر شری جے دیو کے اس کلام کو سنو۔ یہ وجود کا عطر مبارک، ارفع اور فرحت بخش ہے۔ اے کیشو تم جو دس اوتاروں میں سے ہو۔ اے دنیا کے مالک، ہری تمھاری فتح ہو۔'

برو نے اس موقعے پر اپنی شرکت ضروری سمجھی، لیکن بخوبی ظاہر ہے کہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ قرأت کا یہ اہتمام ایک آرائشی طرہ ہے جس کی ضرورت سنسکرت کے کسی سنجیدہ طالب علم کو محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ ایک اور موقع جب ہمیں سنسکرت شاعری سننے کو ملی، اس وقت فراہم ہوا جب ہم نے شعبے میں ایک قدیم گراموفون رکارڈ سنا۔ اس رکارڈ میں کسی ہندستانی نے مہابھارت کے 'نل' والے حصے کی وہ ابتدائی ابیات پڑھی تھیں جن میں سے کچھ میں اوپر نقل کی ہیں۔ ادب کے طور پر تو یہ بالکل اثر انگیز نہیں تھا، لیکن غنیمت تھا کہ کم از کم شاعری سننے کو تو ملی۔

Scanned with CamScanner

میری تعلیم کے آخری سال میں بھٹاچاریہ رخصت ہوئے اور ان کی جگہ ایک بزرگ گجراتی نے لی جن کا نام ڈاکٹر ٹی این. داوے (T.N. Dave) تھا۔ ہمارے سنسکرت کے اساتذہ میں وہ ذہین ترین تھے اور طالب علموں کی سب سے زیادہ حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ وہ ہم سے اکثر و بیشتر سوال پوچھتے رہتے تھے تاکہ یہ اندازہ کر سکیں کہ ہم ان کی بات درست ڈھنگ سے سمجھ رہے ہیں یا نہیں۔ لیکن ان کا سوال عموماً ایسا ہوتا جس کا جواب سب سے غبی طالب علم بھی دے سکتا تھا۔ جب ہم جواب دے چکتے وہ "یس!" اس طرح زور دے کر کہتے گویا ہم نے غیر معمولی ذہانت سے اپنی بات کہی ہو۔ ہماری خوداعتمادی میں اضافہ کرنے کا اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ نہ ہو سکتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ان میں میں ہندو شاونیت بھی تھی ... جس کا اظہار بہت ہی کم، اور وہ بھی بہت ہلکا سا، ہوا تھا۔ ایک بار جب ہم ایک سنسکرت ڈراما پڑھ رہے تھے، جو شاید مرچھ کٹکا تھا، تو اس میں ایک اقتباس آیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ اعلیٰ ذات کی ہندو عورت پردہ کرتی ہے۔ داوے جانتے تھے کہ ہندوؤں میں پردے کا رواج عموماً مسلمانوں کے اثر کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا، چنانچہ اس تاثر کو درست کرنے کے لیے انھوں نے یہ زحمت اٹھائی۔ "ذرا دیکھو تو!" انھوں نے فخر سے کہا، "ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے صدیوں پہلے ہمارے ہاں پردہ مروج تھا۔"

برطانیہ میں وہ اپنی کم سن بیٹی سشیلا کو بھی ساتھ لائے تھے، اور انھیں مکان کی تلاش تھی۔ انھی دنوں ایسا اتفاق ہوا کہ فلپ مزگروف کی بیوی ڈوروتھی اور اس کے بچے کے کمرے ان کے استعمال میں نہ تھے، چنانچہ میں نے داوے کو مزگرووری کے بارے میں بتایا، اور وہ اور ان کی بیٹی وہیں کرائے پر اٹھ آئے۔ اپنا کھانا بنانے کے لیے انھیں علاحدہ سہولیات فراہم کی گئیں۔ اپنے کھانوں میں وہ لوگ کبھی کبھی ہینگ ڈالتے جس کی بڑی خراب بو ہر طرف پھیل جاتی تھی۔ ہمیں اس کی بو نچلی منزل میں بے مسز مزگروف کے باورچی خانے تک میں محسوس کر لیتے تھے۔ لیکن جب کبھی وہ پوچھتیں کہ یہ کیسی بو ہے، تو داوے اس سے صاف انکار کر دیتے کہ کہیں سے کوئی بو آ رہی ہے۔ وہ سشیلا کو سنسکرت سکھا رہے تھے — بالکل روایتی انداز میں، جس میں استاد ایک فقرہ زور سے پڑھتا ہے اور شاگرد اس کو دہراتا ہے۔ مجھے ان کی گہری آواز میں ادا کردہ "مہا تا ڈھیما" کے الفاظ اب بھی یاد ہیں، اور سشیلا

نے بھی اپنی مہین سی آواز میں دوہرایا تھا "مہا تما ڈکھیا"۔

داوے کے حوالے سے ایک اور واقعہ یاد ہے۔ دوبوا (Abbé Dubois) کی کلاسک کتاب Hindu Manners and Ceremonies (ہندوؤں کے رواج اور تقاریب) سے متعلق ہے۔ یہ کتاب اٹھارویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے اوائل کی ہے۔ دوبوا ایک کیتھولک مشنری تھے جنھوں نے اپنی زندگی کے بہت سے برس مسلسل جنوبی ہندستان میں گزارے تھے۔ کتاب کا لہجہ مذمتی ہے لیکن اس میں وہ جو کچھ بیان ہوا ہے، حقائق کی درستی پر اس لہجے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دوبوا نے اس کے ایک حاشیے میں رفع حاجت کے بعد پیپر سے صاف کرنے کی یوروپی لوگوں کی گندی عادت (ہندستانیوں کی طرح پانی کے استعمال کے برخلاف) پر ہندوستانیوں کے اکراہ کا ذکر کیا ہے، جو درست ہی ہے۔ پھر وہ آگے لکھتے ہیں: "کسی غیر ملکی کے اپنے رومال میں تھوکنے یا اس میں ناک سنکنے کے بعد، رومال کو واپس جیب میں رکھتے دیکھنے کا منظر ہندستانیوں کو قے کرانے کے لیے کافی ہے۔ ان کے تصورات کے مطابق دنیا کا سب سے زیادہ شائستہ رویہ یہ ہوگا کہ آپ باہر نکلیں، اپنی انگلیاں لگا کر ناک سنکیں، اور پھر اُن کو دیوار پر پونچھ ڈالیں۔" مجھے یاد ہے کہ ایک دن گھر لوٹتے ہوئے ٹوٹنہم کورٹ روڈ (Tottenham Court Road) ٹیوب اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر میں نے داوے کو بالکل یہی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ایک بار میں نے ان سے کہا کہ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ مشکل اور پیچیدہ سبق پر آنے سے پہلے میں نے ہتوپدیش جیسی سلیس نثر کی کوئی اور کتاب نہیں پڑھی۔ انھوں نے فوراً ہی بتایا کہ ایسا کرنا کچھ بھی مشکل کام نہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے شیلف سے فلسفی شنکر اچاریہ کی ایک جلد نکالی اور اس کی خوبصورت اور رواں نثر سے ایک اقتباس پڑھ کر سنایا۔

Scanned with CamScanner

16

منصوبے اور امکانات

ڈگری کورس جیسے جیسے ختم ہونے کے قریب آ رہا تھا، مستقبل کے امکانات کا سوال میرے ذہن پر حاوی رہنے لگا۔ سرد جنگ میں شدت آنے کے سبب کیمونسٹوں کے لیے اکادمک نوکریاں حاصل کرنا مشکل تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ جن لوگوں کو فیصلہ کرنا تھا وہ مجھ سے پہلے ہی سے واقف تھے، پھر بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

فائنل امتحان سے چند مہینے پہلے، مارچ 1949 میں، مجھے واضح اشارہ دے دیا گیا کہ سواس مجھے لیکچرشپ پیش کر سکتا ہے، لیکن امتحان کا نتیجہ آنے سے پہلے باضابطہ طور پر کچھ طے نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے تعلیمی رخصت لینے کے بارے میں اپنے اساتذہ سے فوراً ہی بات چیت شروع کر دی۔ اسکاربرو کمیشن کی سفارشات میں یہ بھی شامل تھا کہ اساتذہ کو ایک سال کی مقررہ چھٹی دی جائے جو وہ ایسے ملک میں بسر کریں جس کے بارے میں ان کا اختصاص ہو۔ اگر میرا تقرر ہوا تو میں فی الفور تعلیمی رخصت لینا چاہتا تھا تاکہ تدریس کا کام شروع کرنے سے پہلے ایک سال ہندوستان میں گزار سکوں۔ ایسی درخواست کرنا کچھ غیر معمولی سی بات ہوتی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں معقول جواز پیش کر سکوں گا۔ میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ خود کو تدریس کے لیے آمادہ کرنے سے پہلے مجھے اور بھی بہت سی چیزیں سیکھنی ہیں۔ مجھے ایسے مواقع چاہیے تھے کہ میں اردو بولنے والے لوگوں کے درمیان رہ کر متواتر اردو بولا کروں، اور مجھے اپنے مطالعے کا دائرہ وسیع کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ تہذیب یافتہ اردو دانوں کے حلقے میں ان لوگوں سے واقف ہونے کی بھی ضرورت تھی جو ادب تخلیق کرتے ہیں اور

Scanned with CamScanner

جو ہندستان اور پاکستان میں اردو کے اہم مراکز کے اسکالر اور ادیب ہیں۔ اردو ادب کے مروجہ رجحانات کا اندازہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اردو کے سینئر استاد کی حیثیت میں ہارلی کی رائے کو اس سلسلے میں فیصلہ کن ہونا تھا، لیکن میرے اس منصوبے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہر حال، اس سلسلے میں اُس وقت تک کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکتا تھا جب تک کہ لیکچرشپ نہ مل جائے۔

تقرر کے فوراً بعد تعلیمی رخصت لینے پر اصرار کرنے کے پیچھے ایک مقصد وہ تھا جو میں نے سواس کے منتظمین کو نہیں بتایا — یہ تھا آزادی کے بعد آنے والی تبدیلیوں کو دیکھنے کا شدید جذبہ۔ وہاں میں کیمونسٹ ساتھیوں کے ساتھ اپنے رابطوں کی تجدید کا خواہاں تھا اور اپنے ذہن میں وہاں کے حالات کی تصویر مرتب کر رہا تھا۔

ان دنوں پارٹی ہیڈ کوارٹر میں ہندستان کے معاملات پر مجھے ایک رول تفویض کیا جا چکا تھا۔ پارٹی کے لیڈروں پر میں نے جس طرح کھلے بندوں نکتہ چینی کی تھی اس کے بعد مجھے توقع نہیں تھی کہ کنگ اسٹریٹ میں مجھے کسی بھی صورت میں خوش آمدید کہا جائے گا۔ لیکن، غالباً دوسرے امیدواروں کی عدم دستیابی کے باعث، مجھے پارٹی کی 'انڈین کمیٹی' کی رکنیت دی گئی۔ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کی ماتحتی میں (جسے عموماً ای.سی. کہا جاتا تھا) بہت سی ذیلی کمیٹیاں کام کرتی تھیں جن کے سربراہوں کا انتخاب ای.سی. کے ذریعے اپنے اراکین ہی میں سے کیا جاتا تھا۔ بین الاقوامی معاملات کی کمیٹی کے سربراہ دت تھے۔ اس کمیٹی کے تحت بین الاقوامی امور کا ایک شعبہ تھا جس میں ایک کل وقتی سیاسی کارکن اور ایک ٹائپسٹ کام کرتا تھا۔ اس شعبے نے کئی ذیلی کمیٹیاں قائم کر رکھی تھیں، مثلاً مشرق بعید کمیٹی، مشرق وسطیٰ کمیٹی اور ہندوستانی کمیٹی وغیرہ۔ ہر کمیٹی میں تقریباً دس بارہ ایسے رکن ہوتے تھے جو ان علاقوں کے معاملات سے خصوصی دلچسپی ظاہر کرتے تھے۔ ان کا کام ماہانہ نشستوں میں شرکت کرنا تھا، اور کنوینر یہ توقع بھی کرتا تھا کہ یہ لوگ ایک ماہانہ خبرنامے کے لیے، اور حسب ضرورت پارٹی پریس کے لیے تحریری مواد تیار کرنے میں مدد کریں گے۔ میرے خیال میں یہ کام خاصا اچھا تھا اور میں اس کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ممکنہ حد تک اس کو سرانجام دینے کی کوششیں کیں۔

1949 کے آتے آتے میں نے اتنی خدمات ضرور انجام دے لی تھیں کہ مجھے پارٹی کا ایک

مفید رکن سمجھا جانے لگا اور ایک کمیٹی کا کنوینر بنانے کی پیشکش کی گئی۔ کمیٹی کی کارکردگی کی کل ذمہ داری کنوینر کی ہوتی تھی اور وہ خود سکریٹری کو، اور اس کے توسط سے دت کو جوابدہ ہوتا تھا۔ سارے کنوینر مہینے میں ایک بار دت سے ملاقات کو یکجا ہوتے، کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتے اور مزید ہدایات لیتے تھے۔ برسوں تک دت کی تحریریں پڑھنے اور اپنے جی میں ان سے بحث و مباحثے کے بعد، گویا اب وقت آیا تھا جب ان کے ساتھ براہ راست کام کاجی رشتے استوار ہوئے۔ دانشوری کی سطح پر وہ ایک انتہائی مستحکم شخصیت کے مالک تھے۔ سب کنوینر ان سے خوف کھاتے اور ان کی ناراضگی کے خیال سے کانپتے تھے۔ میں شرمندگی کے ساتھ قبول کرتا ہوں کہ میرا بھی یہی حال تھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک کمیونسٹ کو کیسے بھی حالات میں دوسرے کمیونسٹ سے خوف نہیں کھانا چاہیے، خواہ وہ کتنا ہی ممتاز ہو، لیکن ہم سب پھر بھی دت سے ڈرتے تھے۔

اپنی انھی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے دوران میری ملاقات شرف اطہر علی سے ہوئی اور ان سے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں بہت سی وہ باتیں معلوم ہوئیں جن کے سبب وہ پارٹی سے ناخوش تھے۔ جنگ کے دنوں میں انھوں نے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں کام کیا تھا، اور جنگ کے بعد پارٹی نے انھیں برطانیہ بھیج دیا تھا۔ مجھے اس کا مطلق اندازہ نہیں کہ وہ یہاں کیا کرنے آئے تھے، لیکن کسی نہ کسی طرح وہ یہیں ٹکے ہوئے تھے۔ وہ پی سی جوشی کے، جو 1942 سے پارٹی کے سربراہ تھے، زبردست مداح تھے لیکن اس بات سے ناخوش تھے کہ ہندستان کی آزادی کے بعد چند ماہ کے اندر پارٹی کی پالیسی تبدیل ہوئی اور اس کے ساتھ ہی لیڈرشپ بھی بدل گئی۔ بی ٹی رانادیوے نے جوشی کو باہر کر دیا اور پارٹی کو مزید 'انقلابی' خطوط پر مرتکز کیا۔ رانادیوے اور ان کے حامیوں کا خیال تھا کہ جوشی کی سربراہی میں ہندوستانی پارٹی کا رول محض، نقلابی بورژوا قوم پرستی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بورژوا قومی پالیسیوں کے حدود میں ہی کام کرتی تھی، جبکہ اسے ایک ایسی خودمختار سیاسی جماعت کے طور پر کام کرنا چاہیے تھا جو محنت کش طبقے اور اس کے حامیوں کے مفادات سے مکمل وابستگی رکھتی ہو۔

ہندوستانی عوام کے روز افزوں انقلابی شعور کے بارے میں مبالغہ آمیز غلط اندازہ میرے خیال میں رانادیوے کی اس پالیسی کا منبع تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہندستانی عوام کی توقعات اور آرزوئیں، جن کی تکمیل وہ آزادی میں دیکھ رہے تھے، بری طرح شکست ہوئیں، اور اسی وجہ سے عوام

Scanned with CamScanner

کانگریس کی قیادت کو خیر باد کہنے اور کمیونسٹوں سے اپنی وفاداریاں استوار کرنے کو تیار تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرا اور عوام کی یہ 'تیاری' کہیں ظاہر نہ ہوئی، تو پارٹی نے ایڈونچر کی پالیسی اختیار کی اور ایسے اقدامات شروع کر دیے جن کے تحت اس نے اپنے حامیوں کے سب سے زیادہ انقلاب پسند لوگوں پر مشتمل گروہ کو میدانِ عمل میں برسرِ پیکار ہونے کی ترغیب دی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ اس پُرتشدد عمل سے وہ لوگ بھی انقلاب کی راہ پر لگ جائیں گے جو ابھی تک نسبتاً کم انقلابی تھے۔ لیکن جیسا کہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

شرف نے میری آنکھوں کے سامنے رانا دیوے کے قابلِ مذمت طور طریقوں کی زندہ تصویر کھینچ دی تھی۔ وہ بڑی بےتابی سے یہ چاہتے تھے کہ دت اور/یا برطانوی پارٹی، اور/یا سوویت پارٹی، یا پھر کومنفورم میں سے کوئی، ان معاملات میں مداخلت کریں اور ہندستانی پارٹی کو راہِ راست پر لائیں۔ شرف کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ دت اسی کے مخالف تھے، لیکن کیوں مخالف تھے اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں۔ شاید وہ اپنے اُس رویے پر پشیمان تھے جب مارچ 1946 میں انھوں نے پاکستان کے سوال پر ہندستانی پارٹی سے کھلا اختلاف کیا تھا، حالانکہ وہ بالکل مختلف قسم کا معاملہ تھا۔ یا شاید وہ اپنے طور پر یہ کوشش کر رہے تھے کہ کومنفورم یا سوویت پارٹی اس سلسلے میں کوئی زیادہ مؤثر اقدام کرے۔

اور اب میرے سامنے تعلیمی رخصت سے متعلق مسائل تھے۔ شروع میں مولی اور میں، دونوں ہی یہ خیال کرتے تھے کہ اگر مجھے چھٹی ملی تو اس کا مطلب تھا کہ میں ایک برس تک مولی سے دور رہوں گا۔ جنگ کے زمانے میں یہ بات قابلِ قبول مان لی گئی تھی کہ سمندر پار کی ملازمتوں میں مرد طویل عرصے کے لیے جا سکتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ رویہ جنگ کے بعد اب بھی تسلیم شدہ تھا کیونکہ مرد اب اپنے بچھڑے ہوئے وقت کو پکڑنے اور زندگی کو ڈھرے پر لانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ مثال کے طور پر ریکس کا قیام آج کل ڈرہم میں تھا جہاں وہ اپنی تعلیم پوری کر رہا تھا، اور اس کی بیوی فراوز ہوم میں بچوں کی پرورش کر رہی تھی۔ یہ سال میرے نزدیک، میرے نئے رول کی تیاری کے آخری مرحلے کی مانند تھا۔ مولی اپنی ماں کے ساتھ حسبِ سابق رہ سکتی تھی، اور میری واپسی پر ہم الگ مکان میں رہائش کی توقع کر سکتے تھے۔ لیکن انھی دنوں مولی نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر تم ہندوستان

Scanned with CamScanner

جارہے ہوتو میں بھی چلنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس کا قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ سوا لیس نے یہ مان رکھا تھا اساتذہ تنہا ہی جائیں گے، اور ان کی بیویوں کے ساتھ جانے کی صورت میں کسی قسم کے مالی انتظامات روا نہیں رکھے گئے تھے۔ بہر حال میں نے مولی سے وعدہ کیا کہ اگر سب کچھ میری توقعات کے مطابق ٹھیک ہو گیا تو میں کوشش کروں گا کہ وہ بھی ساتھ چل سکے۔

ہمارے کورس کے تین سال پورے ہوئے۔ راملنڈز نے ہمارے گروپ کو اپنی وہ نظم دی جو انھوں نے ہمارے بارے میں سنسکرت زبان میں لکھی تھی۔ اس نظم کی پہلی دو سطروں میں ہم ساتوں کے نام تھے، لیکن اس طرح کہ ہمارے ناموں کے سنسکرت متبادل دیے گئے تھے:

دیاونت ، رسالش چیوا تتھا رکشک، دھرشک
اشو پوریش چہ پرشٹھش چہ مرگیاکھیاش چہ سپتمہ

کلیمنٹ کے معنی ہیں رحم دل، چنانچہ جو کلیمنٹ کو 'دیاونت' یا دیادان کہا۔ ٹونی وارڈر کو 'وارڈز' کے اعتبار سے 'رکشک' (یعنی محافظ) بتایا۔ ٹم ریپر حملہ آور یا 'دھرشک' ٹھہرا۔ ڈیوڈ ہاربرگ کا ترجمہ اشو پوریہ (اسپ / گھوڑوں کا نگر) کہا گیا (برگ یا برا بمعنی شہر، مثلاً پیلن برا)۔ مائیکل پیج کو انھوں نے بمعنی صفحہ، پرشٹھ کہا۔ اور جو ہنٹ کو 'مرگیہ' جس کے معنی شکار کرنے (hunt) کے ہیں۔ میرے نام کا کوئی سنسکرت متبادل نہ مل سکا، چنانچہ صوتی اعتبار سے 'رسال' (آم کا ایک درخت) کو متبادل مان کر کام چلایا۔ اس طرح نام لینے کے بعد نظم میں ہماری بے تعریف پر مبنی ایسی تصویر پیش کی گئی جس کے مطابق ہم اب ایسے اسکالر بن چکے تھے جو شاستریوں (سنسکرت ادبیات کے ماہرین) کے حلقے میں شامل ہو چکے ہیں:

یے پراشاسترکشلا، شاسترامنڈلم آویشن

اس نظم کی آخری سطر یہ تھی:

تیہ یہ دیہ اش پکشر وکشو وہر تا، نا تو وہرتا

یعنی، آج یہ ہیرو چاروں سمتوں میں پھیل رہے ہیں، لیکن ہماری یادوں سے نہ جائیں گے۔

میں اوّل آیا، اور فی الفور مجھے لیکچرشپ کی پیش کش ہوئی۔ بعد میں برو نے مجھ سے کہا: ''تم نے سنسکرت میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا، جبکہ یہ تمھارا محض امدادی مضمون تھا۔'' ٹونی نے پالی زبان اور بدھ مت کے مے۔ ں کی تعلیم کا فیصلہ کیا۔ ڈیوڈ ہندوستان واپس جا رہا تھا اور کرشنا مورتی کی طرز پر ایک اسکول کھولنے کا قصد رکھتا تھا۔ لیکن جو گیمسٹ ایک معاملے میں بدقسمت نکلا۔ توقع یہ کی جارہی تھی، اور یہ بات درست ہی تھی، کہ اس کو ہندی میں لیکچرشپ ملے گی۔ اسے اشارتاً یہ بتا بھی دیا گیا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اور غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اَپر سیکنڈ ہی لا سکا۔ مجھے شک ہے کہ شعبے سے باہر رکھنے کے لیے اسے سیکنڈ کیا گیا، جبکہ اسے بھی اوّل درجہ ہی ملنا چاہیے تھا۔ اُن دنوں کی اکادمک کنونشن کے مطابق اَپر سیکنڈ کو بھی عموماً اعلیٰ سطح کی استعداد میں شامل کیا جاتا تھا اور وہ بہ آسانی اس کے ساتھ رعایت کرسکتے تھے۔

یہ بات تقریباً حتمی طور پر درست تھی کہ اس کی اکادمک کامیابیوں کا اس فیصلے میں کچھ دخل نہ تھا۔ ہم سب طالب علم سماجی حیثیت میں خود کو اگرچہ اپنے اساتذہ کے ہم پلہ سمجھتے تھے، اور وقت پڑنے پر ضروری ہوتا تو ان سے بحث بھی کرتے تھے، لیکن اس بے تکلف رویے کو حد سے متجاوز نہ ہونے دینے کا شعور بھی رکھتے تھے۔ البتہ جو گیمسٹ ایسا نہیں تھا۔ اپنی نظروں میں وہ خود کو جتنا اہم سمجھتا تھا اسی کے مطابق اساتذہ کے ساتھ برابری کا سلوک کرتا اور ایسا رویہ رکھتا تھا گویا وہ خود بھی اسٹاف کا رکن ہو۔ وہ برو کو لنچ پر مدعو کرتا اور ان سے ایسے باتیں کرتا جیسے وہ مکمل طور پر یکساں درجے کا رشتہ رکھتے ہوں۔ میرے خیال میں برو کو اس کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ ایک بار ریلنڈز (جو لندن سے باہر رہائش پذیر تھے) یہ بتا رہے تھے کہ وہ رات کو کبھی کبھی کلب میں ہی رک جاتے ہیں۔ اس پر جو نے پوچھا، کون سے کلب میں۔ اس کا انداز ایسا تھا گویا وہ خود بھی کلب کی دنیا کا حصہ ہو (حالانکہ میرے خیال میں ایسا نہیں تھا)۔ اس نے ایسے اشارے بھی دے رکھے تھے کہ وہ اساتذہ میں کس کس کو ناپسند کرتا ہے۔ اب یہ اس کی بدبختی تھی کہ اس کو ناپسند لوگوں میں مس ایوانز (Miss Evans) بھی شامل تھیں جو فرتھ کے شعبے سے متعلق تھیں۔ انھوں نے صاف الفاظ میں فرتھ کو بتا دیا کہ استاد کی حیثیت سے جو کے تقرر کو وہ بالکل برداشت نہیں کریں گی۔ تقریباً انھی دنوں گفتگو کے دوران فرتھ نے مجھ سے کہا تھا (اور بظاہر انھوں نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا کہ وہ جو کے بارے میں کہہ رہے ہیں) کہ جب کبھی اسٹاف میں

کسی کے تقرر سے متعلق غور کیا جاتا ہے تو یہ بات اہم ہوتی ہے کہ وہ شخص 'سینئرز کامن روم' کے لیے مناسب بھی ہو۔ واضح تھا کہ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ جو اس کا اہل نہیں، اور میں ہوں۔

اب میں باضابطہ طور پر چھٹی کی درخواست دینے کا مجاز تھا۔ ہارلی اس بات سے مایوس تھے کہ میں چھٹی لینے پر مصر ہوں، پھر بھی وہ میری درخواست کی حمایت کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ خیال مجھے بعد میں آیا کہ ان کو توقع رہی ہوگی کہ میں فوری طور پر ان کی جگہ سنبھال لوں گا اور اس طرح ان کے لیے سبکدوش ہونا ممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ میری بات مان لینے کو ان کی کشادہ قلبی پر ہی محمول کرنا چاہیے۔ مجھے 1949-50 کے تعلیمی سیشن کے لیے چھٹی مل گئی، اور سوالیس کے سکریٹری موئسے بارٹلیٹ (Moyse Bartlett) نے، جن کا نام بڑا رعب دار سا تھا، مجھے ایک خط بھیجا جس میں مالی انتظامات کی وضاحت کی گئی تھی۔ — یہ کہ سوالیس فرسٹ کلاس کا دونوں طرف کا کرایہ اور اخراجات کا الاونس دے گا جس میں 'آؤٹ فٹ' الاونس بھی شامل ہوگا۔ (یہ آؤٹ فٹ یا لباس خاکی شارٹس، ٹراپیکل سوٹ، ایک سولا ٹوپی، ایک کیبن ٹرنک، پالوڈرین کی گولیوں اور ایک مچھردانی پر مشتمل تھا)۔

اب ہمیں یہ طے کرنا تھا کہ مولی ساتھ جائے یا نہ جائے۔ میں موئسے بارٹلیٹ کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا میں سستا ٹکٹ خرید کر، باقی ماندہ رقم مولی کو اپنے ساتھ لے جانے پر خرچ کر سکتا ہوں۔ ''ناممکن!'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ بہت ممکن ہے کہ کوئی ہندستانی فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہو، اور تم سیکنڈ میں، جو بالکل نامناسب بات ہوگی۔'' اس نے یہ بھی اضافہ کیا: ''آج کل ہندوستان سفید فام عورتوں کے لیے کوئی مناسب مقام نہیں رہ گیا ہے۔'' میں نے طے کیا کہ بہرحال مجھے مولی کو لے جانا ہی ہے۔ افسر کی حیثیت میں ہندوستان میں ملی تنخواہ میں سے جو کچھ رقم بچی تھی، اب اسی سے کام چلانا تھا۔ جنگ کے زمانے میں میری ضروریات تقریباً صفر تھیں اور جو کچھ میں نے کمایا تھا اس کا بیشتر حصہ ہندستان کی کمیونسٹ پارٹی کو دے دیا تھا۔ یہ ایسا کام تھا جسے اتفاق سے میری کمیونسٹ بیوی اور اس کی کمیونسٹ ماں، دونوں ہی نے پسند نہیں کیا۔ بہرحال، میرے پاس اب بھی پس انداز کی ہوئی کچھ رقم باقی تھی اور مجھے امید تھی کہ یہ کافی ہوگی۔

چنانچہ ہم دونوں ساتھ نکل کھڑے ہوئے۔

❋❋

ادبی تنقید و تحقیق

ضربِ تنقید
ناصر بغدادی
قیمت :400 روپے

تنقیدی افکار
شمس الرحمٰن فاروقی
قیمت 250 روپے

مضامین سلیم احمد
سلیم احمد
انتخاب: جمال پانی پتی
قیمت 800 روپے

ساحری، شاہی، صاحبقرانی
(داستان امیر حمزہ کا مطالعہ)
شمس الرحمٰن فاروقی
تین جلدوں کے سیٹ کی قیمت:1000 روپے

ادب کی نسائی رد تشکیل
(مضامین کا انتخاب)
ادارت: فہمیدہ ریاض
قیمت:150 روپے

شعر شور انگیز
(غزلیات میر کا انتخاب اور مفصل مطالعہ)
شمس الرحمٰن فاروقی
چار جلدوں کے سیٹ کی قیمت:1350 روپے

راجندر سنگھ بیدی
ایک مطالعہ
وارث علوی
قیمت:640 روپے

حریر دو رنگ
شمس الرحمٰن فاروقی شاعر و افسانہ نگار
محمد منصور عالم
قیمت:300 روپے

Scanned with CamScanner

سماجی تنقید و تحقیق

تہذیبی نرگسیت
(پاکستان میں بڑھتی ہوئی مذہبی انتہاپسندی)
مبارک حیدر
قیمت:150 روپے

پاکستان اور اقلیتیں
احمد سلیم
قیمت:300 روپے

سرائیکی ثقافت
نسیم اختر
قیمت:180 روپے

تشدد، یادیں اور تعمیر امن
(پاکستان اور بھارت میں مذہبی اقلیتیں)
احمد سلیم، کرسٹین ڈیسوزا، لیونارڈ ڈیسوزا
قیمت:300 روپے

عشاق کے قافلے
میر غوث بخش بزنجو
شاہ محمد مری
قیمت:200 روپے

محاصرے کا روزنامچہ
(بی بی سی کے لیے لکھے گئے کالموں کا انتخاب)
وجاہت مسعود
قیمت:300 روپے

پاکستان جاگیرداری نظام کے شکنجے میں
محمد نعیم اللہ
قیمت:300 روپے

لائل پور کہانی: کتاب 4
ریگل چوک
اشفاق بخاری
قیمت:200 روپے

عشاق کے قافلے
میر یوسف عزیز مگسی
شاہ محمد مری
قیمت:300 روپے

عشاق کے قافلے
عبداللہ جان جمالدینی
شاہ محمد مری
قیمت:190 روپے

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs.375
عطر کافور	نیر مسعود	Rs.80
طاؤس چمن کی مینا	نیر مسعود	(دستیاب نہیں)
سوار اور دوسرے افسانے	شمس الرحمٰن فاروقی	(دستیاب نہیں)
نربدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خاں	Rs.180
لالٹین اور دوسری کہانیاں	محمد خالد اختر	(دستیاب نہیں)
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
سوئی بھوک	حسن منظر	(دستیاب نہیں)
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نگہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180

Scanned with CamScanner

ہندی کہانیاں (جلد3)		ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے)	محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے)	محمد عمر میمن	Rs.90
سہ سکوت	(منتخب ترجمے)	زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے)	محمد خالد اختر	Rs.120

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs.70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلب ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن	Rs.80
بوف کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.100

خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکری کی قمیض	وژدکار شل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پیلی بارش	خولیو لیامازاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشیں	اٹالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	زیر طبع
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاول سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	زیر طبع

Scanned with CamScanner

خودکشی کے موسم میں		زاہد امروز	Rs.120

سوانح، خودنوشت، یادداشتیں، خطوط، سفرنامے

انیس	(سوانح)	نیر مسعود	Rs.375
جوئندہ یابندہ	(خودنوشت)	رالف رسل ترجمہ: ارجمند آرا	دستیاب نہیں
قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام	(خطوط)	ترتیب: خالد حسن	Rs.170
دیواروں کے بیچ	(یادداشتیں)	ندا فاضلی	Rs.80
دیواروں کے باہر	(یادداشتیں)	ندا فاضلی	Rs.100
میرا بچپن	(یادداشتیں)	عذرا عباس	Rs.80
جواب دوست	(یادداشتیں)	نسیم انصاری	Rs.70
عذاب دانش	(سفری یادداشتیں)	نکہت حسن	Rs.150
گردش پا	(یادداشتیں)	زبیر رضوی	Rs.70
میری ناکام زندگی	(یادداشتیں)	اختر حامد خاں	Rs.80
چند بزرگ		اختر حامد خاں	Rs.80
نئے خاکے		اختر حامد خاں	Rs.80

تنقید و تحقیق

مرثیہ خوانی کا فن	نیر مسعود	Rs.150
اردو کا ابتدائی زمانہ	شمس الرحمن فاروقی	Rs.120
لغات روزمرہ (مجلد)	شمس الرحمن فاروقی	Rs.250
لغات روزمرہ (پیپر بیک)	شمس الرحمن فاروقی	Rs.150

Scanned with CamScanner

مشرق و مغرب کے نغمے	میراجی	Rs.180
اس نظم میں	میراجی	Rs.225
خندہ ہائے بے جا	وارث علوی	Rs.100
حالی، مقدمہ اور ہم	وارث علوی	Rs.80
فکشن کی تنقید کا المیہ	وارث علوی	Rs.80
لکھنؤ اور سرشار کی دنیا	فیروز مکرجی	دستیاب نہیں
منتخب مضامین	نیر مسعود	زیر طبع

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 سے جاری ہے۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں "گابریئل گارسیا مارکیز"، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، "نرمل ورما"، "کراچی کی کہانی" اور "محمد خالد اختر" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں
اور "آج کی کتابیں" اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان میں: 500 روپے
بیرون ملک: 60 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں اب بھی دستیاب ہیں۔

آج کی کتابیں

ساری نظمیں
(کلیات)
ذی شان ساحل
(زیر طبع)

ایرانی کہانیاں
(جلد دوم)
ترتیب: اجمل کمال
(زیر طبع)

ثقافتی حبس اور پاکستانی سوسائٹی
(سماجی تنقید)
ارشد محمود
(زیر طبع)

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
نیر مسعود
(زیر طبع)

شہنشاہ
ریشارد کاپوشنسکی
ترجمہ: اجمل کمال
(دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

بارہ ہندوستانی شاعر
(انتخاب)
ترتیب: اجمل کمال
(دوسرا ایڈیشن زیر طبع)

Scanned with CamScanner

۶۳

قیمت

۱۶۰ روپے

آج

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner